عورت

اسلام کی نظر میں

البہی الخولی

عورت
اسلام کی نظر میں

تالیف

البہی الخولی

ترجمہ

جاوید احسن مجاہد فلاحی

ناشر

ہندوستان پبلی کیشنز، دہلی

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب ــــــــــ عورت ــ اسلام کی نظر میں

مولف ــــــــــ البہی الخولی

مترجم ــــــــــ جاوید احسن مجاہد فلاحی

کاتب ــــــــــ احراز الحسن جاوید

مطبع ــــــــــ Printset Noida

ملنے کے پتے

۱۔ کریسنٹ پبلشنگ کمپنی ۲۰۳۴ ۔ گلی قاسم جان ۔ بلی ماران دہلی ۶

۲۔ مرکزی مکتبہ اسلامی ۔ چتلی قبر ۔ دہلی ۶

۳۔ ہندوستان پبلی کیشنز ۲۳۰ ۔ مدن موہن برمن اسٹریٹ ۔ کلکتہ ۷

۴ ہندوستان پبلی کیشنز ۔ انگپا نائک اسٹریٹ ۔ مدراس ۱

عورت ۔ اسلام کی نظر میں

عرض مترجم ۱۱

مقدمۂ کتاب ۱۵

باب اوّل ——— عورت اور دورِ وحشت ۱۹

عورت قدیم معاشرہ میں ۲۱

چین ۲۱

ہندوستان ۲۲

یونان ۲۲

روم ۲۳

عرب ۲۴

یہودیت ۲۵

مسیحی علماء ۲۵

ماضی کی غلطیوں کا خلاصہ اور اسلام کا موقف ۲۶

باب دوم ——— مشترک حقوق ۲۹

اسلام میں عورت کے انسانی حقوق ۳۰

عورت کی دینی حیثیت ۳۵

معاشی حقوق ۳۷

معاشرتی حقوق ۴۱

سماج اور عورت ۴۶

باب سوم ـــــــ خاص حقوق ۵۲

فصل اول ـــــــ زوجیت ۵۳

شادی اور قانون فطرت ۵۳

شادی اور انسانی فطرت ۵۴

شادی اور فطرت اجتماعی ۵۹

شادی اور جنس ۶۰

اسلام میں شادی کی اہمیت ۶۲

قانون نکاح کو توڑنے کے اثرات ونتائج ۶۴

تجریدی زندگی اور اس کے مضر اثرات ۶۵

لذت پرستی اور اس کے مضر نتائج ۶۷

معاشی محرک اور اس کے مضر نتائج ۶۹

نکاح کے انتخابات ۷۲

بیوی کا انتخاب ۷۲

معیار دولت ۷۲

معیار حسب ونسب ۷۳

شوہر کا انتخاب ۷۴

شوہر کے انتخاب میں عورت کا حق ۷۵

پیغام نکاح ۷۶
مہر ۷۹
مہر کی مقدار ۷۹
مہر عورت کا حق ہے ۸۲
جہیز ۸۳
شادی کی تقریبات ۸۴
ولیمہ ۸۴
شادی کی تفریحات ۸۶
بیوی کے حقوق ۸۹
نفقہ ۸۹
حسن معاشرت ۹۱
شوہر کے حقوق ۹۴
شوہر کی اطاعت ۹۴
ازدواجی زندگی میں تعاون کی بنیادیں ۹۶
تمہید ۹۶
عدل ۹۸
مساوات ۹۹
باہمی مشورہ ۹۹
عورت پر مرد کی فوقیت ۱۰۱

مرد کی قوامیت ۱۰۳
مرد کی عورت پر فضیلت ۱۱۰
فصل دوم ــــــ تعدد ازدواج ۱۱۲
تمہید ۱۱۲
تعدد ازدواج کا مقصد جنسی خواہشات کی تسکین نہیں ہے ۱۱۳
تعدد ازدواج محض ایک اجازت ہے ۱۱۵
مقصد تحدید ہے اباحت نہیں ۱۱۵
تنگدستی میں تعدد ازدواج کی ممانعت ۱۱۸
تعدد ازدواج کی اجازت ضرورتاً ہے ۱۲۲
تعدد ازدواج کی مصلحت ۱۲۳
خاتمہ ۱۲۸
فصل سوم ــــــ طلاق ۱۳۰
اسلام طلاق کو ناپسند کرتا ہے ۱۳۱
طلاق اور طلب لذت ۱۳۲
طلاق اور مزاجوں کا اختلاف ۱۳۲
طلاق کے عدم وقوع کی صورتیں ۱۳۵
طلاق کے قواعد ۱۳۸
بیوی کا نشوز ۱۳۹
خلع ۱۴۱

خلع کے دلائل ۱۴۲
مسئلہ خلع میں قاضی کے اختیارات ۱۴۴
شوہر کا نشوز ۱۴۵
اختلاف بین الزوجین ۱۴۷
قضائے شرعی ۱۴۷
طلاق کے شرعی ضوابط ۱۵۰
طلاق سنت اور طلاق بدعت ۱۵۲
آداب طلاق ۱۵۵
عدت ۱۵۷
زمانۂ عدت کی بعض خصوصیات ۱۵۹
رجعت کے احکام و مسائل ۱۶۱
طلاق — اسلام اور عیسائیت کی نظر میں ۱۶۳
فصل چہارم — حلالہ ۱۶۷
تمہید ۱۶۸
حلالہ کے شرائط ۱۶۸
حلالہ کا مفہوم ۱۶۹
حلالہ کی حرمت ۱۷۰
فصل پنجم — عورت — ماں اور بیوی کے روپ میں ۱۷۳
تمہید ۱۷۴

قانون زوجیت ۱۷۷
قانون زوجیت کا اثبات ۱۷۷
قانون زوجیت کے فوائد ۱۷۹
قانون امومت ۱۸۲
قانون امومت کا روحانی پہلو ۱۸۲
قانون امومت کے فوائد ۱۹۰
وہ حالات — جن میں قوانین زوجیت و امومت اپنا اثر دکھاتے ہیں ۱۹۲
ماں کے حقوق ۲۰۲
فصل ششم — حجاب ۲۰۹
تمہید ۲۱۰
ازواج مطہرات کا پردہ ۲۱۱
مسلمان عورت کا پردہ ۲۱۴
ضمیمہ ۲۲۷
گھر کا احترام ۲۲۸
عورت کی زینت و آرائش ۲۳۳
لباس کی زینت ۲۳۴
خوشبو کا استعمال ۲۳۶
زیب و زینت کے طریقے ۲۳۷
مصنوعی طریقے ۲۳۷

فطری طریقے ۲۳۸

عورت کی زینت صرف شوہر کے لئے ہونی چاہیئے ۲۳۹

اختلاط ۲۳۹

گھر کا اختلاط ۲۴۰

باہر کا اختلاط ۲۴۱

تھیٹرز اور سینما ہاؤس ۲۴۱

تفریح گاہیں اور پارک ۲۴۲

عوامی سواریاں ۲۴۳

فصل ہفتم ـــــ تحدید نسل ۲۴۴

تمہید ۲۴۵

اسلام تحدید نسل کی اجازت دیتا ہے ۲۴۶

تحدید نسل کے اسباب ۲۴۸

شخصی مفاد ۲۴۸

اجتماعی مفاد ۲۵۲

تنظیم نسل اور مقدرات الٰہی ۲۵۴

باب چہارم ـــــ عورت کے حقوق و فرائض ۲۵۷

فصل اوّل ـــــ عورت کی میراث ۲۵۸

تمہید ۲۵۸

بیٹی کو وراثت کا سب سے پہلا حق اسلام نے عطا کیا ۲۵۹

ترکہ میں عورت کی وراثت کے متعلق بعض وضاحتیں ۲۶۲
لڑکی کا حصہ لڑکے کا آدھا ہی کیوں؟ ۲۶۴
فصل دوم —— عورتوں کی تعلیم ۲۶۷
تمہید ۲۶۸
بیٹی اور بیٹا دونوں برابر ہیں ۲۶۹
تعلیم فرض ہے ۲۷۱
عورت کا دائرۂ تعلیم ۲۷۳
فصل سوم —— عورت کی ملازمت ۲۸۰
پہلا باب ۲۸۱
شخصیت کا ارتقاء ۲۸۲
قوم کی ترقی ۲۸۷
اپنی کفالت آپ ۲۹۴
عورت —— چراغ خانہ یا شمع انجمن ۲۹۹
عورت کا فطری دائرہ کار ۲۹۹
کمائی سے عورت کی معذوری کا مفہوم ۳۰۲
عورتوں کے تمدنی مشاغل اور اسلام ۳۱۰
عورتوں کی ملازمت ۳۱۸
عورتوں کے حقوق پر دو بڑے اعتراضات ۳۲۵
عورتوں کی ملازمت ۳۲۵
کام کرنا عورت کا فطری حق ہے ۳۲۷
عورتوں کی پیداواری صلاحیت ۳۳۲
خاتمہ

عرض مترجم

دورِ جدید آج کل جن بڑے اور اہم مسائل سے دوچار ہے ان میں ایک سب سے بڑا مسئلہ عورت کا ہے۔ لیکن یہ کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے۔ معلوم انسانی تاریخ میں اب تک کوئی ایسا دور نہیں گذرا ہے جس میں یہ مسئلہ موجود نہ رہا ہو۔

قدیم زمانہ میں اس کے متعلق عمومی اندازِ فکر جس نوعیت کا تھا اس کا اندازہ ان سوالات سے ہو سکتا ہے جو اس دور کے مفکرین اور دانشوروں کے درمیان ہمیشہ معرضِ بحث بنے رہتے تھے وہ سوالات کچھ اس قسم کے تھے۔

کیا عورت کے اندر بھی مرد کی طرح روح کا وجود ہے؟

کیا عورت بھی مرد کی طرح جنت میں جانے کی مستحق ہے؟

کیا عورت کو بھی کچھ حقوق حاصل ہیں؟

نیز اس کے متعلق یہ اقوال تو بہت پرانے ہو چکے ہیں کہ عورت فتنہ کی جڑ ہے، شیطان کی ایجنٹ ہے وغیرہ وغیرہ۔

بابل، چین، روم، ایران اور قدیم ہندوستانی تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ اس زمانہ میں عورت کا مقصدِ وجود صرف اور صرف یہی سمجھا جاتا تھا کہ وہ محض مردوں کا جنسی کھلونا ہے جسے جب چاہا توڑ دیا۔ جہاں تک اس کو حقوق دینے کا سوال تھا تو اسے الگ سے حقوق دینے کا کیا

سوال، وہ تو خود اپنے حقوق سے بھی محروم تھی۔ اس کے اپنے مال میں اس کا کوئی حصہ نہ تھا، باپ کی وراثت بھی اسے نہیں مل سکتی تھی، شوہر کے انتقال کے بعد اس کو بھی اسی کے ساتھ ستی ہونا پڑتا تھا۔

یہ اور اس طرح کے نامعلوم کتنے مظالم تھے جو اس کے ساتھ روا رکھے جاتے تھے۔ پھر جب اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط میں نشاۃِ ثانیہ کا آغاز ہوا اور سرمایہ داروں کے معاشی و سیاسی استحصال کے خلاف آوازیں اٹھنے لگیں اور سیاسی و سماجی مساوات کے نعرے لگائے گئے تو اس کے ساتھ ہی ایک نعرہ مساواتِ مرد و زن کا بھی لگایا گیا۔ بادی النظر میں تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے یہ نعرہ باز عورتوں کے حقوق کے محافظ اور ان کے غمخوار و ہمدرد تھے لیکن فی الواقع اس نعرہ کی بنیاد محبت و ہمدردی پر نہیں بلکہ نفرت اور دشمنی پر تھی کیونکہ اس وقت جتنی بھی تحریکیں (کمیونزم، سوشلزم، انارکزم وغیرہ وغیرہ) پھیل رہی تھیں ان کا بنیادی فلسفہ تشدد تھا اور یہ لوگ خود انسانوں ہی کے خلاف غم و غصہ میں جل رہے تھے وہ عورت کو اپنا آلۂ کار بنا کر استعمال کرنا چاہتے تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ عورت جب تک ماں، بیوی اور بہن بن کر رہتی ہے تب تک اس پر محبت کی دیویاں بھی عش عش کرتی ہیں لیکن جب یہ پیکرِ غضب بن جاتی ہے تو یہ پتھر سے بھی زیادہ سخت اور شیرنی سے بھی زیادہ خونخوار ہو جاتی ہے۔ اور یہ لوگ اپنے اس مقصد میں پوری طرح کامیاب رہے پھر اس کا جو ثمرِ خبیث نوعِ انسانی کو ملا اس کا اندازہ مغرب میں جا کر کیجیے جہاں گھر ویران ہو گئے ہیں۔ خاندانی نظام کا شیرازہ بری طرح منتشر ہو گیا ہے، شوہر بیوی اور ماں بیٹے میں خلوص کا سرے سے فقدان ہے اور وہاں کا نوجوان اس بے قید اباحیت اور آزادانہ شہوت رانی کے نتیجہ میں سوزاک اور آتشک جیسے مہلک امراض کا شکار ہو رہا ہے اور ہماری بدقسمتی ہے کہ یہ اثرات اور نتائج آج صرف یورپ تک محدود نہیں ہیں بلکہ بڑی تیزی کے ساتھ ہماری مشرقی تہذیب بھی اس سے متاثر ہو رہی ہے ایسا ہونا ایک فطری امر ہے کیوں کہ آج ہم مغلوب ہیں اور مغلوب اقوام اپنی غالب قوموں کا صرف علمی اور صنعتی میدان ہی میں لوہا نہیں مانتیں بلکہ ان کے افکار و خیالات سے بھی متاثر ہوتی ہیں یہی وجہ ہے

کہ ہمارا معاشرہ ان اثرات و نتائج کو دیکھے بغیر مغرب کی اندھا دھند تقلید کر رہا ہے۔

ان حالات میں ان لوگوں کے لئے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں اور یہ یقین رکھتے ہیں کہ قرآن مجید اور رسول اللہ ﷺ کی سنت ہی پوری نوع انسانی کے لئے مشعل راہ ہے اور اس کی اتباع ہی میں ان کے لئے فلاح و کامرانی کا راز پوشیدہ ہے۔ انتہائی ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ علمی اور عملی طور پر مغربیت کے اس امنڈتے ہوئے سیلاب کے آگے بند باندھنے کی کوشش کریں۔ یہ کتاب اسی سلسلہ کی ایک کوشش ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس موضوع پر اردو زبان میں متعدد اہل قلم کی تصانیف موجود ہیں جو اپنی جگہ پر کافی اور شافی ہیں مگر ہمیں اعتراف کرنا چاہیئے کہ مغرب نے اپنے افکار و نظریات کو پھیلانے میں پروپیگنڈہ کے جن جن ذرائع سے کام لیا ہے اور جس قدر مادی وسائل کو اس کی اشاعت پر لگا دیا ہے وہاں تک ہماری رسائی بھی نہیں ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ مختلف انداز میں اس کا دفاع کیا جائے اور جہاں جہاں سے بھی اس انداز کی کوئی کوشش ہو اس کا خاطر خواہ استقبال کیا جائے۔

یہ کتاب عربی کے مشہور مصنف اور صاحب قلم الاستاذ البہی الخولی کی ہے۔ آپ جہاں علوم اسلامیہ پر گہری نظر رکھتے ہیں وہیں مغربی علوم پر بھی ناقدانہ بصیرت رکھتے ہیں۔ آپ کے بارے میں کچھ لکھنا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ اور چونکہ آپ عالم اسلام کی مشہور تحریک الاخوان المسلمون کے رکن رکین بھی ہیں اس لئے آپ کے قلم میں ایک داعی کے دل کا سوز و گداز بھی موجود ہے جس کا اندازہ کتاب کے مندرجات کے مطالعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ مصنف کی بہت سی باتوں سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے۔ خود مجھے بھی کتاب کے بعض مندرجات سے اختلاف ہے مگر یہ چیز آپ کی علمی ثقاہت پر ذرا بھی حرف نہیں آنے دیتی ہے۔

ترجمہ کا کام راقم الحروف نے کیا ہے۔ اور یہ اسی جذبہ کا نتیجہ ہے جس کا تذکرہ پیچھے کیا جا چکا ہے۔ ترجمہ میں میں نے اپنی حد تک عبارت کی سلاست و روانی کا کافی خیال رکھا ہے اور کوشش کی ہے کہ کہیں سے اس میں "ترجمہ پن" نہ پیدا ہو سکے۔ اب یہ فیصلہ قارئین کو کرنا ہے کہ میں اپنی اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہو سکا ہوں۔

آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مصنف، مترجم اور ناشر کی اس ناچیز خدمت کو قبول فرمائے اور مزید اپنے دین کی خدمت کرنے کی توفیق بخشے۔ آمین

جاوید احسن مجاهد ندوی
اسلامک نرسری اسکول
علی گڑھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدّمہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ بِنِعْمَتِہٖ تَتِمُّ الصَّالِحَات ...... وَالصَّلوٰۃُ وَالسَّلَامُ عَلیٰ رَسُوْلِہٖ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِمَامُ الْھُدیٰ وَرَائِدُ الْخَیْرِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَمَنْ تَبِعَ ھُدَاھُمْ بِاِحْسَانٍ اِلیٰ یَوْمِ الدِّیْن۔

ستودہ صفات ہے وہ ذات جس کے احسان سے نیکیاں انجام پاتی ہیں... اور درود وسلام ہو اس کے رسول محمدؐ پر جو ہدایت کے امام اور خیر کے قائد ہیں اور رحمتوں اور برکتوں کا نزول ہو آپ کے اہل وعیال، اصحاب، اور قیامت تک کے ان تمام لوگوں پر جو آپ کی لائی ہوئی ہدایت کی پیروی کریں۔

امابعد.... میں نے تقریباً انیس ۱۹ سال پہلے ۱۹۵۱ء میں اپنی کتاب "اَلْمَرْأَۃُ بَیْنَ الْبَیْتِ وَالْمُجْتَمَعْ" لکھی تھی جس میں میرے پیش نظر بعض جزوی مسائل کی محدود دائرے میں توضیح وتنقیح تھی۔ اس کے مقدمہ میں میں نے اس کا صراحت کے ساتھ ذکر کیا تھا، اور آج میں ناظرین کے سامنے یہ کتاب "الاسلام وقضایا المرأۃ المعاصرہ" پیش کر رہا ہوں۔ اس کتاب کا موضوع اپنے مقصدِ تالیف کے اعتبار سے سابق کتاب سے جداگانہ ہے جس کا تذکرہ راقم الحروف نے اس کتاب کے مقدمے میں کر دیا تھا۔ پچھلی کتاب میں ہمارا مقصد محض کچھ سوالوں کے جوابات اور بعض مسائل و

مشکلات کی تنقیح تھی جن سے بعض نوجوانوں کو سابقہ پیش آتا ہے۔ لیکن اس کتاب کا موضوع اور مقصدِ تالیف جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے یہ ہے کہ میں نے اس میں اسلام کی روشنی میں ان بنیادی سوالات کے جوابات دیئے ہیں جو عورت کے مسئلہ سے متعلق ہیں۔

عام طور پر ہمارے درمیان یہ بات مشہور ہے کہ اس کے لئے ابھی فضا سازگار نہیں ہے کیونکہ جدید زمانے کی عورت اب ہر قدامت سے اپنا پیچھا چھڑانے کے درپے ہے اور مغربیت کو اپنا شعار بنا چکی ہے۔ وہاں وہ ہر قید اور ہر پابندی سے آزاد ہے۔ لیکن یہاں اس کا رشتہ ماضی سے جوڑا جاتا ہے جو اسے مایوسی اور جمود کی طرف لے جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے اس طرح کا علاج بالکل بے سود ہے۔ بلکہ صحیح تر بات یہ ہے کہ جب ہم عورت کی آزادی اور اس کے مستقبل کے خطوط پر بحث کریں تو اس طرزِ فکر کو سب سے پہلے ہم خود اپنے ذہنوں سے نکال پھینکیں۔ اور کوئی عقلمند شخص اس میں متردد نہیں ہو سکتا کہ اس مسئلہ پر بحث کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم ہر طرح کی تنگ نظری اور سابقہ تعصبات کو بالائے طاق رکھ دیں اور صرف عقل کا سہارا لیں اور مسئلہ کے ہر پہلو کو اس کے فطری نقطۂ نظر سے دیکھیں اور سمجھیں کہ فطرت کے وہ کون سے قوانین اور مقاصد ہیں جن کی بنا پر عورت کو زندگی کی دوڑ میں محدود ذمہ داریاں سونپی گئی ہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ قدرت نے اس کی تخلیق محض ظن اور تخمین سے نہیں کی ہے بلکہ ایک متعین مقصد اور معلوم و معروف غایت کے تحت اسے وجود بخشا ہے۔ اب اگر تہذیب جدید کے پروردہ اور نئی تہذیب کے دلدادہ اسے نہیں مانتے اور اس کا انکار کرتے ہیں تو ان سے گفتگو کرنے کے لئے ہمارے پاس صرف ایک طریقہ ہے اور وہ یہ کہ ہم عورت کے اس مسئلہ پر اس کے عورت ہونے کی حیثیت سے ہی گفتگو کریں نہ کہ اسے مرد بنا کر گفتگو کریں بحث کا یہی فطری طریقہ ہے اس کے علاوہ اور کوئی مؤثر طریقہ نہیں ہو سکتا۔

اس کے علاوہ اگر کوئی اور طریقہ اختیار کیا جائے تو وہ غلط، باطل، خلاف عقل اور واقعہ و حقیقت سے کوسوں دور ہوگا۔ ہم نے اس کتاب میں اسی کا لحاظ کیا ہے کیونکہ فطرت کی رہنمائی اور اشیاء کی طبیعت کا فتویٰ ہر لحاظ سے قابل قبول ہوتا ہے اور براہ راست حقیقت تک پہونچاتا ہے۔ حق کے طالب کے لئے اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہو سکتا۔

البہی الخولی

باب اوّل

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ ٱتَّقُوا۟ رَبَّكُمُ ٱلَّذِى خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَٰحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَآءً ۚ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ ٱلَّذِى تَسَآءَلُونَ بِهِۦ وَٱلْأَرْحَامَ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا

(النساء : ۱)

لوگو اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد عورت دنیا میں پھیلا دیئے۔ اس خدا سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنا حق مانگتے ہو اور رشتہ و قرابت کے تعلقات کو بگاڑنے سے پرہیز کرو یقین جانو کہ اللہ تم پر نگرانی کر رہا ہے۔

(۱)

عورت اور دورِ وحشت

جب ہم قدیم انسانی تاریخ اور اس کی تہذیب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں چند نہایت تلخ معلومات بہم پہونچتی ہیں جو ان کی دیہی سادگی، جہالت، پریشانی، خوف، تکبر اور دوسروں کے مقابلے میں بڑا بننے کی خواہش کی عکاسی کرتی ہیں۔ اور جب جنگلی جانوروں اور درندوں سے لڑائی کا زمانہ ختم ہو جاتا ہے تو ہمارے سامنے انسانی تاریخ کی کتاب کا دوسرا باب آتا ہے جس میں خوں ریزی، ڈاکہ زنی، چوری، دوسروں کے مال کو زبردستی ہڑپ کر لینے اپنے جیسے دوسرے انسانوں کو غلام بنا لینے اور بچوں کو قید کر لینے جیسے بھیانک واقعات کا تذکرہ ملتا ہے اور یہ سب کچھ ایک انسان محض اس لئے کرتا ہے تاکہ اسی جیسا دوسرا انسان اس کی چاکری کرے اور اس کے گھر، زمین، جائداد مویشی اور اس کی دوسری چیزوں کی دیکھ بھال کرے۔

ہم اس سلسلہ میں مزید گہرائی میں جائے بغیر اور ماضی کے تلخ تجربات کو مزید سامنے لائے بغیر پوچھنا چاہتے ہیں کہ آیا زمانۂ قدیم کا انسان اس سلسلہ میں ملامت کا مستحق ہے جب کہ وہ ابھی تہذیبی زندگی کے مراحل طے کر رہا تھا اور اس زمانہ کے حالات جنگ وجدل قتل وغارت گری نیز قید وغلامی کا شدت سے تقاضا کر رہے تھے؟

میں یہی سوال دوبارہ ایک مثال دے کر پوچھنا چاہتا ہوں کہ مثلاً ایک شخص اپنے دشمن پر حملہ کرنے کے لئے یا اپنی مدافعت کے لئے نکلتا ہے تو کیا وہ اپنے مدمقابل کی حاملہ اور دودھ پلانے والی نیز بوڑھی اور کمزور عورتوں کو معاف کر دے گا؟ اور پھر اگر کوئی جیتی ہوئی جماعت اکٹھا ہو کر غنائم کی تقسیم کرے گی تو کیا وہ جیتی ہوئی عورتوں کو چھوڑ دے گی ؟ یا اسی طرح اگر کسی قبیلہ کے نوجوان اکٹھا

ہو کر کسی جنگ کے سلسلہ میں تدبیر کر رہے ہوں یا کسی قبیلہ پر چڑھائی کا ارادہ کر رہے ہوں اور وہ اس میں عورتوں کو شریک نہ کریں تو گیا وہ ملامت کے مستحق ٹھہریں گے۔

پھر یہ بھی قابل غور بات ہے کہ زمانۂ قدیم کا انسان اپنی کس اولاد سے خوش ہو سکتا ہے بیٹے سے جو گھوڑے کی پشت پر سوار ہو کر جنگوں میں حصہ لیتا ہے یا بیٹی سے جو اپنی حفاظت کرنا تو درکنار خود لڑنے والوں کے لئے ایک بوجھ ہوتی ہے۔ اور جن کی حرمت کی حفاظت کے لئے ہی جنگیں لڑی جاتی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ دو زبردست عوامل ہیں جنھوں نے زمانۂ قدیم میں عورت کے مقام و مرتبہ کو گھٹا دیا۔

پہلا سبب تو یہ تھا کہ یہ عورت ذات تھی جس کا دائرہ کار فطری طور پر محدود اور متعین ہے۔

اور دوسرا سبب یہ تھا کہ حالات زمانہ کے تقاضوں کے تحت عورت کا کام صرف یہ تھا کہ وہ برابر مرد کے دلوں میں مختلف خواہشات کو جگائے رکھے اور جنگ کرنے کے لئے اسے ابھارتی رہے غالب ہونے پر تعریف کرے اور کامیابی اور سرفرازی کے جذبوں سے سرشار رکھے۔

قدیم معاشرے میں عورت کے مقام و مرتبہ کی تعیین میں ان دونوں عوامل کا بڑا گہرا ہاتھ رہا ہے۔ پھر جیسے جیسے زمانہ ترقی کرتا گیا، حکومتوں کے لئے قوانین اور صلح و جنگ کے لئے کچھ اصول طے کر لئے گئے، جن کا طے کر لیا جانا دورِ وحشت کا عین تقاضہ تھا۔ تو وہ قدریں بدل گئیں اور قوموں اور قبیلوں کے درمیان کچھ قانونی خطوط کھینچ دیئے گئے جن کے بعد ان کی شرف و منزلت اور قدر و مرتبہ کا دائرہ متعین ہو گیا اور اس طرح عورت معاشرے کے ارتقار کا ایک اہم جزو بن گئی جس کے بغیر ساری ترقیاں بے معنی ہو کر رہ گئیں۔

ترقی کے اس دور میں عورت کی جو معاشرتی حیثیت تھی اس کے بعض گوشوں کی طرف ہم ذیل میں اشارہ کریں گے۔

(۲)

عورت قدیم معاشرہ میں

چین

چین میں عورت کی معاشرتی حیثیت نہایت خراب تھی وہاں اسے نہایت حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا چنانچہ چین کی اعلیٰ سوسائٹی کی ایک خاتون اپنے معاشرے میں عورت کی حیثیت متعین کرتے ہوئے لکھتی ہے:

"ہم عورتوں کا مقام انسانیت کا سب سے گرا ہوا مقام ہے اور اسی لئے ہمارے حصے میں سب سے حقیر کام آئے ہیں"

ان کے گانے کا ایک بند ملاحظہ ہو:۔

"عورت کس قدر بدنصیب ہے۔ پوری دنیا میں کوئی چیز اس سے زیادہ بے قیمت نہیں۔ لڑکے دروازوں پر اس طرح کھڑے ہوتے ہیں جیسے وہ کوئی دیوتا ہوں جو آسمان سے آئے ہوں لیکن لڑکی کی پیدائش پر کبھی مسرت کی شہنائیاں نہیں بجتیں۔ جب وہ بڑی ہو جاتی ہے تو اسے بند کمروں میں چھپا دیا جاتا ہے تاکہ کوئی انسان اسے دیکھ نہ سکے اور جب وہ اپنے گھر سے غائب ہوتی ہے تو کوئی اس پر رونے والا نہیں ہوتا۔[۱]

---

[۱] قصہ الحضارہ کے باب چینی تہذیب سے ماخوذ صد ۲۸۳ مصنف ول ڈیورانٹ ترجمہ محمد بدران

ہندوستان

قدیم ہندوستان کی تاریخ میں منوسمرتی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مانو نے جب عورت کی تخلیق کی تو اس نے عورت کے لئے، مرد سے محبت، زیب و زینت، جنسی خواہشات میں لت پت رہنے کو اور غصہ کو اس کی سرشت میں رکھ دیا اور اس طرح اسے انسانی شرف سے محروم کر دیا اور اسے بدترین سلوک کا مستحق ٹھہرایا۔ چنانچہ یہ مشہور ہو گیا کہ عورت گندگی کی پوٹلی ہے اور اس کی ذات سراپا عذاب ہے۔[1]

مانو کی شریعت میں یہ بھی ملتا ہے کہ:۔

"وفادار بیوی وہ ہے جو اپنے شوہر کی خدمت اس طرح کرے گویا وہ اس کا معبود ہے، اس کی شان میں کوئی ایسی بات نہ کہے جو اس کے لئے باعث تکلیف ہو چاہے اس کا شوہر کتنا ہی خبیث اور بدمعاش کیوں نہ ہو۔ کیونکہ عورت کی تخلیق اسی لئے کی گئی ہے اور جب وہ اپنے شوہر کو پکارے تو نہایت احترام کے ساتھ اے اے میرے آقا! کہہ کر خطاب کرے یا اے میرے معبود! کہے وہ اس کے پیچھے پیچھے ذرا دور رہ کر چلے اور شوہر اس سے زیادہ سے زیادہ ایک بات کرے۔ عورت شوہر کے ساتھ کھانا نہ کھائے بلکہ اس کا بچا ہوا جھوٹا کھائے"[2]

یونان

قدیم یونان میں معاشرے کی ترقی میں عورت کا کوئی حصہ نہیں تھا اور وہ سوسائٹی سے بالکل الگ تھلگ ہو کر رہ گئی تھی گھر کے اندھیروں میں وہ اس طرح اپنی زندگی گزارتی تھی گویا وہ کوئی گری پڑی چیز ہو حتیٰ کہ ان کے بڑے بڑے مفکرین اور مورخین کا یہ خیال تھا کہ عورت کے نام کو بھی اس کی ذات کی طرح

---

[1] تاریخ العالم ص ۳۹۲   [2] حضارۃ الہند ص ۱۸۹

گھروں میں قید کر دیا جانا چاہئے[1]۔ وہ بیوی کو محض ایک بچہ پیدا کرنے والی مشین سمجھتے تھے، اور اگر اس کا کوئی دوسرا کام ہو سکتا تھا تو وہ یہ کہ وہ شوہر کی اور گھر والوں کی خدمت کرے، اور جہاں تک شوہر کا بیوی سے محبت کا تعلق ہے تو اس کا دور دور تک کوئی تصور بھی نہیں تھا۔ البتہ جذبۂ محبت کے اظہار کے لئے دوسرا میدان تھا جس کی تصویر ان کا مشہور مقرر ''ڈیموستھین'' ان لفظوں میں کھینچتا ہے۔

"ہم بیسواؤں کے پاس لذت حاصل کرنے کے لئے جاتے ہیں اور گرل فرینڈس اپنے روزانہ کے پروگراموں کو ٹھیک کرنے کے لئے بناتے ہیں اور بیویوں کو اس لئے رکھتے ہیں تاکہ وہ قانونی طریقہ پر ہمارے لئے بچے پیدا کریں۔"

اور اسی لئے شادی کے بعد عورت اپنے گھر کو چھوڑ کر اپنے شوہر کے گھر آجاتی تھی اس لئے نہیں کہ وہ گھر کی مالکن بن کر رہے بلکہ اس لئے تاکہ وہ حق خدمت اچھی طرح انجام دے سکے اور بچے پیدا کر کے ان کی پرورش کرے۔

روم

رومی تہذیب میں، جہاں سب سے پہلے جمہوریت قائم ہوئی، خاندان کا سردار ہی اس کا دینی، سیاسی اور اقتصادی پیشوا بھی ہوتا تھا تمام حقوق اسی کے ہوتے تھے ساری ملکیت اسی کی ہوتی تھی حتی کہ وہی خرید و فروخت بھی کرتا تھا اور سارے معاہدے بھی کرتا تھا خلاصہ یہ کہ خاندان کے تمام معاملات میں اسی کی بات مانی جاتی تھی۔ لیکن عورت کی طرف یہاں بھی کسی کی توجہ نہیں تھی اور اسے کسی طرح کا کوئی انسانی اور قانونی حق حاصل نہیں تھا۔ اس کے برخلاف اس کا عورت ہونا ہی اس کی تمام اہلیت کو ساقط کر دیتا تھا جیسے نوعمری اور پاگل پن سے اہلیت ختم ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ جہیز بھی جسے

---

[1] حیات الیونان صد ۱۱۲ تا ۱۱۷

وہ اپنے گھر سے لاتی تھی شوہر کے گھر آنے کے بعد اسی کی ملک ہو جاتا تھا۔ اسے کسی عدالت میں جانے کا بھی حق نہیں تھا چاہے وہ گواہ ہی بن کر کیوں نہ جائے۔

اہل روم شادی کی ایک دوسری قسم سے بھی آشنا تھے جس کا نام انھوں نے "شادی بذریعہ سیادت" رکھ چھوڑا تھا جس کے ذریعہ وہ سردار کی زوجیت میں داخل ہو جاتی تھی اور اس کا رشتہ اپنے پہلے خاندان سے منقطع ہو جاتا تھا اور جب اس پر کسی جرم کا الزام لگتا تو اسے سردار کے سامنے پیش کیا جاتا تاکہ وہ اس کا فیصلہ کرے اور اسے اپنے ہاتھوں سے سزا دے اور بعض الزامات پر تو اسے پھانسی دے دینے کا بھی اختیار تھا مثلاً خیانت کا الزام۔ اگر اس کا شوہر انتقال کر جاتا تو وہ اپنے شوہر کے بیٹوں کی وراثت میں منتقل ہو جاتی اور اگر بیٹے نہ ہوتے تو اپنے دیور یا شوہر کے چچا کے قبضہ میں چلی جاتی۔

عرب

عربوں میں سے تو بہت سے لوگ اپنے یہاں بچی کی پیدائش پر بہت غمگین ہو جاتے اور یہ بات ایک ایسے معاشرے میں جس کا اوڑھنا بچھونا ہی جنگ وجدال ہو فطری تھی کیوں کہ مرد ہی کی یہ شان ہوتی ہے کہ وہ جنگ کی مشقت اور پریشانیوں کو برداشت کر سکتا ہے اور اپنے قبیلہ کی شان کو بڑھا اور گھٹا سکتا ہے۔ رہی بیچاری عورت تو وہ تو اس کام کی ہے ہی نہیں بلکہ وہ تو دشمن کی نظر میں مال غنیمت ہے جو اس کی خدمت کر سکتی ہے اور اس کی دوسری ضروریات پوری کر سکتی ہے۔ اس طرح وہ اپنے قبیلہ والوں پر بذات خود ایک بوجھ بن جاتی ہے جنھیں ہمیشہ اس کی حفاظت کی فکر دامن گیر رہتی ہے کہ وہ کہیں قید ہو کر دشمن کے ہاتھوں ذلیل نہ ہو اور قبیلہ کی ناموس خطرہ میں پڑ جائے۔

بعض قبائل میں تو نوبت یہاں تک پہونچ چکی تھی کہ اگر کسی کے یہاں لڑکی کی پیدائش ہوتی تو اسے شدید غم ہوتا تھا اور اپنے دل میں یہ سوچتا کہ کیا وہ اس قدر ذلت اور پریشانی کے بعد بھی اسے

باقی رکھے یا ذلت نہ برداشت کرکے اسے قتل کردے یا اسے زندہ درگور کردے بہت سے لوگ تو اسی آخری طریقہ کو اختیار کرتے تھے جس کی طرف قرآن مجید نے اس آیت میں اشارہ کیا ہے۔

وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِالْأُنثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ﴿٥٨﴾ يَتَوَارَىٰ مِنَ الْقَوْمِ مِن سُوءِ مَا بُشِّرَ بِهِ ۚ أَيُمْسِكُهُ عَلَىٰ هُونٍ أَمْ يَدُسُّهُ فِي التُّرَابِ ۗ أَلَا سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ (النحل ۵۸-۵۹)

"جب ان میں سے کسی کو بیٹی کے پیدا ہونے کی خوشخبری دی جاتی ہے تو اس کے چہرے پر کلونس چھا جاتی ہے اور وہ بس خون کا سا گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے کہ اس بری خبر کے بعد کیا کسی کو منھ دکھائے سوچتا ہے کہ ذلت کے ساتھ بیٹی کو لئے رہے یا مٹی میں دبا دے؟ ـــــ دیکھو کیسے برے حکم ہیں جو یہ خدا کے بارے میں لگاتے ہیں۔"

عرب میں قاعدہ تھا کہ جب کسی کا شوہر انتقال کر جاتا تو اس کا بڑا لڑکا کھڑا ہوتا اور اسے اپنے باپ کی بیوی کی ضرورت ہوتی تو اس کے اوپر اپنا کپڑا پھینک دیتا اور اس طرح وہ عورت بلا کت غیر اس کی ملکیت ہو جاتی۔

یہودیت

باوجود اس کے کہ یہودیت ایک آسمانی مذہب تھی لیکن یہاں بھی ان کا ایک گروہ لڑکی کو اس کے بھائی کے برابر درجہ دینے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس کا مرتبہ صرف ایک خدمت گار کے برابر تھا اور اسے بھائیوں کے ساتھ وراثت میں حصہ بھی نہیں ملتا تھا اور باپ کو یہ اختیار تھا کہ اپنی بچی کو چاہے بالغ ہو یا نا بالغ، بیچ دے۔

مسیحی علماء

عیسائی علماء نے تو عورت کے مقام و مرتبہ کو گھٹانے میں مبالغہ کر دیا تھا حالانکہ انھیں رحمت

وشفقت کا پیغامبر کہا جاتا تھا وہ عورتوں کے سلسلہ میں اپنی مقدس شریعت سے یہ قول نقل کرتے تھے :۔

"عورت کو شرم سے گڑجانے کے لئے یہ بات کافی ہے کہ وہ عورت ہے نیز یہ

کہ انسان کو دنیا میں اتارے جانے جیسی لعنت کا سبب یہی عورت ہے"۔

اور اس سلسلہ میں بالکل وہی بات دہرائی جاتی تھی جو مانو نے کہی ہے کہ "عورت جہنم کا دروازہ اور گناہِ مجسّم ہے"۔ بعض عیسائی علماء تو اس سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ شیطان کی اولاد ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ :

"عورتوں پر لعنت بھیجنا واجب ہے کیونکہ گمراہی کا اصل سبب یہی ہیں"۔

بعضوں کا خیال تھا کہ شیطان عورت کی شکل بنا کر ظاہر ہوتا ہے۔

اہل کنیسہ اس حد تک گر گئے تھے کہ ان کی تعلیم کا موضوع ہی یہ ہو گیا تھا۔

کیا عورت مرد کی طرح خدا کی عبادت کر سکتی ہے ؟

کیا یہ جنت میں داخل ہو گی ؟

کیا اس کے اندر انسانی روح ہے جو جاودانی ہوتی ہے ؟ یا یہ کوئی فانی شے ہے جس کو دوام نہیں ؟

(۳)

ماضی کی غلطیوں کا خلاصہ اور اسلام کا موقف !

یہ چند مختصر اور جامع اشارات ہیں جو ہمارے سامنے ماضی کی مہذب اور غیر مہذب معاشرے کی تصویر کشی کرتے ہیں اور جس سے ہم اس دور میں عورت کی معاشرتی حیثیت کا صحیح طور سے اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ہماری نظر میں اس دور کی موٹی موٹی غلطیاں یہ ہیں۔

- مرد کی نگاہ میں عورت کی کوئی انسانی حیثیت ہی نہیں تھی، نہ تو اس کی جد وجہد کا کوئی مرکز تھا

اور نہ ہی اس کا کوئی الگ سے دائرہ کار تھا جس میں حصہ لے کر وہ معاشرے کو ترقی دے سکے جیسا کہ گذشتہ صفحات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت ان کی نگاہ میں اس قدر گر گئی تھی کہ عورت کی انسانیت اور اس کے اندر روح کا پایا جانا ان کا موضوعِ بحث بن چکا تھا وہ عورت کو ایک ناپاک وجود تصور کرتے تھے جو روح سے خالی ہے۔

● اکثر لوگوں کے نزدیک اس کے عبادت کرنے اور معاشرہ میں باعزت رہنے کا کوئی تصور ہی نہیں تھا جیسا کہ منوسمرتی کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ منو اسے شرف انسانی سے بالکل خالی سمجھتا تھا اور دوسرے بہت سے لوگ اس کی پیروی کرتے تھے اور اس کی عبادت کی اہلیت میں بھی شک کرتے تھے۔

● ایک خاندان میں لڑکے اور لڑکی کے درمیان مساوات ختم ہو گئی تھی جیسا کہ قدیم عرب اور چین کی تاریخوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے اور یہی حالت ہندوؤں میں شوہر اور بیوی کے درمیان تھی۔

● قانونی طور پر وہ بالکل بے حیثیت تھی اور اقتصادی تصرف کا حق اس سے چھین لیا گیا تھا اور اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ نہ تو اس کی ملکیت میں کوئی چیز ہوتی تھی نہ وراثت پاتی تھی اور نہ تو خرید و فروخت اور تجارت وغیرہ میں وہ حصہ دار ہو سکتی تھی غرض یہ کہ معاشی اور معاشرتی دونوں حیثیتوں سے اس کا استحصال ہو رہا تھا جیسا کہ ہمیں رومی قانون کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا عورت ہونا ہی قانونی طور پر اس کی اہلیت کو ساقط کر دیتا تھا۔

اگر ہم ان تمام غلطیوں کو مختصر کر کے صرف ایک غلطی میں بیان کرنا چاہیں تو یہ ہوگا کہ عورت کا انسان ہونا ہی چونکہ ان کے نزدیک ناقابل لحاظ تھا اس لئے انھوں نے اسے شرف انسانی سے بھی محروم کر رکھا تھا۔ اور اس کا سبب ان کا یہ احساس بھی ہو سکتا ہے کہ عورت چونکہ فطرتاً کمزور ہوتی ہے اس لئے زندگی کی بھاگ دوڑ اور دوسرے مسائل میں حصہ لینا اس کے بس سے باہر ہے۔

گذشتہ صفحات میں اس کا تذکرہ آچکا ہے کہ عورت کا عورت ہونا بھی اس کی ترقی میں مسلسل مانع رہا اور برابر اس کا استحصال ہوتا رہا جس کی بعض جھلکیاں ہم نے گذشتہ صفحات میں پیش کی ہیں۔

لیکن جب اسلام نے عورت کے مقام و مرتبہ کی تعیین کی تو اس نے عورت کو معاشرے کی تعمیر و ترقی کا بنیادی پتھر قرار دیا اور اس کی فطرت کا لحاظ کرتے ہوئے اس کے روحانی اور جسمانی حقوق بھی بحال کئے۔ اس کی انسانیت کو مرد کے برابر بنایا ساتھ ہی اس کی اس خصوصیت کا بھی اعلان کیا جس میں وہ عورت ہونے کے لحاظ سے ممتاز تھی۔ اسلام نے عورت کی حیثیت کا پورا پورا لحاظ کیا اور اس کی فطرت کا لحاظ کرتے ہوئے اس کے لئے دائرۂ کار بھی متعین کیا۔

اسی کا لحاظ کرتے ہوئے ہم اگلا باب "مشترک حقوق" کے عنوان سے لا رہے ہیں جس میں ہم عورت کے انسانی تقاضوں اس کی اہلیت، اس کے مالکانہ حقوق اور اس کے مالی تصرفات معاشرے کی اصلاح میں عورت کے فرائض اور عورت ہونے کی حیثیت سے اس کے عام اخلاق و آداب پر روشنی ڈالیں گے۔

اس کے بعد ہم دوسرا باب "خاص حقوق" کا لائیں گے جس میں شادی، طلاق، ماں ہونے کی حیثیت سے اس کے حقوق پر روشنی ڈالیں گے نیز مختصر طور پر یہ بھی بتائیں گے کہ اس کے حقوق اور واجبات کیا ہیں اور اسلام نے اس سلسلہ میں کیا ہدایات دی ہیں۔

باب دوم

مشترک حقوق

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (التوبہ : ۷۱)

مومن مرد اور مومن عورتیں یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں، بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی رحمت نازل ہو کر رہے گی یقیناً اللہ سب پر غالب اور حکیم و دانا ہے۔

اسلام میں عورت کے انسانی حقوق

ہم پیچھے بتا چکے ہیں کہ ماضی کے بہت سے متمدن معاشروں میں بھی — اس سے قطع نظر کہ وہاں شرعی قوانین رائج تھے یا غیر شرعی — عورت کا "انسان" ہونا بھی موضوع بحث بنا ہوا تھا اور لوگ ایک دوسرے سے اس طرح کے سوالات کیا کرتے تھے:

کیا عورت کو بھی مرد کی طرح عبادت کرنے کا حق حاصل ہے؟

کیا عورت بھی مرد کی طرح آخرت کی بادشاہت میں داخل ہوگی؟ اور یہ کہ

عورت ایک ناپاک مخلوق ہے جسے دوسروں کی خدمت کرنے کے لئے بنایا گیا ہے۔

یہ اور اس طرح کے اور بہت سے خیالات تھے جن میں اس دور کا انسان الجھا ہوا تھا۔ اسی اثنار میں جزیرۂ عرب میں اسلام کا ظہور ہوا اس نے آکر عورت کے حقوق و واجبات بحال کئے اور اس کو تمام انسانی حقوق دلائے اور اس حد تک اس کو بلند کیا کہ بعض صحابہ کرامؓ تک حیران رہ گئے دوسروں کی بات تو چھوڑیئے کیونکہ ان کی سیاسی حالت کو بدلنے کے لئے اور سالہا سال کی بے راہ روی سے ان کو نجات دلانے کے لئے یہ ناگزیر تھا۔ اسلام نے آکر عورت کو اس کے معاشی حقوق بھی عطا کئے اور اس معاملہ میں اسے اٹھا کر مرد کے بالمقابل کر دیا اور اسی طرح اس کے معاشرتی، جسمانی اور روحانی حقوق بھی بحال کئے جن کا مدتوں سے استحصال ہوتا آرہا تھا۔

مزید یہ کہ اس نے سوسائٹی میں اس کے وجود کو نمایاں کیا اور معاشرہ کی اصلاح میں بھی اس کا ایک خاص دائرہ متعین کر دیا تاکہ وہ خود اپنی اعلیٰ اقدار کو پروان چڑھا سکے اور اپنی کمی کو درست کر سکے اور جس

حد تک بھی وہ اس دائرے میں آگے بڑھ سکتی ہے بڑھے اس طرح اسلام نے عورت کو مرد سے کسی اعتبار سے بھی پیچھے نہیں رکھا اور اسی لئے اس کی ذمہ داری بھی مرد سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ يُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ؕ (التوبہ: ۷۱)

(مومن مرد اور مومن عورتیں یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں نماز قائم کرتے ہیں زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔

اسلام نے ان تمام خوبیوں میں مرد کے ساتھ عورت کو بھی شامل کیا ہے اور ان دونوں کو اس طرح مربوط کر دیا ہے کہ گویا یہ دونوں ایک ہی حقیقت کے دو نام ہوں۔ اور ان دونوں کو آپس میں مربوط رکھنے کے لئے دو مضبوط بنیادیں بھی فراہم کر دیں جو یہ ہیں

(۱) نسبی رشتہ کی بنیاد (۲) انسانی رشتہ کی بنیاد

اور ان دونوں میں عورت مرد کے بالکل برابر آجاتی ہے۔ ان دونوں رشتوں کی مزید وضاحت قرآن ان الفاظ میں کرتا ہے:

عورت مرد کی نسبی بہن ہے کیونکہ وہ دونوں ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ (الحجرات: ۱۳)

(لوگو: ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنادیں

تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہو یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے۔

اس آیت کریمہ میں پوری نوع انسانی کو مخاطب کر کے بتایا جا رہا ہے کہ سب کو اللہ نے ایک ماں اور ایک باپ سے پیدا کیا ہے فرمایا" اِنَّا خَلَقۡنٰكُمۡ مِّنۡ ذَكَرٍ وَّاُنۡثٰى" یہاں لفظ" النَّاس" استعمال ہوا ہے جس کا اطلاق پوری نوع انسانی پر بحیثیت مجموعی خواہ وہ مرد ہوں یا عورت سب پر ہوتا ہے اور اس کو بنیاد بنا کر یہ بتایا ہے کہ تمام انسان نسباً بھائی بھائی ہیں کیونکہ یہ سب کے سب ایک ہی مرد اور ایک ہی عورت کی اولاد ہیں۔ فرمایا" مِنۡ ذَكَرٍ وَّاُنۡثٰى" یعنی سارے انسان گویا سگے بھائی اور بہنوں کی طرح ہیں اور اسی حقیقت کی طرف رسول اللہ ؐ نے اپنے اس قول میں اشارہ کیا ہے آپ نے فرمایا" اِنَّمَا النِّسَاءُ شقاق الرجال [1]" عورتیں مردوں کی ہم رشتہ ہیں۔

ظاہر ہے کہ جب اسلام کی نظر میں تمام مرد اور عورتیں ہم رشتہ ہیں تو ان کے درمیان مساوات ہونا بھی ناگزیر ہے کیونکہ رشتہ کے بھائی اور بہن باپ کی نظر میں یکساں توجہ کے مستحق ہوتے ہیں اس لحاظ سے عورت بھی اسلام کی نظر میں مرد کی طرح ہے نہ اس سے زیادہ نہ اس سے کم۔

۲۔ عورت کی دوسری حیثیت" انسانیت" کی ہے اور اس میں بھی وہ مرد کے برابر ہے ارشاد فرمایا:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوۡا رَبَّكُمُ الَّذِىۡ خَلَقَكُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا وَبَثَّ مِنۡهُمَا رِجَالًا كَثِيۡرًا وَّنِسَآءً ‌ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىۡ تَسَآءَلُوۡنَ بِهٖ وَالۡاَرۡحَامَ‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيۡكُمۡ رَقِيۡبًا (النساء: ۱)

---

[1] یہ روایت مسند احمد، ابوداؤد اور ترمذی میں منقول ہے۔

(لوگو اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیئے۔ اس خدا سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنے حقوق مانگتے ہو اور رشتہ و قرابت کے تعلقات کو بگاڑنے سے پرہیز کرو یقین مانو کہ اللہ تم پر نگرانی کر رہا ہے۔)

ہم اس آیت کریمہ سے متعلق صرف تین باتوں کی وضاحت کریں گے۔

پہلی بات: اللہ تعالیٰ کے قول (یَا اَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ) سے متعلق ہے۔ اس آیت میں سابق آیت کے برخلاف تقویٰ پر زور دینا مقصود ہے اور پچھلی آیت میں لوگوں کو یہ بتایا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تخلیق ایک مرد اور ایک عورت سے کی ہے۔

تقویٰ کی صفت جیسا کہ ظاہر ہے ایک روحانی صفت ہے جس کا تعلق انسان کے نسبی تعلقات اور گوشت پوست کے علائق سے قطعاً نہیں ہے۔ چنانچہ جب لوگوں سے یہ کہا گیا کہ وہ اپنے رب کا تقویٰ اختیار کریں تو یہ انسان کی اس خصوصیت کی بنا پر کیا گیا جو اس کو اس روئے زمین پر حاصل ہے۔ اب جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ الناس کی عمومیت مرد اور عورت سب کو محیط ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ عورت تقویٰ کی ذمہ داریوں سے الگ کر دی جائے۔ اپنی اسی انسانی خصوصیت کی بنا پر وہ بھی اس کی مکلف ہے جیسا کہ اور دوسرے انسان ہیں۔

دوسری بات۔ ہمیں "خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ" کے متعلق عرض کرنی ہے کہ اس آیت میں نسبی رشتہ کی بہ نسبت روحانی رشتہ کے معنی پر دلالت زیادہ واضح ہے کیونکہ نسبی تعلقات میں دو آدمیوں کا ہونا ناگزیر ہے "نفس واحدہ" کا نہیں، پھر نفس کا اطلاق تمام روح پر یا آدمی کی اندرونی صفات پر ہوتا ہے اس لئے اس سے بشری اور صرف نسبی تعلق ہی مراد نہیں لیا جا سکتا۔

تیسری بات : ہمیں اللہ تعالیٰ کے اس قول " وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا " کے متعلق یہ عرض کرنی ہے کہ یہ ٹکڑا بھی سابقہ دونوں ٹکڑوں کی طرح وحدت انسانی کی تاکید کے لئے لایا گیا ہے کیونکہ پہلے جملہ میں تو یہ بتایا گیا ہے کہ پوری نوع انسانی کو ایک نفس سے پیدا کیا جو حضرت آدمؑ ہیں اور اس آیت میں ان کی زوجہ۔ حضرت حوّا ء کا تذکرہ کیا ہے جو ہم سب کی ماں ہیں۔ اور ہم سب ان کے بیٹے ہیں۔ اس لئے ماں بھی بیٹیوں کے ساتھ انسانیت کی سدھار اور وحدت انسانی کی خصوصیت میں برابر کی شریک ہے۔

ہمارا یقین ہے کہ عورت کے حقوق کو جس قدر ایجاز و اعجاز کے ساتھ قرآن کی اس آیت میں بیان کیا گیا ہے دنیا کے کسی بڑے سے بڑے حکیم نے نہیں بیان کیا ہے جو اس قدر تاثر انگیز ہوں اور تعبیر و تشریح کے لحاظ سے اس قدر دل نشیں ہوں جتنی یہ آیت کریمہ ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ
وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا

پھر یہ کہ جب صفت " انسانیت " ان چیزوں میں سے ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کے لئے مقدر کر دیا تھا اور ظاہر ہے کہ یہ ایک معنوی شے ہے جس کو جزء جزء نہیں کیا جا سکتا تو یہ صفت لازماً ہر شخص کو محیط ہو گی جو اولادِ آدم میں شامل ہے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ مرد ہوں یا عورتیں اس میں کسی کے مرد و عورت ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔ اس طرح یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ اسلام نے مرد اور عورت کو یکساں انسانیت عطا کی ہے اور ان کے درمیان سوا اس کے کہ وہ مرد ہے اور یہ عورت کسی فرق کا روادار نہیں۔

یاد رہے کہ اسلام نے عورت کو حق انسانیت اس وقت عطا کیا تھا جب کہ بڑے بڑے مذہبی جلسے محض اس قضیہ کو طے کرنے کے لئے بلائے جاتے تھے کہ آیا عورت انسان بھی ہے یا نہیں؟

اس طول کلامی کا حاصل یہ ہے کہ کچھ خاص معاملات ایسے ہیں جن میں مرد اور عورت برابر ہیں دونوں ایک دوسرے سے کسی لحاظ سے بھی کم نہیں ہیں اور یہ کہ اسلام کی نظر میں مرد اور عورت کی یکساں اہمیت اور حیثیت ہے اسی لئے اس نے عورت کو روحانی، معاشی، معاشرتی اور دوسرے حقوق دیئے ہیں جن کی تفصیلات ہم اگلے صفحات میں بیان کریں گے۔

عورت کی دینی حیثیت

جہاں تک عورت کی دینی اور شرعی حیثیت کا تعلق ہے ہم پیچھے بتا چکے ہیں کہ جب اسے تقویٰ اختیار کرنے کی تلقین کی گئی تو اس کا اصل سبب اس کی خصوصیت "انسانیت" تھی یعنی یہ کہ وہ روحانی اور عقلی دونوں لحاظ سے اس ذمہ داری کی بالکل اسی طرح مستحق تھی جیسا کہ مرد ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ سے جنت میں رہنے کے لئے کہا اور شجر ممنوعہ کا پھل کھانے سے روکا تو اس آیت میں خطاب کا رخ حضرت حوا علیہا السلام کی طرف بھی بالکل ویسا ہی رکھا جیسے حضرت آدمؑ سے ہے، ملاحظہ ہو:

وَ يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا
تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (الاعراف: ۱۹)

(اور اے آدم تو اور تیری بیوی دونوں اس جنت میں رہو جہاں جس چیز کو تمہارا جی چاہے کھاؤ مگر اس درخت کے پاس نہ پھٹکنا ورنہ ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔)

پھر جب اللہ تعالیٰ نے ان کی نافرمانی پر عتاب فرمایا تو وہاں بھی دونوں کو ایک ساتھ خطاب فرمایا ہے۔

اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ (کیا میں نے تم دونوں کو اس درخت کے پاس جانے سے روکا نہیں تھا؟)

اس موقع پر یہ بات بھی یاد رہے کہ اہل روم کے نزدیک عورت کا عورت ہونا ہی اسے تمام حقوق سے محروم کر دیتا تھا اسی طرح اہل عرب اور دوسری بہت سی قوموں کے یہاں اس کے مالکانہ اور متصرفانہ حقوق کالعدم کر دیئے گئے تھے۔ لیکن جب اسلام کا ظہور ہوا تو اس نے بیع وشرا کے تمام حقوق عورت کو عطا کئے اور اسے اپنی ملکیت کا بلاشرکت غیرے مالک بنا دیا اور کسی بھی مرد کے لئے خواہ وہ اس کا شوہر ہو یا بھائی۔ یہ جائز نہیں رکھا کہ وہ اس کے مال میں کسی بھی طرح کا تصرف کر سکے۔

اس نے عورت کو حق وراثت بھی عطا کیا جب کہ زمانۂ جاہلیت میں وہ اس سے بالکل محروم کر دی گئی تھی۔ اسی محرومیت کو ختم کرنے کے لئے قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی:

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ ۔ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ ۚ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا

(النساء : ۷)

مردوں کے لئے اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور قریبی رشتہ داروں نے چھوڑا ہے خواہ تھوڑا ہو یا بہت اور یہ حصہ (اللہ کی طرف سے) مقرر ہے۔

اور اس طرح اسے اپنے باپ، بھائی، بیٹے، شوہر اور دوسرے اقربا کی وراثت ملنی شروع ہوئی۔

اسی طرح زمانۂ جاہلیت میں اپنے مہر پر بھی اس کا کوئی حق نہیں تھا اس کے باپ، بھائی اور دوسرے رشتہ دار اس کو ہتھیا لیتے تھے پھر گھر سے لائے ہوئے جہیز پر بھی اس کا کوئی اختیار نہیں تھا بلکہ اس کا شوہر اسے لے لیتا تھا خلاصہ یہ کہ کوئی بھی ذریعہ اس کے لئے ایسا نہیں تھا جسے اختیار کر کے وہ کسی مال کی مالکہ بن سکے۔ اسلام نے آکر اس کے جملہ معاشی حقوق بحال کئے اور کسی شوہر اور عزیز کے لئے یہ گنجائش نہیں رکھی کہ وہ اس کا مال لے سکیں۔ چنانچہ مہر کے سلسلہ میں اس نے کہا

وَآتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً (النساء : ۴)

(عورتوں کو ان کی مہر جس جوان کا حق ہے دیدو)

علامہ ابن حزمؒ کہتے ہیں کہ از روئے شرع کسی شوہر کو اس بات کا حق نہیں ہے کہ وہ اس کے جہیز اس کے مال اور مہر میں سے تھوڑا سا بھی اسے مجبور کر کے لے سارا کا سارا مہر صرف عورت کا حق ہے وہ اس میں سے بغیر شوہر کی اجازت کے جیسا چاہے خرچ کرے شوہر کو اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہے"۔

آگے مزید کہتے ہیں۔

"کسی لڑکی کے باپ — خواہ لڑکی بالغ ہو یا نابالغ شوہر آشنا ہو یا غیر شوہر آشنا — کو بھی یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنی لڑکی کے مہر سے کچھ بھی لے اگر باپ یا کوئی بھی قریبی عزیز کچھ لیتا ہے تو یہ سراسر ناجائز، باطل اور حرام ہے۔ اپنا مال خرچ کرنے کا اختیار صرف عورت کو ہے وہی جہاں چاہے اسے خرچ کرے باپ اور شوہر کو کچھ بولنے کا قطعاً اختیار نہیں ہے"[1]

پھر عورت کو جہاں اشیائے منقولہ کی ملکیت کا حق ہے وہیں اشیائے غیر منقولہ کی ملکیت کا بھی حق حاصل ہے غرض یہ کہ مال کی کوئی بھی قسم ہو اسکی ملکیت عورت کے لئے صحیح ہے پھر تجارت اور دوسرے جائز ذرائع سے مال حاصل کرنا بھی جائز ہے۔ وہ ضمانت دے بھی سکتی ہے اور لے بھی سکتی ہے تحائف دینے کا بھی حق اسے حاصل ہے۔ اپنے مال میں رشتہ داروں کے علاوہ دوسرے لوگوں کے لئے وہ وصیت بھی کر سکتی ہے۔ اگر کسی جھگڑے کا اندیشہ ہو تو عدالت کی طرف بھی رجوع کر سکتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ یہ اور اس جیسے دوسرے بہت سے حقوق ہیں جو اسلام نے عورت کو عطا کئے ہیں۔ اور جو اسے اسلام سے پہلے بالکل حاصل نہیں تھے۔

---

[1] المحلّی ج ۹ ص ۵۰۷ تا ص ۵۱۱

امام محمد عبدہؒ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ:

"اسلام نے عورت کو اس بلند مقام پر لا کھڑا کیا ہے اور اسے وہ حقوق دلائے ہیں جو اسے ماضی میں کبھی حاصل نہیں رہے اور نہ مستقبل میں کبھی حاصل ہو سکتے ہیں۔ آج تک کوئی قوم عورت کے لئے اتنے بلند مقام کا تصور بھی نہیں کر سکی ہے جسے اسلام نے صدیوں پہلے اسے عطا کیا تھا۔"

"مغربی تہذیب جو عورتوں کی تعلیم و تربیت اور دیگر علوم و فنون میں ان کے ارتقاء کی قائل بلکہ اس کی علمبردار ہے اس نے بھی عورتوں کو وہ حقوق عطا نہیں کئے جو اسلام نے بہت پہلے ہی دے دیئے تھے۔

آج بھی وہاں بعض ایسے قوانین نافذ ہیں جس سے عورت کے متصرفانہ حقوق کا بری طرح استحصال ہو رہا ہے۔ اور آج پچاس سال سے وہ وہاں زندگی کے ہر شعبہ میں ٹاٹ کے پیوند کی طرح ٹانک دی گئی ہے اور وہ اس حالت کو پہنچا دی گئی ہے جہاں تک کہ شاید وہ زمانۂ جاہلیت میں بھی نہیں پہونچی تھی۔"

یہی عظیم مصنف ایک اور جگہ رقم طراز ہے:

"اہل مغرب جنھوں نے اپنی دانست میں عورت کو بہت بلند مقام دیدیا ہے وہ اس پر فخر کرتے ہیں اور عورتوں کے معاملہ میں ہمیں متعصب اور تنگ نظر کہتے ہیں۔ یہ جاہل یہ سمجھتے ہیں کہ آج جو ہماری حالت ہو رہی ہے وہ ہمارے اپنے دین کا نتیجہ ہے۔" [۱]

ہمارے مغرب زدہ وہ نوجوان جنھیں الاستاذ محمد عبدہؒ کے علم و فضل اور دوسری تہذیبوں پر ان کے دقت مطالعہ کا علم نہیں ہے وہ شاید موصوف کے ان اقتباسات پر انھیں ملامت کریں اور اسے پاگل کی بڑ سمجھیں کیوں کہ اس تہذیب کی ظاہری چمک دمک نے ان کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہے۔

---

[۱] تفسیر المنار ص ۳۷۵، ۳۷۹

معاشرتی حقوق

اسلام نے عورت کو معاشرتی حقوق بھی عطا کیے ہیں جن کے لئے اس کے پاس مندرجہ ذیل قوانین ہیں:

(الف) جب لڑکی بالغ ہو جائے اور اس کی ذکاوت و ذہانت کے آثار ظاہر ہو جائیں تمام معاملات کو اچھی طرح سمجھنے لگے تو اسے اپنے مال اور اپنی ذات سے متعلق تصرف کے تمام حقوق حاصل ہو جاتے ہیں اب اسے یہ بھی اختیار ہے کہ الگ سے کوئی مکان لے کر اس میں رہے اور اس کے اعزاء و اقرباء کو اس میں مداخلت کا کوئی حق باقی نہیں رہ جاتا کہ وہ اسے مجبور کر کے اپنے ہی ساتھ رکھیں بشرطیکہ وہ خود باشعور ہو اور اپنی عصمت و عفت کی حفاظت کر سکتی ہو۔

الاستاذ احمد ابراہیم رقم طراز ہیں:

"لڑکی جب جوان ہو جائے، چاہے کنواری ہو یا شوہر آشنا۔ اور اس کے حالات غیر اطمینان بخش ہوں تو اس کے باپ کو یا جو بھی ذمہ دار ہو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اسے اپنے ہی پاس رہنے کے لئے مجبور کریں لیکن اگر وہ دانشمند اور باعفت ہو تو کسی بھی ذمہ دار کو اسے اپنے پاس قیام کرنے کے لئے مجبور کرنے کا حق نہیں ہے الا یہ کہ وہ شادی کرلے تو اس کا یہ حق ساقط ہو جاتا ہے اور اس کا شوہر کے یہاں رہنا ضروری ہو جاتا ہے تا کہ وہ حق زوجیت ٹھیک طرح سے ادا کر سکے اور اسے آرام پہونچا سکے یہ ایک فطری بات جس کی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔"

(ب) اسے اپنی پسند سے شادی کرنے کا حق ہے۔ اور کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اس کی ناپسندیدگی کے باوجود اپنی مرضی سے اس کی شادی کسی سے کردے۔ اور اگر وہ خود کسی صاحب کردار آدمی سے شادی کرنا چاہتی ہے تو بھی کوئی اسے رد کرنے کا مجاز نہیں ہے کیونکہ یہ اسکا ذاتی معاملہ ہے اور یہ اسکا

سب سے اہم حق ہے جس میں وہ معروف طریقے پر تصرّف کا اختیار رکھتی ہے۔ اس سلسلہ میں نبی کریمؐ کی یہ حدیث بھی ملاحظہ ہو، فرمایا لَیْسَ لِلْوَلِیِّ مَعَ الْبِنْتِ اَمْرٌ (ابوداؤد) کسی ولی کو لڑکی کے معاملہ میں کوئی اختیار نہیں ہے۔ مزید فرمایا "اَلثَّیِّبُ اَحَقُّ بِنَفْسِھَا مِنْ وَلِیِّھَا وَالْبِکْرُ تُسْتَاْذَنُ فِیْ نَفْسِھَا وَاِذْنُھَا صُمَاتُھَا"[1] شوہر آشنا اپنے سلسلہ میں اپنے ولی سے زیادہ مختار ہے اور کنواری کے سلسلہ میں ولی اس سے اجازت چاہے گا اور اس کی خاموشی ہی اجازت ہے۔ علامہ ابن قیمؒ اس حدیث کو پیش کر کے اپنی بات اس طرح شروع کرتے ہیں۔

"بالغ، عاقل اور دانا لڑکی کے مال میں بھی جب اس کے باپ کو لڑکی کی اجازت کے بغیر تصرف کا حق نہیں تو خود اس کی ذات میں بغیر اس کی مرضی کے وہ کیسے تصرف کر سکتا ہے، جب کہ مال میں تصرف کا حق کسی ناپسندیدہ مرد کے ساتھ شادی کر دینے کے مقابلہ میں نہایت معمولی بات ہے۔"[2]

لیکن ان پابندیوں کے باوجود اگر کوئی ولی اپنی لڑکی کو کسی ناپسندیدہ مرد سے بیاہ دیتا ہے تو لڑکی کو یہ حق حاصل ہے کہ چاہے تو اس شادی کو قبول کرلے اور چاہے تو رد کر دے۔ حدیث میں آتا ہے کہ خنسا بنت حذام کے والد نے ان کی شادی کسی ایسے مرد سے کر دی جسے وہ پسند نہیں کرتی تھیں (واضح رہے کہ ان کے پہلے شوہر کا انتقال ہو چکا تھا) تو رسول اللہؐ نے اس شادی کو منسوخ کر دیا۔[1]

اسی لئے نکاح کے وقت لڑکی کا موجود ہونا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ الشیخ احمد ابراہیم "الاحکام الشرعیہ" میں رقمطراز ہیں۔

نکاح کے نافذ ہونے کی شرائط میں سے یہ بھی ہے کہ زوجین میں سے ہر ایک آزاد، بالغ اور

---

[1] بخاری کے علاوہ دوسری بہت سی حدیث کی کتابوں میں مروی ہے۔ [2] زاد المعاد جلد ۴

[3] الاحکام الشرعیہ صہ ۹

عاقل ہو اور دونوں بوقت نکاح موجود ہوں یا دونوں کے وکیل ہوں یا ان دونوں میں سے ایک خود موجود ہو اور دوسرے کا وکیل موجود ہو[1]

الشیخ علامہ محمود شلتوت اس مسئلہ کے متعلق رقمطراز ہیں۔

"اس سلسلہ میں ہم جب قرآن کی طرف نظر دوڑاتے ہیں تو ہمیں ملتا ہے کہ اسلام عورت کے اپنے سلسلہ میں اس تصرف کا قائل ہے۔ سورہ احزاب کی یہ آیت ملاحظہ ہو:

وَ امْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِیِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِیُّ اَنْ یَّسْتَنْكِحَهَا ۗ خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ؕ (الاحزاب: ۵۰)

اور وہ مومن عورت جس نے اپنے آپ کو نبیؐ کے لئے ہبہ کیا ہو اگر نبی اسے نکاح میں لینا چاہے۔ یہ رعایت خالصۃً تمہارے لئے ہے دوسرے مومنوں کے لئے نہیں ہے۔

سورہ بقرہ میں ارشاد فرمایا:۔

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰی تَنْكِحَ زَوْجًا غَیْرَهٗ ؕ

"پھر اگر (دوبارہ طلاق دینے کے بعد شوہر نے عورت کو تیسری بار) طلاق دے دی تو وہ عورت پھر اس کے لئے حلال نہ ہوگی الآیہ کہ اس کا نکاح کسی دوسرے شخص سے ہو (اور وہ اسے طلاق دیدے)

اسی سورہ میں آگے ارشاد فرمایا:

فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ فِیْمَا فَعَلْنَ فِیْۤ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ (بقرہ ۲۳۴)

پھر جب ان کی عدت پوری ہو جائے تو انھیں اختیار ہے اپنی ذات کے معاملہ میں معروف

---

[1] احکام الشرعیہ ص۹

طریقہ سے جو چاہیں کریں۔

ان تمام آیات میں صراحتاً "شادی کرنے" کا فعل عورت کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور ان تمام تصرفات میں ولی کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ پھر یہ بھی نہایت غیر معقول اور غیر شرعی بات معلوم ہوتی ہے کہ کسی معاملہ میں تصرف کے لئے صاحب معاملہ کا موجود ہونا ضروری تو ہو لیکن جب وہ خود بلاشرکت غیر اسے حل کرنا چاہے تو اس پر عدم جواز کا فتویٰ لگا دیا جائے۔ پھر اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ از روئے شرع کسی ذاتی معاملہ میں تصرف کا حق ہر عاقل اور بالغ کو حاصل ہے لیکن یہی صورتحال جب عورت کی شادی کے سلسلے میں پیش آئے تو وہ ناجائز ہو جائے یہ بات بھی قرین قیاس معلوم نہیں ہوتی۔ پھر یہ بات بھی ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ شادی کا تمام تر تعلق صرف شوہر اور بیوی سے ہوتا ہے اور یہ مسلّمہ اصول ہے کہ تمام معاملات میں اختیار کُلّی صرف صاحب معاملہ کو ہوتا ہے[1]۔

استاذ موصوف کی بات اپنے معنی ومفہوم کے لحاظ سے بالکل واضح ہے اس پر اپنی طرف سے کچھ وضاحت کرنا سورج کو چراغ دکھانا ہے اس بات سے بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسلام میں عورت کا مقام کس قدر بلند ہے۔

(ج) معاشرتی حقوق میں سب سے اہم حق جو معلوم انسانی تاریخ میں عورت کو اسلام کے سوا کسی نے نہیں دیا ہے اور آج تک مغربی تہذیب کے متوالے اور آزادی نسواں کے علمبردار بھی اس حد کو نہیں پہونچ سکے ہیں وہ یہ ہے کہ اسلام نے عورت کو صلح وجنگ دونوں حالتوں میں مخالف دشمنوں کو پناہ دینے کا اختیار دیا ہے۔

حدیثوں میں آتا ہے کہ جب مکہ فتح ہوا تو حضرت ام ہانیؓ، جو حضرت ابوطالب کی بیٹی اور حضرت

---

[1] رسالۃ القرآن والمرأۃ ص ۱۲، ۱۳

علیؓ کی بہن تھیں ۔ انھوں نے مشرکین میں سے ایک آدمی کو پناہ دی تو حضرت علیؓ نہیں مانے اور وہ اس کے قتل کے درپے ہو گئے۔ حضرت ام ہانیؓ فوراً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں پہونچیں اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ، علیؓ ایک ایسے شخص کو قتل کرنا چاہتے ہیں جسے میں نے پناہ دے دی ہے اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ امّ ہانی ہم نے بھی اس شخص کو پناہ دی جسے تم نے پناہ دی ہے[1]

اسی سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اور ارشاد ملاحظہ ہو :۔

یَدُ الْمُسْلِمِیْنَ عَلٰی مَنْ سِوَاھُمْ تَتَکَافَأُ دِمَاءُھُمْ وَیُجِیْرُ عَلَیْھِمْ اَدْنَاھُمْ

تمام ذی حیثیت مسلمان دوسرے کم رتبہ مسلمانوں کے سرپرست ہیں ان کے خون برابر ہیں اور ان سب کو پناہ دینے کا حق حاصل ہے۔

ظاہر ہے کہ لفظ "المسلمین" ایک جامع صفت ہے جو مرد اور عورت سب پر محیط ہے اس لئے ام ہانیؓ کی سابقہ حدیث کے پیش نظر یہاں بھی یہ حق تمام عورتوں کو ملے گا۔ اس سلسلہ میں نبی کریمؐ کا یہ قول اس کی مزید توضیح کر دیتا ہے کہ" اِنَّ الْمَرْأَۃَ لَتَاخُذُ لِلْقَوْمِ "[2] المنتقیٰ کے مصنف نے اس کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ مسلمانوں کی طرف سے وہ پناہ دے سکتی ہے پھر حضرت عائشہؓ کی حدیث بھی اس سلسلہ میں ایک طرح سے نصّ قاطع ہے۔ فرماتی ہیں "اگر عورت مسلمانوں کی طرف سے پناہ دینا چاہے تو دے سکتی ہے"۔ اس اجازت کا صاف مطلب ہے کہ اسلامی معاشرہ میں عورت کے اس فعل کو احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور اسے پناہ دینے کا بالکل حق حاصل ہے اور کوئی شخص عورت کے اس فعل کو چیلنج نہیں کر سکتا۔

---

[1] متفق علیہ [2] ترمذی۔ باب ماجاء فی امان المرأۃ "عورت پورے قوم کی ذمہ داری لے سکتی ہے"۔

گرچہ یہ ایک نہایت اہم معاملہ ہے بلکہ شاید اسے خطرناک بھی کہا جا سکتا ہے اور اس سلسلہ میں نہایت محتاط رہنے کی بھی ضرورت ہے اس کے باوجود اسلامی معاشرہ عورت کے اس حق کو قبول کرتا ہے اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسلامی معاشرہ میں عورت کس قدر محترم اور معتمد ہوتی ہے۔ یہ تو اسلام نے عورت کو مقام دیا ہے۔ لیکن مغرب عورت کے مساوات اور آزادی کا علمبردار بننے کے باوجود اب تک عورت پر اعتماد کے معاملہ میں اس حد تک نہیں پہونچ سکا ہے۔ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ وہ انسان — خواہ مرد ہو یا عورت — کے اندر اخلاق کی بلندی اور تقویٰ و طہارت نہیں پیدا کرتا اس لئے اس معاشرہ کے افراد ان امانات اور ان اقدار کے حامل نہیں بن سکتے جو اسلام کے ماننے والوں کے اندر موجود ہوتے ہیں اس لئے کہ یہاں افراد کی بلندی کا معیار ان کا حسب و نسب اور شہرت و عزت نہیں بلکہ یہاں تمام انسان برابر ہیں۔ اگر کسی کو کوئی فضیلت حاصل ہے تو اس کی بنیاد اس کے ایمان و عقیدہ کی پختگی ہے۔ سب کی منزل ایک ہے اسی سے ان کی عزت و سربلندی ہوتی ہے اسی کے لئے ان کی زندگی صرف ہوتی ہے اور اگر اس پر کوئی آفت آئے تو جان و مال سے اس کا دفاع بھی کرتے ہیں۔ اس معاشرہ میں اعلیٰ و ادنیٰ سب برابر ہیں اسی لئے اس معاشرہ میں حقیقی مساوات ہوتی ہے۔ باہمی اعتماد اور محبت کے جذبات اپنی پوری شکل میں یہاں پائے جاتے ہیں اسی لئے جب معاشرہ کا کوئی ادنیٰ شخص بھی کسی کو حفاظت میں لیتا ہے تو پورا معاشرہ اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور سب کے دلوں میں یکساں عزت و محبت کے جذبات ہوتے ہیں۔

سماج اور عورت

مندرجہ بالا تفصیلات سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ ایک اسلامی سماج میں عورت کو کتنے حقوق ملتے ہیں۔ اسے ہر طرح کے دینی، سیاسی، معاشی، سماجی حقوق ملتے ہیں اور منطقی طور پر اس کے نتیجہ میں اس

کی زندگی نہایت خوشگوار ہو جاتی ہے۔ واضح رہے کہ یہ تمام وہ حقوق ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے اپنے متعین مقصد کی بازیابی کے لئے معاشرہ کے ہر فرد کو عطا کئے ہیں۔ اس سے بھی اس کی حکمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز عبث اور بیکار نہیں پیدا کی ہے۔ اور اس دنیا میں مقصد کے لحاظ سے ہی ہر چیز کے درجہ اور مرتبہ کی تعیین بھی کر دی ہے۔ قرآن کی مندرجہ ذیل آیت میں اللہ تعالیٰ نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (توبہ: ۷۱)

(مومن مرد اور مومن عورتیں یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں، بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی رحمت نازل ہو کر رہے گی، یقیناً اللہ سب پر غالب اور حکیم و دانا ہے۔)

اس آیت کریمہ نے انسانی زندگی کے تمام گوشوں کا اچھی طرح سے احاطہ کر لیا ہے اور ان تمام اوصاف و خصائص کو جمع کر دیا ہے جس سے متصف ہونے پر ہی کسی فرد یا معاشرے کی ترقی کا دارو مدار بنتا ہے۔ یہ وہ قدریں ہیں جن کی حفاظت کی ذمہ داری ہر مسلمان پر ڈالی گئی ہے۔ لیکن چونکہ یہاں ہماری بحث صرف عورت ہی تک محدود ہے اس لئے ہم مندرجہ بالا خوبیوں سے عورت کے تعلق کے موضوع پر ہی اس آیت کی روشنی میں چند نکات پیش کریں گے۔

(الف) اس آیت میں ایک مثالی سماج ۔ حقیقی اسلامی سماج ۔ کے افراد کی خوبیوں نیز

ان کے باہمی تعلقات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ واضح رہے کہ ایک اسلامی معاشرہ میں ایک اٹوٹ رشتہ ہوتا ہے نہ تو فرد کو معاشرے سے الگ کیا جا سکتا ہے اور نہ معاشرہ ہی فرد کو نظر انداز کر سکتا ہے اور اس تعلق کی بنیاد وہ روحانی قدریں ہوتی ہیں جن پر ایمان لانے سے ایک شخص "مسلم" ہوتا ہے ان میں سب سے پہلی چیز اللہ کی ذات اور صفات پر ایمان ہے اور یہی عقیدہ فرد اور معاشرہ کے تعلق کی سب سے مضبوط بنیاد ہے کیونکہ فرد اور معاشرہ کا تمام تر تعلق ذہنی اور جذباتی ہوتا ہے اور ان اسلامی قدروں پر ایمان لانے ہی سے یہ بنیاد مضبوط ہوتی ہے اور اس قدر مضبوط ہو جاتی ہے کہ اسے سیسہ پلائی ہوئی دیوار سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تعلق میں یہ پختگی دراصل اس ایمان ہی کا نتیجہ ہوتی ہے جسے مان لینے کے بعد آدمی معاشرہ کا ایک ذمہ دار فرد بن جاتا ہے جسے اپنے برے بھلے ہر کام کی خدا اور بندوں کے سامنے جوابدہی کرنی پڑتی ہے اور اسی سے باہمی تعاون اور محبت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے یہ دراصل بہت بلند مقام ہوتا ہے جہاں تک پہونچنے کے لئے ہر کوئی خواہش کر سکتا ہے۔ یہی حقیقت ہے جس کی طرف اس آیت کریمہ میں اشارہ کیا گیا ہے:۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ

مومن مرد اور مومن عورتیں سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں

اس میں صاف طور پر اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ایک اسلامی معاشرہ میں مرد اور عورت سب کے لئے وجہ امتیاز ایمان ہے اور ان کے آپسی تعلق کی بنیاد بھی یہی ایمان ہے۔

(ب) جب کسی معاشرہ کی بنیاد ایمان پر ہوتی ہے تو اس کے افراد میں خود بخود اجتماعی اور انفرادی دونوں لحاظ سے کچھ ممتاز اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں وہ یہ ہیں کہ "وہ بھلائی کا حکم دیتے ہیں، برائی سے روکتے ہیں نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔" یہاں ہم اپنے موضوع کا پابند رہتے ہوئے آیت کریمہ کے صرف اسی حصہ سے تعرض کریں گے جس کا تعلق صرف عورتوں سے

ہے۔ فرمایا "یامرون بالمعروف وینھون عن المنکر" آیت کے اس ٹکڑے پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے معاشرہ کو فساد سے بچانے اور اسے نیکی کی راہ پر گامزن کرنے کے لئے ہر مومن اور مومنہ کو ایک امانت سونپی ہے اور ہر ایک کو اس کا ذمہ دار بنایا ہے جس میں مرد اور عورت کسی کا کوئی استثنا نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں پوری نوع انسانیت ہے اس کے یہاں تذکیر و تانیث کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ نہایت بلند مقام ہے اور کوئی معاشرہ ایسا نہیں ہے جس نے عورت کو یہ مقام عطا کیا ہو۔

(ج) زیر بحث آیت کریمہ (یامرون بالمعروف وینھون عن المنکر) یہ مسلمانوں کی ذمہ داریوں میں اضافہ کر دیتی ہے اور وہ ذمہ داری یہ ہوتی ہے کہ وہ معاشرہ کے نظم و نسق اس کے سیاسی، معاشی، معاشرتی اور روحانی ڈھانچے کو ہر لحاظ سے مضبوط کرے اس کے کسی بھی شعبہ زندگی کو تشنہ نہ چھوڑے اس معاشرے میں کوئی ایسا شخص نہیں ہونا چاہئیے جو اپنی آنکھوں سے ظلم و فساد، فقر و فاقہ اور خود غرضی و جہالت کو پروان چڑھتا ہوا دیکھے اور چپ رہ جائے بلکہ اس سماج کے ہر فرد کے اندر ایسی اخلاقی جرأت ہونی چاہئیے جو مظالم کا استیصال کر سکے اور معاشرہ کو تباہ کرنے والے عناصر سے بچا سکے۔

اور ان تمام معاملات میں عورت کے اوپر اپنی استطاعت کے مطابق جد وجہد فرض ہے۔ اسے چاہئیے کہ وہ اپنے دائرہ کار میں رہتے ہوئے میدان سیاست میں بھی حصہ لے۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے ماحول کو اچھی طرح سے سمجھے اس کی خوبیاں اور خامیاں اس کی نظر میں رہیں اسی وقت وہ اپنے فرائض بہتر ڈھنگ سے ادا کر سکتی ہے اور انھیں چیزوں کو رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کے معاملات میں دلچسپی سے تعبیر فرمایا ہے۔ حدیث نبوی ہے (مَنْ لَمْ یَھْتَمَّ بِاَمْرِ الْمُسْلِمِیْنَ فَلَیْسَ مِنْھُمْ) جو مسلمان مسلمانوں کے معاملات میں دلچسپی نہ لے وہ ان میں سے نہیں ہے۔

اور مسلمانوں کے معاملات کی نوعیتیں مختلف ہوتی ہیں جو حالات زمانہ کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہیں بعض زراعت کا پیشہ کرتے ہیں کچھ مصنوعات تیار کرتے ہیں کچھ تجارت کرتے ہیں کچھ حکومت کی اصلاح کرتے ہیں، کچھ ملک کی غربت وافلاس کو دور کرنے کی کوشش کرتے اور کچھ معاشرے میں افراد کی تہذیب واخلاق کو درست کرنے کے کام میں حصہ لیتے ہیں۔ اور بعض لوگ اجتماعی ترقی کے لئے کوشاں ہوتے ہیں۔ بعض لوگ کسی مخصوص حلقہ میں کام کرتے ہیں اور کسی کا دائرہ کار بہت وسیع ہوتا ہے۔ اور ان تمام معاملات میں عورت کی بھی وہی حیثیت ہوتی ہے جو مرد کی ہوتی ہے اور اگر مستقبل کا ارتقاء ہمارے لئے زندگی کے جدوجہد کے کچھ مزید گوشے سامنے لائے گا تو معاشرہ کے ارتقاء کے لئے اس میں بھی عورت اپنا رول ادا کرے گی۔

یہاں ہمارا مقصد عورت کے طریقہ کار کی وضاحت اور اس کے کام کے اجزاء پر بحث کرنا نہیں ہے کیونکہ یہ چیزیں ماحول اور زمانہ کے تغیر کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں یہاں ہم صرف اس کے فطری دائرہ کار اور ان سرگرمیوں کے مختلف پہلوؤں کی نشاندہی کریں گے جن کی انجام دہی اس دائرہ میں ممکن ہے لیکن آگے بڑھنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایک ایسے سوال کا جواب دیدیا جائے جو آگے کے بہت سے سوالات اور پیچیدگیوں کو ختم کردیتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ میں عورت کا جو دائرۂ کار متعین کیا گیا ہے اسے یونہی بلا سمجھے بوجھے نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس کے پیچھے نہایت گہرائی فکر اور سوچا سمجھا منصوبہ ہے جس میں معاشرہ کی فلاح وصلاح اور ترقی وسربلندی کا راز پنہاں ہے اس کے بغیر کسی معاشرہ کے ارتقاء کا صحیح معنوں میں تصور ہی نہیں کیا جاسکتا اس لئے کسی کا یہ کہنا کہ عورت کے اس دائرہ کار کی تعیین بلاوجہ اور غیر ضروری ہے جس سے وہ معاشرہ سے کٹ کر بالکل الگ تھلگ اور تنہا رہ جاتی ہے سراسر حماقت اور جہالت ہے۔ ہماری یہ بات بلادلیل کہہ کر نظر انداز کی جاسکتی ہے۔ اس لئے آئیے ماضی کی مسلمان عورتوں اور اس زمانہ کی عورتوں کے

حالات کا مقابلہ کر کے دیکھیں کہ ان کے عقیدہ نے ان کی شخصیت کو کس طرح سنوارا کس طرح ان کی تربیت کی اور کس طرح ان کے لئے ذہنی و فکری ترقی و نشو و نما کے مواقع فراہم کئے۔ جب ہم ان کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کے باوجود کہ ان کا دائرہ کار ان کے گھر کی چہار دیواری تھی لیکن اس چہار دیواری کے اندر رہ کر بھی وہ کبھی قومی اور معاشرتی مسائل سے غافل نہیں رہیں اور شائد دنیا کی تاریخ میں وہ اپنی نوعیت کا پہلا معاشرہ تھا جس کی عورتوں نے قوم کے عمومی اور خصوصی مسائل میں اس قدر توجہ اور دلچسپی کا مظاہرہ کیا ہو۔ اور اس حد تک کہ دین و دنیا، خاندان اور معاشرہ، جنگ و صلح اور روحانی و جسمانی ہر میدان میں مردوں کی برابر رہی ہوں۔ کوئی کٹر سے کٹر مخالف بھی ان کی شجاعت سے انکار نہیں کر سکتا جب اسے یہ معلوم ہو کہ انھوں نے اپنے اس عقیدہ اور ایمان کی خاطر اپنے شوہروں اور نوجوان بیٹوں تک کو میدان جنگ میں جھونک دیا اپنا سارا مال و زر اسی راہ میں صرف کر دیا اور خود میدان جنگ میں سپاہیوں کی خدمت کرتیں پیاسوں کو پانی پلاتیں مریضوں کو دوائیں دیتیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔ آج کی مسلمان عورتوں پر مت جائیے کہ انھیں اپنے مقام و مرتبہ کا احساس نہیں ہے ماضی کی مسلمان عورتوں کو دیکھئے کہ اسی ایمان و عقیدہ کی بدولت انھیں نے اپنے گھر کی چہار دیواری میں رہتے ہوئے کیسے کیسے کارہائے نمایاں انجام دیئے جن کی مثال نوع انسانی کی پوری تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔

اب اگر اس زمانہ کی عورت اپنے اس کھوئے ہوئے مقام کو حاصل کرنا چاہتی ہے تو اسے مغرب کی تقلید، اس کی بے قید آزادی، اباحیت پسندی، مرد و زن کے آزادانہ اختلاط اور اس طرح کے دوسرے اوہام و خرافات کو چھوڑنا ہوگا اور اپنے حقیقی مقام کو حاصل کرنے کیلئے ان چیزوں کو بروئے عمل لانا پڑے گا جن کی تعلیم ہمیں اسلام نے دی ہے اور جس کے مان لینے ہی میں مرد و زن اور سماج و معاشرہ کی ترقی ممکن ہے۔ اور جب ایسا ہو جائیگا تو اس دن کسی عورت کو اپنے حقوق طلب کرنے کے لئے مردوں سے مقابلہ آرائی کی ضرورت باقی نہیں رہ جائے گی بلکہ اپنے فرائض واجبات کی ادائیگی کے لئے اس کا اپنا الگ میدان ہوگا۔

باب سوم

خاص حقوق

فصل اوّل ——————— زوجیت
فصل دومؔ ——————— تعدد ازواج
فصل سوم ——————— طلاق
فصل چہارم ——————— حلالہ
فصل پنجم ——————— عورت، ماں اور بیوی کی شکل میں
فصل ششم ——————— پردہ
فصل ہفتم ——————— فیملی پلاننگ

فصل اوّل

زوجیت

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (الذاریات ۴۹)

(اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے بنائے ہیں شاید کہ تم اس سے سبق لو۔

۱۔ شادی اور قانونِ فطرت

شادی، بیاہ، شوہر و بیوی کے جنسی تعلقات، یہ سب وہ الفاظ ہیں جو انسانی فطرت کے جنسی پہلو کی عکاسی کرتے ہیں یہ دراصل انسان کی وہ ضرورت ہے جسے خالق کائنات نے اس کی فطرت میں ودیعت کر دیا ہے۔

یہاں ہمارا مقصد علم النفس کی اصطلاح میں اس کے "جنسی پہلوؤں" کی وضاحت نہیں ہے بلکہ ہم کائنات کے اس راز سربستہ سے پردہ اٹھانا چاہتے ہیں جسے ہم اپنی سادہ زبان میں "فطرت انسانی" کا نام دیتے ہیں۔

"قانونِ زوجیت" دراصل اس کائنات کا وہ قانون ہے جس میں ہمارے ماحول کی ہر چیز جکڑی ہوئی ہے اور جس پر اس کے نسل کی بقا کا انحصار ہے۔ آیت قرآنی ہے:۔

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (الذاریات ۴۹)

(اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے بنائے ہیں شاید کہ تم اس سے سبق لو۔

اور ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ "کُلِّ شَيْءٍ" کا علم سوائے اللہ تبارک و تعالیٰ کے اور کسی کو نہیں ہے۔

البتہ لغت کے اعتبار سے اس کا اطلاق دنیا میں پائی جانے والی ہر چیز پر ہوتا ہے خواہ ہمیں اس کا علم ہو یا نہ ہو خواہ وہ جاندار ہو یا غیر جاندار ناطق ہو یا غیر ناطق۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ (یٰسین: ۳۶)

(پاک ہے وہ ذات جس نے جملہ اقسام کے جوڑے پیدا کئے خواہ وہ زمین کی نباتات میں سے ہوں یا خود ان کی اپنی جنس (یعنی نوع انسانی) میں سے یا ان اشیاء میں سے جن کو یہ جانتے تک نہیں)

اس طرح یہ قانون زوجیت کسی ایک فرد یا ایک نوع کا قانون نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق اس دنیا دنیا میں پائے جانے والے جملہ انسان، حیوان اور جمادات و نباتات سے ہے چنانچہ یہ پورے عالم کی فطری آواز ہے اور اس کا تقاضہ ان سب کی طرف سے ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے جوڑے بنائے اور ان دونوں کو کچھ خصوصیتیں عطا کیں جو اس کے نوع مخالف کو نہیں اور اس طرح منفی اور مثبت دونوں پہلوؤں کو جوڑ دیا جیسا کہ ہم برقیات کی دنیا میں آئے دن مشاہدہ کرتے ہیں کہ منفی برق میں جو اوصاف ہوتے ہیں وہ مثبت برق میں نہیں ہوتے۔ اور یہ دونوں نتیجہ خیز اس وقت تک ثابت نہیں ہوتے جب تک ان دونوں کا اجتماع نہ ہو اور یہ اجتماع بھی اس وقت تک بارآور نہیں ہو سکتا جب تک اس میں قانونِ فطرت کا خیال نہ رکھا جائے۔ لیکن اگر ان دونوں کا اجتماع ہی سرے سے نہ ہو تو پھر یہ کس طرح اپنا وہ فائدہ پہونچا سکتے ہیں جس سے پوری نوعِ انسانی لطف اندوز ہو سکے۔

شادی اور انسانی فطرت

نوع انسانی کا ہر فرد ــ خواہ وہ مرد ہو یا عورت ـ فطری طور پر اس کی خواہش رکھتا ہے۔ اور جب تک دونوں کا اجتماع نہیں ہوتا اس کی انسانیت کی تکمیل نہیں ہو پاتی ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے

اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے :۔

وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْٓا اِلَیْھَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ

(روم : ۲۱)

(اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمھارے لئے تمھاری ہی جنس سے بیویاں جنائیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمھارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کردی یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں۔)

مندرجہ بالا آیت کریمہ پر غور کرنے سے "زوجیت" کی تین اہم حقیقتوں کا پتہ چلتا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ بیویوں کی تخلیق خود ہماری اپنی ذات سے کی گئی ہے گویا دونوں کی تخلیق ایک ہی مادہ سے کی گئی۔ اس طرح عورت نصف انسانیت ہے۔

دوسری اہم حقیقت یہ ہے کہ عورت کا مقصدِ تخلیق یہ ہے کہ شوہر اس سے سکون حاصل کرے گویا سکون کا تمام تر تعلق صرف شوہر سے ہے عورت کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ (لِّتَسْکُنُوْٓا اِلَیْھَا)

تیسری اہم بات اس زوجیت کا وہ روحانی اور اجتماعی فائدہ ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اشارہ کیا ہے وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً

ان تینوں حقیقتوں پر غور کرنے سے اللہ تعالیٰ کی حکمت کے مختلف پہلو اس طرح سے سامنے آتے ہیں کہ انسان کا دل و دماغ ایمان و یقین کی روشن کرنوں سے جگمگا اٹھتا ہے۔ اس لئے ہم اپنی اس بات کا اختتام اسی آیت کریمہ کے آخری ٹکڑے پر کرتے ہیں :۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ

(یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں)

یوں تو قانونًا زوجیت دنیا میں موجود تمام جاندار پر یکساں طور سے لاگو ہے لیکن انسان کو اللہ نے کائنات کی حکمت اور مصالح کے پیشِ نظر ایمان و اخلاق اور قوتِ فہم و ادراک نیز اختراعی و اکتشافی قوتوں سے بھی نوازا ہے اور دراصل یہی انسانیت کے امتیازی اوصاف بھی ہیں اور اس کے نتیجہ میں شفقت و محبت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جہاں انسان کو بقائے نسل اور قوانینِ فطرت کے پیشِ نظر حیوانی قوتوں کا ذخیرہ عطا کیا ہے وہیں اس کے مقصد کی بلندی اور عظمت کے پیشِ نظر اسے روحانی قوتوں سے بھی سرفراز کیا ہے اور نیک و بد کی تمیز اس کی سرشت میں رکھ دی ہے اور بنی نوع انسان کے اوپر اللہ تعالیٰ کا یہ عظیم الشان احسان ہے کہ اس نے انسان کو ان دونوں اوصاف، جنسی اور روحانی سے نوازا ہے۔

چنانچہ جنسی حیثیت سے اس نے انھیں اناث و ذکور میں تقسیم کیا اور ان دونوں کو جسمانی اختلاف کے باوجود ایک ہی طرح کے جسم دیئے جس سے دونوں ایک دوسرے کے دکھ اور تکلیف کا اچھی طرح احساس کر سکتے ہیں۔

اور روحانی حیثیت سے انھیں مرد اور عورت بنایا اور دونوں کے اندر اعلیٰ درجہ کے انسانی کمالات رکھ دیئے۔ اس طرح یہ دونوں "زوجیت" میں تو مختلف ہیں لیکن انسانیت میں بالکل یکساں ہیں اور اس حیثیت سے ان دونوں کا تعلق مثبت اور منفی اور ایجابی اور سلبی نوعیت کا ہے۔ لیکن فرائض کی ادائیگی میں انسان ہونے کے ناطے یہ دونوں برابر ہیں۔

ہم پیچھے عورت اور مرد کی "جنسی خصوصیات" کے اختلاف کی طرف اشارہ کر آئے ہیں کہ انسان کی انسانیت کا لازمی تقاضہ عورت سے سکون حاصل کرنا ہے:

خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا (روم: ۲۱)

(اس نے تمھارے لئے تمھاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو)

اس مقام پر سکون کی نسبت صرف مرد کی طرف کرنا اپنے اندر خاص معنویت رکھتا ہے۔

ہمارے بعض مفسرین یہاں سکون سے مراد جنسی سکون لیتے ہیں لیکن نظم کلام دو وجہوں سے اس مفہوم کو لینے میں مانع ہے۔

امام تفسیر علامہ فخرالدین رازی نے اس سکون کو روحانی اور قلبی سکون کے مفہوم میں لیا ہے۔ امام رازی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ لغت میں سَكَنَ اِلَيهَا سکونِ قلبی کے لئے آتا ہے اور سکونِ جنسی کے لئے سَكَنَ عِندَهٗ استعمال ہوتا ہے کیونکہ عربی میں عِندَ ظرفِ مکان کے لئے بولا جاتا ہے اور الیٰ غایت بتانے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

(۲) دوسری شہادت فطرتِ انسانی ہے کیونکہ جنسی سکون تو دونوں کو حاصل ہوتا ہے اب اگر یہاں سکونِ جنسی ہی مراد ہوتا تو اس کی نسبت صرف مردوں ہی کی طرف کیوں کی جاتی؟ پھر یہ آیت جس مضمون کے سیاق میں لائی گئی ہے اس سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے کیونکہ آیت میں زوجین میں سے صرف ایک کا تذکرہ کرکے اسی کی طرف سکون کی نسبت کرنا صاف بتاتا ہے کہ یہاں سکون سے مراد روحانی سکون ہی ہے جسمانی نہیں۔ اور ایسا اس لئے کیا گیا تاکہ زوجین میں سے دونوں کی الگ الگ انسانی خصوصیات کو واضح کیا جائے۔

یہاں ان دونوں باتوں کے علاوہ ایک اور چیز جو اس مفہوم کی تائید کرتی ہے وہ یہ ہے کہ جیسے جیسے سن شباب اختتام پذیر ہوتا ہے ویسے ویسے میاں اور بیوی کے درمیان رشتہ زوجیت میں ربط و سکون بھی مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جاتا ہے اور عمر کے آخری حصہ میں پہونچ کر جب کہ "جنسی ضرورت" ختم ہو جاتی ہے روحانی ربط و اتصال کے ایک حسین باب کا آغاز ہوتا ہے اور یہ اس قدر پائیدار ہوتا ہے کہ زمانہ کی کوئی خزاں اس محکم اور پائیدار رشتہ پر اضمحلال طاری نہیں کر سکتی۔

مزید یہ کہ اس آیت کریمہ میں اس سکون کا جو نتیجہ بتایا گیا ہے وہ بقائے نسل نہیں ہے۔

بلکہ محبت و رحمت ہے چنانچہ فرمایا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً اس سے بھی ذہن اسی روحانی سکون کی طرف منتقل ہوتا ہے ۔ گویا اللہ تعالیٰ اس "ازدواج" کا فائدہ یہ بتا رہا ہے کہ میاں اور بیوی کے درمیان شفقت و محبت اور خیر و رحمت کے جذبات پیدا ہو جائیں اس طرح گویا وہ انسان کو انسانیت سے ملانا چاہتا ہے اور اس حد تک انھیں مربوط کر دینا چاہتا ہے کہ وہ فکری، ذہنی ہر لحاظ سے مربوط و متصل ہو جائیں تاکہ ان کے اندر رحمت و شفقت کے وہ جذبات پیدا ہو سکیں جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ میں اشارہ فرمایا ہے ۔ اور جو دراصل انسان کی ارتقار اور اس کی فلاح و صلاح کے لئے ناگزیر ہیں ۔

یہ ایک واضح اور کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ مرد اور عورت کا اجتماع ناگزیر ہے ۔ تنہا رہ کر ان دونوں میں سے کسی کے اندر سخاوت اور محبت کے وہ گرم جذبات پیدا نہیں ہو سکتے جو بچہ کی پرورش میں ممد و معاون ثابت ہو سکیں ۔ یہ اجتماع دراصل انسان کی فطرت ہے جسے "قانونِ ازدواج" کی شکل میں اللہ تعالیٰ نے ہمارے نفوس کے اندر رکھ دیا ہے اور اسی سے وہ سکون حاصل ہوتا ہے جس کی طرف آیت کریمہ اشارہ کر رہی ہے ۔

یہ وہ اہم حقیقت ہے جسے اسلام نے زوجیت کے سلسلہ میں واجب ٹھہرا دیا ہے اور ہر شخص کے لئے ناگزیر ہے کہ ان فوائد کو حاصل کرنے کے لئے وہی طریقے اختیار کرے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے کیونکہ یہ چیز خود انسان کو اس کی نگاہ میں معزز بنا دیتی ہے اور معاشرہ کے اندر بلند اخلاق و کردار پیدا کرتی ہے ۔

ایک اور قابل ذکر بات یہاں یہ بھی ہے کہ ہم میں سے بہت سے لوگ شوہر اور بیوی کی عمروں کے تفاوت کو بڑی کڑی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس پر سخت اعتراض کرتے ہیں حالانکہ اس طرح کا اعتراض سوائے جہالت کے اور کچھ بھی نہیں ہے کیونکہ شادی کا مقصد محض جنسی خواہش کی تسکین

نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک طرح کی روحانیت ہے جو روح کو روح سے ملاتی ہے اور اس جہالت کا اسلام نے کافی تدارک کر دیا ہے اور اس کے وہ فوائد بتائے ہیں جس کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے۔

شادی اور فطرت اجتماعی

انسان ایک سماجی حیوان ہے اور اس کو حیوان سے ممتاز کرنے والی چیز دراصل اس کی احساس خودی اور اس کی انفرادیت ہے اس کے اندر اجتماعی زندگی گذارنے اور معاشرہ کو تعمیر و ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے جذبات ہوتے ہیں جو عام حیوانات کے اندر نہیں پائے جاتے اور ان جذبات کو صحیح رخ دینے کے لئے ہی پیغمبر اور مصلحین آتے ہیں جو دنیا میں آکر فرد اور معاشرہ کے تعلقات کو درست کرتے ہیں اور یہ ایک حقیقت ہے کہ فرد اور معاشرہ کے تعلقات کو درست کرنے کا سب سے بہتر طریقہ جس سے قدیم و جدید متمدن معاشرہ اب تک آشنا ہو سکا ہے وہ خاندان کا نظام ہے کیونکہ یہی فطری طریقہ ہے جو فرد اور سماج سب کے لئے انتہائی مفید ہے۔

شادی کی سب سے پہلی خوبی یہ ہے کہ آدمی جنسی خواہشات کی تکمیل کے لئے ایک حد کھینچ دیتا ہے جس کے بعد وہ دوسروں کے حدود میں نہیں جاتا اس طرح وہ اپنی اس فطری خواہش کو ایک صحیح رخ بھی دیتا ہے اور اپنے آپ کو کچھ ضابطوں کا پابند بھی بناتا ہے تاکہ دوسروں کی عصمتوں کی حفاظت ہو سکے۔ اور یقیناً یہ وہ مبارک فعل ہے جسے انجام دے کر وہ اپنی معاشرتی زندگی کو کامیاب بنا سکتا ہے۔

اس کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اس سے میاں بیوی کے درمیان محبت اور مودّت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور وہ دونوں کیف و نشاط کی مسرتوں سے سرشار ہو جاتے ہیں اور یہ چیز انھیں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ کرتی ہے اس طرح ان کے اندر رحمت و شفقت اور ایک

دوسرے کے لئے ایثار و قربانی کے جذبات کو جلا ملتی ہے۔

اس کی تیسری خوبی یہ ہے کہ جب جذبہ محبت سے سرشار دو میاں بیوی ملتے ہیں تو ان کے درمیان تکلفات کے سارے پردے ہٹ جاتے ہیں اور ان کی محبت کے لئے ایک وسیع میدان فراہم ہو جاتا ہے چنانچہ بچوں کی پیدائش کے بعد وہ ان سے بے پناہ محبت کرتے ہیں اور ان پر اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ اس طرح ان کے جذبۂ خودی کی تسکین کا سامان فراہم ہوتا ہے اور معاشرہ کی ترقی کی خاطر وہ اپنی پوری صلاحیت صرف کرنے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔

خاندانی نظام کی تاسیس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ آدمی جب اپنے خون پسینہ سے کمائی ہوئی گاڑھی کمائی کو اپنے اہل و عیال پر خرچ کرتا ہے تو اس کے اندر ایثار کا جذبہ پیدا ہوتا ہے جب کہ اس سے پہلے وہ صرف اپنے لئے کام کرتا تھا اور بس۔ لیکن شادی کر کے وہ اپنی کمائی ہوئی دولت میں دوسروں کو بھی شامل کرتا ہے۔

اور یہی وہ چیز ہے جسے معاشرتی زندگی کی شاہ کلید کہا جا سکتا ہے۔

شادی اور جنس

مرد اور عورت کے جسمانی فرق کا بنظر غائر مطالعہ کرنے سے خاص طور سے عورت کے رحم کے عمل پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ قدرت کی نظر میں مرد اور عورت کی جنسی تسکین کی کوئی اہمیت نہیں ہے بلکہ شادی کا اصل مقصد نسل انسانی کو برقرار رکھنا اور اس کو ترقی دینا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کا مقصد تخلیق پورا ہو سکے۔ جہاں تک جنسی لذت کا تعلق ہے تو دراصل یہ مقصد نہیں بلکہ حصولِ مقصد کا ایک لطیف ترین اور لذت بخش ذریعہ ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان خاص طور سے عورت کو اس سلسلہ میں کافی تکلیفیں اور

پریشانیاں برداشت کرنی پڑتی ہیں جو اسے تقریباً اس سے متنفر کردیتی ہے۔ قرآن مجید کی درج ذیل آیت میں اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

وَ وَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسٰنًا ۔ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا ۔ وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا

(الاحقاف: ١٥)

(ہم نے انسان کو ہدایت کی کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ نیک برتاؤ کرے اس کی ماں نے مشقت اٹھا کر اسے پیٹ میں رکھا اور مشقت اٹھا کر ہی اسے جنا اور اسکے حمل اور دودھ چھڑانے میں اسے تیس مہینے لگ گئے۔

انسان فطرتاً انانیت پسند واقع ہوا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ تکلیف برداشت کرنے سے گھبراتا ہے اب اگر اس فعل میں اس کے لئے لذت کی کشش نہ ہوتی تو اس کو ختم کرنے کے لئے اس کا پہلا ہی تجربہ کافی تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے اسی کام میں رغبت اور خواہش پیدا کردی جس کا تصور ہی ان کے جذبات و خیالات میں گرمی پیدا کردیتا ہے اور اس فعل کے کرنے کی خواہش اس کے دل میں تیز سے تیز تر ہو جاتی ہے۔ اب اگر ایسا نہ ہوتا نوع انسانی کی بقا بھی ختم ہو جاتی اسی لئے قرآن کریم نے واضح طور پر بتایا ہے کہ اس جنسی خواہش کی تکمیل کا مقصد حصول لذت قطعاً نہیں ہے بلکہ اس اصل مقصد نوع انسانی کی افزائش ہے۔ فرمایا:۔

فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ (البقرہ: ١٨٧)

(اب تم اپنی بیویوں کے ساتھ شب باشی کرو اور جو اللہ نے تمہارے لئے جائز کردیا ہے اسے حاصل کرو۔)

یہاں بعض علمائے تفسیر نے مَا كَتَبَ اللّٰهُ سے مراد افزائشِ نسل

لیا ہے۔[1]

اسلام میں شادی کی اہمیت

اب تک ہمارے استدلال کی بنیاد فطرت کائنات نیز انسانی معاشرہ پر تھی۔ اب آئیے دیکھیں کہ اسلام کی نگاہ میں شادی کی حیثیت کیا ہے اس سلسلہ میں جب ہم قرآن کی طرف نظر دوڑاتے ہیں تو وہ اسے خاندان اور معاشرہ کے تاسیس کی بنیاد قرار دیتا ہے اور اسے انسان کی جنسی فطرت کی تسکین کا سب سے بہتر اور اچھا ذریعہ بتاتا ہے وہ کہتا ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً

(الرعد : ۳۸)

(تم سے پہلے بھی ہم بہت سے رسول بھیج چکے ہیں اور ان کو ہم نے بیوی بچوں والا ہی بنایا تھا۔)

رسول اللہ صلعم کا ارشاد گرامی ہے کہ چار چیزیں انبیاء کی سنت رہی ہیں جس میں ایک نکاح بھی ہے[2] آپ نے اسے نصف دین بھی قرار دیا ہے۔ فرمایا "جب بندہ شادی کر لیتا ہے تو اس طرح گویا وہ اپنے دین کو مکمل کرتا ہے۔

قرآن مجید نے بھی نہایت جامع انداز میں اس پر روشنی ڈالی ہے۔

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ (النور: ۳۲)

(تم میں سے جو لوگ مجرد ہوں اور تمہارے لونڈی غلاموں میں سے جو صالح ہوں ان کے نکاح کر دو)

مشہور مفسر امام قرطبیؒ اس آیت کی تفسیر اس طرح کرتے ہیں کہ "جس کی شادی نہ ہوئی ہو اس

---

[1] حوالہ کے لئے تفسیر طبری، تفسیر قرطبی اور تفسیر بیضاوی ملاحظہ فرمائیں [2] مسند احمد، ترمذی

کی شادی کرادو کیوں کہ عفت کی حفاظت کا یہ پاکیزہ ترین ذریعہ ہے۔"

نوجوانوں سے اللہ کے رسول شادی کا مطالبہ کرتے ہوئے کہتے ہیں" نوجوانو! تم میں سے جو شادی کرسکتا ہو اسے شادی کرلینی چاہیئے اور جو اس کی استطاعت نہیں رکھتا ہو وہ کثرت سے روزے رکھے کیونکہ روزہ نفسانی خواہشات کو توڑنے کا بہترین ذریعہ ہے"[1]

اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کسی شخص کے اندر شہوانی خواہشات بہت ہوں اور اسے نکاح کرنے کی قدرت بھی ہو یعنی بیوی کے نان نفقہ کی ذمہ داری اٹھا سکتا ہو تو اسے شادی کرنے میں دیر نہیں کرنی چاہیئے لیکن جو بیوی کے نان و نفقہ کا بار اٹھانے سے قاصر ہو تو اس کے لئے ہدایت کی گئی کہ وہ روزہ رکھے کیونکہ اس سے شہوانی خواہشات کا توڑ کیا جاسکتا ہے اور عفت کی حفاظت ہوتی ہے۔

قرآن اور حدیث کی اسی روشنی میں امام ابن حزم اور سلف میں ایک جماعت کا یہ خیال ہے کہ استطاعت رکھنے والے شخص پر نکاح فرض ہے اس لئے اگر ایسا شخص اسے چھوڑتا ہے یا اس فریضہ سے پہلو تہی کرتا ہے تو اسے فرض کے تارک کا گناہ ملے گا۔ اور ایک فریق کا خیال یہ ہے کہ یہ فرض نہیں ہے البتہ واجب ہے۔

اسلام میں شادی کی جتنی اہمیت ہے ہم اس کا مطالعہ کرچکے۔ اب آیئے ذرا سینٹ پال کے خیالات کا تجزیہ کریں۔ وہ کہتا ہے

"میں چاہتا ہوں کہ دنیا میں تمام لوگ میری ہی طرح زندگی گذاریں"۔ (یعنی بغیر شادی کے) آگے کہتا ہے کہ" غیر شادی شدہ اور بیواؤں کے لئے ہمارا یہ مشورہ ہے کہ ان کے لئے بغیر شادی کے رہنا ہی مستحسن ہے"۔ اس کی وجہ وہ یہ بتاتا ہے کہ غیر شادی شدہ شخص ہمیشہ اپنے پروردگار کو راضی کرنے کی تدابیر کرے گا جب کہ شادی شدہ شخص کو ہمیشہ اپنی بیوی کی فکر دامن گیر رہے گی۔"

---

[1] متفق علیہ

اور یہی بات وہ شادی شدہ اور غیر شادی شدہ عورتوں کی بابت بھی کہتا ہے کہ شادی کے بعد وہ اپنے شوہر کو اولین حیثیت دیتی ہے اور خدا کی مرضی کو وہ ثانوی حیثیت دینے لگتی ہے۔ جب کہ اسے رضا رب کے حصول کو اولین اہمیت دینی چاہئے۔

سینٹ پال کے نزدیک۔ اگر مرد اپنی خواہشات پر کنٹرول نہیں رکھ سکتا تو وہ شادی تو کر سکتا ہے لیکن پھر بھی یہ بہتر طریقہ نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے۔

"کسی عورت کی خواہش کا خیال بھی اپنے دل میں مت لاؤ لیکن اگر تم شادی کر سکتے ہو چاہے کسی دوشیزہ ہی سے کیوں نہ ہو تو اگرچہ یہ کوئی غلط بات نہیں لیکن اس سے آدمی کا روحانی ارتقا رک جاتا ہے اور ان کی زندگی مکدر ہو جاتی ہے۔ اور مجھے تمہارے اوپر اسی کا اندیشہ ہے۔"

گویا سینٹ پال کے خیال میں شادی کی خواہش ہی نہیں کرنی چاہئے کیونکہ یہ اللہ کی یاد سے غافل کر دیتی ہے، ہاں اگر گناہ میں پڑ جانے کا اندیشہ ہو تو وہ اسکی اجازت دیتا ہے لیکن پھر بھی وہ اسے مستحسن فعل نہیں بتاتا۔

قانون نکاح کو توڑنے کے اثرات و نتائج

۱۔ استطاعت کے باوجود نکاح نہ کرنا گناہ ہے۔

گذری ہوئی آیات قرآنی اور احادیث نبوی کے مطالعہ سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسلام کے نزدیک شادی انسان کی فطری ضرورت ہے جس سے اسے جنسی سکون حاصل ہوتا ہے یہ ایک معاشرتی ضرورت بھی ہے کیونکہ اس سے شفقت و محبت اور ہمدردی و ایثار کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ یہ ایک سماجی ضرورت بھی ہے کیونکہ بقائے نوع کے لئے یہ ناگزیر ہے۔ یہ ایک انسانی ضرورت بھی ہے کیونکہ اسی پر عصمت کا تحفظ اور عفت کی پاکیزگی کا دارومدار ہے۔

اسی لئے شادی کی ضرورت سے انکار کا مطلب یہ ہوگا کہ انسان اس کے فوائد سے قطعی

طور پر محروم ہو جائے اور اپنی فطرت کا گلا گھونٹ دے[1]۔ اگر اس کے باوجود کوئی شخص بلا کسی عذر کے نکاح سے باز رہتا ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ ایک نادان اور جاہل شخص ہے جسے زندگی کے تقاضوں کا علم نہیں ہے۔ نبی کریمؐ زندگی کی اسی فطری ضرورت کو پوری کرنے کی تاکید ان لفظوں میں کرتے ہیں :-

"جو مالدار ہو اور شادی کی استطاعت رکھتے ہوئے بھی شادی نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے"[1]۔

۲۔ تجریدی زندگی اور اس کے مضر اثرات

قدیم معاشرے میں جنسی تعلقات رکھنے والے شخص کو روحانی طور پر نامکمل سمجھا جاتا تھا اور اس کے تعلق کو تقرب الی اللہ کے منافی سمجھا جاتا تھا اس لئے اس زمانے میں بڑے بڑے لوگ روحانیت کو مکمل کرنے کے لئے ترک دنیا کو ضروری سمجھتے تھے اور دنیا کی تمام خرافات سے کٹ کر وہ اللہ تعالیٰ کی جانب متوجہ ہو جاتے تھے چنانچہ ریاضت کرنے والا شخص شادی کی جھنجھٹوں میں پھنسنا کبھی پسند نہیں کرتا تھا کیونکہ ان کے خیال میں اس سے آدمی کے جذبات بھڑک جاتے ہیں اور وہ دنیا دار بن جاتا ہے۔ لیکن جب اسلام آیا تو اس نے اس خیال کو باطل اور غلط بتایا اور اسے صفائی قلب اور طہارتِ نفس کا ذریعہ بنا دیا چنانچہ رسول اکرمؐ کا ارشاد گرامی ہے۔

"جو شخص اللہ سے مکمل پاکی کی حالت میں ملنے کا خواہشمند ہے اس کو آزاد عورتوں سے شادی کرنی چاہئے"۔

ایک خاص بات جو یہاں قابل ذکر ہے وہ یہ کہ دین مسیحی اپنے آغاز میں ہرگز اس فکر کا علمبردار نہیں تھا لیکن ایک عرصہ گذر جانے کے بعد پتہ نہیں ان کے بزرگوں میں یہ خیال کہاں سے گھس آیا کہ نکاح تقرب الی اللہ کے منافی ہے چنانچہ انھوں نے اسے اپنے دل سے گڑھ کر دین میں داخل

---

[1] البیہقی

کر دیا۔ پھر ایک مدت تک تو اسے فرض بنانے میں متردد رہے اور ہر شخص کو نکاح کرنے یا نہ کرنے کی آزادی تھی لیکن چودھویں صدی ہجری کے آتے آتے ان کی ایک کمیٹی جس کا نام "الفیرا" تھا اس نے ہسپانیہ میں ایک قرارداد پاس کی جس میں دین مسیحی کے اکابرین کو شادی سے قانوناً روک دیا۔

پھر اس زمانہ میں راہبوں کی کثرت ہو گئی لوگ آ آ کر گرجا گھروں میں پناہ لینے لگے کچھ لوگ پہاڑوں کی چوٹیوں پر جا کر یادِ الٰہی میں مشغول ہو گئے اور اس کے ذریعہ وہ نفسانی خواہشات کو دبلتے تھے اور اللہ کا تقرب حاصل کرتے تھے۔ چنانچہ اسلام نے آکر ان تمام اوہام و خرافات کا پردہ چاک کیا اور تقرب الٰہی کے ان سب غیر فطری ذرائع کو بالکل ختم کر دیا اور صاف صاف لفظوں میں اس بات کا اعلان کیا کہ:

وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ (الحدید ۲۷)

(اور رہبانیت انھوں نے خود ایجاد کرلی ہم نے اسے ان پہ فرض نہیں کیا تھا)

نبی کریمؐ نے بھی واضح لفظوں میں فرمایا:

لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ اسلام میں قطعاً رہبانیت نہیں ہے

اور تمام مسلمانوں کو اس سے روک دیا، اس لئے کسی مسلمان کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اس سنت ثابتہ سے روگردانی کرے۔

اس کے برعکس نبی کریمؐ نے اپنی امت کو رہبانیت کی ایک دوسری قسم سے آشنا فرمایا:
میری امت کی رہبانیت ہجرت ہے۔ گناہوں اور برائیوں سے ہجرت، جہاد، روزہ، نماز حج اور عمرہ ہے۔ (بخاری مسلم)

نبی کریمؐ کی زندگی میں کچھ افراد آپ کی عبادتوں کا حال معلوم کرنے آئے لیکن جب انھیں آپ کی عبادتوں کے بارے میں بتایا گیا تو انھوں نے اسے کمتر سمجھا اور آپس میں کہنے لگے کہ آپ تو

نبی ہیں آپ کے تمام گناہ معاف ہو چکے ہیں ہمیں تو اپنی فکر کرنی چاہیے چنانچہ ان میں سے ایک نے کہا کہ میں تو رات بھر نمازیں پڑھا کروں گا دوسرے نے کہا اب میں مسلسل روزہ رکھوں گا تیسرے نے کہا کہ میں کبھی شادی نہیں کروں گا۔ جب نبی کریمؐ کو یہ اطلاع ملی تو آپ ان کے پاس تشریف لائے اور فرمایا کیا تم لوگوں نے ایسی باتیں کہی ہیں، سنو بخدا میں تم میں سب سے زیادہ اپنے رب سے ڈرنے والا اور سب سے زیادہ متقی ہوں لیکن میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور نہیں بھی رکھتا۔ راتوں کو نمازیں بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے شادیاں بھی کرتا ہوں اور یہی میری سنت ہے اور جو میری سنت سے اعراض کرے گا وہ مجھ سے نہیں۔

۳۔ لذت پرستی اور اس کے مضر نتائج

اب تک ہمارا مطالعہ ان لوگوں کے سلسلے میں تھا جو نکاح سے اس لئے گریز کرتے تھے کہ ان کے نزدیک یہ چیز صفائی قلب اور روحانیت حقیقی کے منافی تھی اب ہم اس گروہ کے حالات کا مطالعہ کریں گے جو نکاح کا اس لئے مخالف ہے کیونکہ شادی کرنے کے بعد اس کو تلذّذ پسندی اور عیاشی کے نئے نئے مواقع فراہم نہیں ہو سکے گے۔

تلذّذ پسندی اور عیاشی کا یہ تصور تہذیب جدید کا دین ہے اور اس فکر کا علمبردار ہے جدید یورپ جس نے اپنے نوجوانوں کے فکر و عمل اور طور طریق میں مکمل آزادی کا درس دیا ہے اور ان کی زندگی کا مقصد مال و جاہ اور عزت و شہرت کو قرار دیا روحانی ترقی بے معنی ہو گئی اور عصمت و عفت کا تصور پارہ پارہ ہو گیا ہر شخص کو مکمل آزادی حاصل ہو گئی اور اسے ہر وہ کام کرنے کی مکمل چھوٹ دیدی گئی جس سے ملک اور ملک کے باشندوں کو نقصان نہ پہنچے اور اس کھلی چھوٹ کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ پورے ملک میں شہوانیت اور جنسیت کا ایک سیلاب آگیا جس نے ان کے دل و دماغ پر اپنا قبضہ جما لیا یہاں تک کہ یہ سیلاب اپنی لپیٹ میں ان کے بڑے بڑے مفکرین اور دانشوروں کو بھی بہالے گیا چنانچہ

وہ خاندانی نظام کو فرسودہ سمجھ کر اس سے کنارہ کش ہو گئے اور بیسواؤں اور فاحشہ عورتوں سے اپنی جنسی پیاس بجھانے لگے اور جب وہ کسی پھول کا رس چوس کر پیٹ بھر لیتے تو اسے پیروں سے مسل کر نئے شوق اور نئے ولولوں کے ساتھ دوسرے پھول کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے۔

اور ان تمام چیزوں کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ان کا نظام خاندان تباہ و برباد ہو گیا افراد کی کمی ہو گئی اور جسمانی اور جانی لحاظ سے وہ بالکل ٹوٹ کر رہ گئے۔ اور یہ صورت حال آج بیسیوں برس سے یورپ میں موجود ہے اور موجود ہی نہیں بلکہ برابر ترقی کر رہی ہے اور سیلاب کی اس زد میں صرف اہل یورپ ہی نہیں بلکہ بہت سے دوسرے ممالک بھی آچکے ہیں ان کے مفکرین اور دانشور برابر خطرے کی گھنٹی بجا رہے ہیں وہ انھیں بتا رہے ہیں کہ خاندانی نظام کو بیخ و بن سے اکھاڑ دینے کے بعد کوئی چیز انھیں ان کے المناک انجام سے نہیں بچا سکتی۔ چنانچہ مارشل ڈیتان فرانس کا مشہور مفکر دوسری عالمی جنگ کے اختتام پر اپنی قوم کو پکار کر صاف صاف کہتا ہے۔

"اپنی غلطیوں کو اچھی طرح تول لو کیونکہ گناہ کا پلڑا بھاری ہو چکا ہے تم نے اخلاقی اور روحانی قدروں کو پامال کر دیا ہے تم بچوں کے طلب گار نہیں ہو اس لئے کہ تم نے خاندانی نظام زندگی کو پارہ پارہ کر دیا ہے تم لذات نفسانی کے پیچھے بگٹٹ بھاگے چلے جا رہے ہو' اب دیکھو یہ تمہاری نفسانیت تمہیں کس ہولناک انجام سے دوچار کراتی ہے۔"

اسلام نے پوری نوع انسانیت کو اس ہولناک انجام سے بچانے، انھیں مہذب اور متمدن بنانے، ان کو سچی انسانیت کی راہ دکھانے' اور انھیں روحانی اور اخلاقی قدروں سے مالامال کرنے کے لئے اس فساد کے منبع پر بند لگا دیا ہے اور شہوت پرست مردوں اور عورتوں کے لئے ایک ایسی سزا تجویز کی ہے جس کا تصور ہی ان کو دہلا دیتا ہے اور بعض حالات میں انھیں پھانسی کے تختہ پر بھی لٹکا دیتا ہے اور یہ سب کچھ اس نے اس لئے کیا ہے تاکہ سوسائٹی کو صاف ستھری اور باوقار رکھے اور ان شہوت پرستوں کے ہاتھوں

اس کو تباہ و برباد ہونے سے بچالے۔

ان تفصیلات سے بخوبی واضح ہو گیا ہوگا کہ اسلام کی یہ سزائیں صرف اس گناہ کی نہیں ہیں کہ دو افراد نے مل کر چند ساعتیں لطف و تفریح میں گذاری ہیں بلکہ وہ سوسائٹی کو ان مہلک اثرات سے بچانا چاہتا ہے جو اس کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہیں۔

۴۔ معاشی محرک اور اس کے مضر اثرات

مغربی تہذیب جس فکر کی علمبردار ہے۔ وہ اس کے اپنے لفظوں میں دراصل حریت فکر و عمل اور مادی آسائش ہے۔ یہی وہ دو چیزیں ہیں جنھیں وہ پوری نوع انسانی کا مقصد زندگی قرار دینا چاہتی ہے اور ان کے حصول کے لئے وہ ہر اس چیز کی قربانی دینے کے لئے تیار ہے جو اس راہ میں مزاحم ہو۔ اسی لئے یہ سرے سے کسی ایسے اخلاق کی قائل ہی نہیں جو اس کی راہ کا روڑا بنتا ہو وہ کسی ایسے ایمان کو نہیں مانتی جو مادیت سے ماوراء ہو۔ اسے کسی ایسی غیبی ذات پر بالکل یقین نہیں ہے جو اس کا پیٹ بھر سکتی ہو اور اسے روٹی مہیا کر سکتی ہو اور جو خوشحالی اور تنگ دستی اور نرمی و گرمی دونوں لانے پر قادر ہو وہ کسی ایسے خالق کو بالکل تسلیم نہیں کرتی جو اپنی مخلوق کو اس کے تصور سے بھی زیادہ رزق دینے پر قادر ہے وہ کسی ایسی ذات پر بھروسہ کرنے کے لئے بالکل تیار نہیں ہے جو مایوسیوں اور نا امیدیوں کی اتھاہ تاریکی میں بھی انسان کو سہارا دے سکتی ہے۔ وہ کسی ایسی روحانی قوت کی بالکل قائل نہیں ہے جو روزانہ دنیا کے تمام جانداروں کی خوراک مہیا کرتی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ تصور ستم قاتل ہے کیونکہ یہ تمام تر باطل ہی باطل ہے اور یہی چیز ہے جو انھیں ہر وقت مادی بدحالی کا خوف دلائے رہتی ہے اب کیا اس بنیاد پر کوئی رشتۂ نکاح استوار کیا جا سکتا ہے یا اس کے بارے میں سوچا بھی جا سکتا ہے؟

یہ دراصل ایک نفسیاتی مرض ہے جو اس فکر کے حامل کو صرف شادی ہی سے نہیں روکتی اس کی انسانیت کو بھی مسخ کر دیتی ہے اور اسے زندگی گزارنے کے سلیقہ سے محروم کر دیتی ہے۔ یہ وہ ناقابل تردید حقیقت ہے جس پر زمانہ کی تاریخ گواہ ہے۔ آج تک کوئی صالح تمدن ان بنیادوں پر نہیں اٹھ سکا ہے۔

اس مرض کا علمی اور عملی ہر پہلو سے صرف ایک ہی علاج ہے اور وہ ہے ایمان باللہ۔ کیونکہ یہ عقیدہ تمام اوہام وخرافات کا پردہ چاک کر دیتا ہے۔ وہ مال کے بارے میں یہ تصور دیتا ہے کہ یہ تو ڈھلتی چھاؤں ہے جو ایک مقررہ قانون کے مطابق ہر شخص کے پاس پہونچتا ہے اور ہر کسی کو اتنا ہی ملتا ہے جتنا اس کے رب نے اس کے لئے مقرر کر دیا ہے۔ چنانچہ خالق کائنات اس سلسلہ میں اپنے بندوں کو یہ تصور دیتا ہے کہ:

تِلْكَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیْنَ النَّاسِ ۚ (آل عمران ۱۴۰)

(یہ تو زمانہ کے نشیب وفراز ہیں جنھیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں)

اس لئے یہ بات واضح ہے کہ دراصل ایمان ہی وہ نور ہے جس سے امید کی کرنیں پھوٹتی ہیں یہاں اوہام وخرافات کا گذر نہیں ہوتا چنانچہ اس سلسلہ میں قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیت ملاحظہ فرمایئے دیکھئے وہ کس حکمت کے ساتھ اپنے پیرودں کے دلوں سے مال کی طلب کو ختم کرتا ہے اور ان کے عزائم کو مضبوط اور پائیدار بناتا ہے۔

وَاَنْكِحُوا الْاَیَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِیْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآىِٕكُمْ ؕ اِنْ یَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ یُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ

(النور: ۳۲)

(تم میں سے جو لوگ مجرد ہوں اور تمہارے لونڈی غلاموں میں سے جو صالح ہوں ان کے نکاح کر دو

اگر وہ غریب ہوں تو اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے گا اللہ بڑی وسعت والا اور علیم ہے۔

مشہور مفسر ابن کثیرؒ اپنی تفسیر میں اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "جس کی شادی نہ ہوئی ہو اس کی شادی تم کرا دو اور اس سلسلہ میں فقر و تنگدستی کی بنا پر تاخیر کرنا ٹھیک نہیں ہے کیونکہ ساری توقعات اللہ سے وابستہ کرنی چاہئیں اور وہ خود وسعت و فراخی کا وعدہ فرما رہا ہے۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

ظاہر ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے اور تمام مسلمان اس کے وعدہ پر اس طرح یقین رکھتے ہیں جسے پورا ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ جو مسلمانوں کے سب سے پہلے خلیفہ گذرے ہیں وہ فرمایا کرتے تھے کہ "تمہیں اللہ نے شادی کرنے کا جو حکم دیا ہے تم اسے پورا کرو اللہ تم سے اپنا کیا ہوا وعدہ پورا فرمائے گا۔" اسی طرح حضرت عمر فاروقؓ بھی جو حضرت ابوبکرؓ کے بعد خلیفہ ہوئے فرماتے ہیں "مجھے سخت تعجب ہے کہ لوگ شادی کر کے مالدار کیوں نہیں ہو جاتے جب کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ

اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ

اگر وہ غریب ہوں گے تو اللہ انھیں اپنے فضل سے غنی کر دے گا

ان تفصیلات کے بعد ہم نکاح نہ کرنے کے مضر پہلوؤں کی دوبارہ نشاندہی کرنا غیر ضروری سمجھتے ہیں لیکن صحیح بات یہ ہے کہ نکاح کے بغیر کوئی معاشرہ گمراہی اور بے راہ روی سے پاک نہیں ہو سکتا صرف یہی ایک ایسی صورت ہے جسے اپنا کر کوئی سوسائٹی صالح، پاک اور ہر لحاظ سے مکمل بن سکتی ہے پھر ان تمام خوبیوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ ایسے افراد سے خوشحالی اور تونگری کا بھی وعدہ کرتا ہے جب کہ دوسری صورت اختیار کر کے سوسائٹی جہاں اخلاقی اور روحانی طور پر تباہ ہو جاتی ہے وہیں اس کے اندر فقر اور محتاجی بھی آجاتی ہے کیونکہ اول الذکر ایک ایمانی معاشرہ ہوتا ہے اور آخر الذکر شیطانی معاشرہ اور ان دونوں کا موازنہ وحی ربانی اس طرح کرتی ہے:

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ

مَغْفِرَةً مِّنْهُ وَ فَضْلًا ۚ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿ (البقرہ: ۲۶۸)

شیطان تمہیں مفلسی سے ڈراتا ہے اور شرمناک طرزِ عمل اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے مگر اللہ تمہیں اپنی بخشش اور فضل کی امید دلاتا ہے اللہ بڑا فراخ دست اور دانا ہے۔

نکاح کا انتخاب

۱۔ بیوی کا انتخاب

جب کوئی شخص اس بات کو اچھی طرح جان لیتا ہے کہ قانون زوجیت ایک اٹل قانون ہے اور اس کی فطرت خود اسی کی متقاضی ہے تو گویا وہ مسئلہ کی حقیقت کو جان لیتا ہے اور اسے وہ سرا ہاتھ آجاتا ہے جو اسے دنیا و آخرت دونوں جگہ کامیاب و سرخرو کرتا ہے۔

قانون زوجیت کا حقیقی مقصد دراصل بقائے نوع، جنسی سکون اور معاشرہ میں ہمدردی و محبت اور ایثار و قربانی کے جذبات کو فروغ دینا ہے اس لئے ظاہر ہے کہ ایک بہترین بیوی دراصل وہی ہو سکتی ہے جو مقاصد زوجیت کی تکمیل بہتر طریقہ سے کر سکتی ہو اور جو صورت و سیرت ہر لحاظ سے بہتر اور مکمل ہو۔ اسلئے ایک عقلمند شخص کو ایسی بیوی پسند کرنی چاہیئے جس کا ظاہر و باطن یکساں ہو، بہترین اخلاق سے آراستہ ہو اور جو باحیا، باعفت اور نیک خو ہو۔

۲۔ معیار دولت

اس کے باوجود بعض لوگ جو زندگی کی حقیقی قدروں سے ناآشنا ہوتے ہیں اور جن کی نگاہ میں مال و دولت ہی اصل مقصود زندگی ہے وہ شادی کا معیار دولت کو بناتے ہیں۔ اور صرف شادی

کے ان بیخالات کو ترجیح دیتے ہیں جہاں سے کچھ ملنے کی توقع ہے ظاہر ہے کہ یہ چیز مقصد زوجیت کی تکمیل نہیں کر سکتی اور اس سے وہ چیز بالکل حاصل نہیں ہو سکتی جو نکاح کا مقصد ہے اسی لئے نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ

"تم عورتوں سے ان کے مال کی بناپر شادی نہ کرو کیوں کہ اس سے ان کے باغی ہو جانے کا اندیشہ ہے۔" (ابن ماجہ، بیہقی، بزاز)

۳۔ معیار حسب ونسب

بعض لوگ شادی کا معیار لڑکی کے حسب ونسب اور معاشرہ میں اس کے خاندان کی عزت کو بناتے ہیں اور صرف اسی لڑکی سے شادی کرنا پسند کرتے ہیں جو ان کے اس معیار پر پوری اترے۔ لیکن ان کا معیار دراصل انکی خرابیٔ نیت کا نتیجہ ہے کیوں کہ انھیں شاید یہ نہیں معلوم کہ یہ دنیاوی شرف ومنزلت بس چند روزہ ہے۔ اسی لئے نبی کریمؐ ارشاد فرماتے ہیں

من تزوج امراۃ لحسبہا لم یزدہ اللہ الا دناءۃ (متفق علیہ)

جو شخص کسی عورت سے اس کی حسب ونسب کی بنا پر شادی کرتا ہے، اللہ اس کو اور پست کر دیتا ہے

۴۔ معیار حُسن

اور بعض لوگ اپنی فطرتِ حیوانی کی بنا پر صرف حسن کو معیار بناتے ہیں اور اسی عورت سے شادی کرنا پسند کرتے ہیں جو حسین وجمیل ہو لیکن یہ دراصل اس بات کا نتیجہ ہے کہ ان کی نگاہوں سے حقیقی حسن کا مفہوم اوجھل ہو چکا ہے۔ کیوں کہ عورت فی الواقع ایک انسان ہے اور انسان کی انسانیت ہی دراصل اس کا حسن ہے اگر وہ صحیح معنوں میں ایک انسان ہے تو وہ حسین بھی ہے اسی لئے نبی کریمؐ نے ایک سائل کے جواب میں

ارشاد فرمایا ہے:

"اظفر بذات الدین تربت یداک (متفق علیہ)

دین دار خاتون سے شادی کرو، تیرا بھلا ہو

ایک اور شخص نے آکر نبی کریمؐ سے دریافت کیا کہ میں ایک ایسی عورت کو پسند کرتا ہوں جو نہایت حسین و جمیل ہے اونچے خاندان کی ہے لیکن وہ بانجھ ہے کیا میں اس سے شادی کر لوں؟ آپ نے اسے منع فرمایا دوسری مرتبہ وہ شخص پھر آیا اور یہی سوال دہرایا آپؐ نے پھر اسے منع کر دیا لیکن جب وہ تیسری مرتبہ آیا تو آپ نے اسے مشورہ دیا کہ "محبوب اور زیادہ بچے جننے والی عورت سے شادی کرو تاکہ میں تم پر قیامت کے دن فخر کرسکوں"۔ (ابو داؤد، نسائی)

یہاں علماء نے محبوب سے مراد ایسی عورت لی ہے جو اعلیٰ اخلاق و کردار کی حامل ہو جس سے اس کا شوہر محبت کرے۔

۵۔ شوہر کا انتخاب

ایک اچھے شوہر کے لئے بھی معیار ترجیح صرف اس کے اخلاق و صفات ہیں اس لئے کسی شخص کے پیغام نکاح پر غور کرنے کے لئے ایک عورت کو اس کے اخلاق اور جذبۂ دین ہی کو معیار بنانا چاہئے۔ رہا مرد کا حسن و جمال، تونگری اور مالداری اور حسب و نسب تو ان چیزوں کو معیار بنانا دراصل ذہنیت کی پستی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ صرف اس کا انسان ہونا ہی کافی ہے اور اس کی انسانیت ہی عورت کے لئے کفو ہے اسی لئے اسلام کے نزدیک ایک انسان کے لئے شرف و مرتبہ اور قدر و منزلت کا معیار صرف اس کی انسانیت ہے۔ وہ کہتا ہے:

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ

تم میں سب سے زیادہ عزت والا اللہ کی نظر میں وہ ہے جو سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہو۔

اسی لئے اگر کوئی شخص بہترین اخلاق و کردار کا حامل، نیک خو، متدین اور شریف ہے تو وہ چاہے

جس خاندان سے ہو چاہے جس رنگ کا ہو اور چاہے جس نسل سے اس کا تعلق ہو وہ اعلیٰ سے اعلیٰ خاندان کی لڑکی سے شادی کرسکتا ہے، نبی اکرمؐ نے اسی حقیقت کی طرف اس حدیث میں اشارہ فرمایا ہے:

إذا جاءکم من ترضون دینه وخلقه فزوجوه الا تفعلوا تکن فتنة فی الارض وفساد کبیر (ترمذی)

جب تمہارے پاس کسی ایسے شخص کا پیغام نکاح آئے جو متدین ہو اور با اخلاق ہو تو اس سے شادی کرلو اگر ایسا نہیں کرو گے تو زمین میں فتنہ و فساد پھیل جائے گا۔

۶۔ شوہر کے انتخاب میں عورت کا حق

عورت، خواہ کنواری ہو یا شوہر آشنا اس کو ان تمام رشتوں کے سلسلہ میں جو اس کے لئے آئے ہوں اقرار یا انکار کی پوری آزادی حاصل ہے۔ اس کے باپ یا ولی کو اس کی مرضی کے خلاف شادی کرنے کا قطعاً حق حاصل نہیں ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لا تزوج الایم حتی تستأمر ولا البکر حتی تستاذن (بخاری و مسلم)

شوہر آشنا عورت کی شادی بغیر اس کی اجازت حاصل کئے نہیں کی جائے گی۔

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے، وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کنواری کی شادی بغیر اس کی اجازت حاصل کئے نہیں کی جائے گی۔ اس پر حضرت عائشہؓ کہتی ہیں میں نے دریافت کیا کہ کنواری لڑکی تو شرماتی ہے وہ کیسے اجازت دے گی آپؐ نے جواب دیا کہ اس کی خاموشی ہی اجازت ہے۔

(بخاری، ابوداؤد، ترمذی)

مطلب یہ ہے کہ اگر لڑکی سے اجازت لی گئی اور وہ اس پر خاموش رہ گئی کسی قسم کا کوئی اظہار نہیں کیا تو گویا اس نے اجازت دے دی لیکن اگر شوہر آشنا کی شادی بغیر اس کے مشورہ سے کی گئی (جس میں

اس کا بولنا ضروری ہے) تو نکاح فسخ ہو جائے گا لیکن اگر کنواری لڑکی سے اجازت نہیں لی گئی تو نکاح کے بعد اسے اختیار ہوگا چاہے تو نکاح فسخ کردے یا اسے برقرار رکھے۔

شادی شدہ عورت کے سلسلہ میں اس کی دلیل حضرت خنساء بنت خدامؓ کا واقعہ ہے کہ جب ان کے باپ نے ان کی دوسری شادی کی تو انھوں نے اسے ناپسند کیا چنانچہ نبی کریمؐ نے اس نکاح کو کالعدم کردیا۔

اور کنواری لڑکی کے سلسلہ میں دلیل یہ واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریمؐ کے پاس ایک کنواری دوشیزہ آئی اور آکر کہا کہ اس کے باپ نے اس کی شادی ایسی جگہ کردی ہے جو اسے ناپسند ہے اس پر نبی کریمؐ نے اسے اختیار دیا کہ چاہے تو شادی کو باقی رکھے یا اسے ختم کردے۔ (احمد، ابوداؤد، ترمذی)

اسی طرح کی ایک اور لڑکی کا ذکر ہے اس نے نبی کریمؐ کے پاس آکر عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ میرے باپ نے میری شادی میری مرضی کے بغیر اپنے بھتیجے سے کردی ہے چنانچہ نبی کریمؐ نے اسے اختیار دیا کہ چاہو تو اسے برقرار رکھو اور چاہو تو فسخ کردو۔ اس پر اس نے کہا کہ میں اپنے باپ کے اس فعل کو برقرار رکھتی ہوں لیکن یہ سوال میں نے اس غرض سے کیا تھا تاکہ عورتوں کو بتادوں کہ ان کے معاملے میں سرپرستوں کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ (بخاری، مسلم، ترمذی، ابن ماجہ، نسائی)

اور شاید عورتوں کی تاریخ کا یہ پہلا واقعہ ہے جب اس کو اس قدر عزت اور آزادی نصیب ہوئی اور اسے یہ حق ملا کہ وہ اپنے سلسلہ میں آئے ہوئے رشتوں کو چاہے تو قبول کرے اور چاہے تو رد کرے ورنہ اس سے پہلے اس کی حیثیت ایک بکاؤ مال کی تھی جسے جو چاہتا خرید سکتا تھا۔

پیغام نکاح

۱۔ باقاعدہ نکاح سے پہلے پیغام نکاح بھجوانا شرعاً مسنون ہے اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں

کو پہلے سے ایک دوسرے کے خیالات جاننے کا موقع ملتا ہے اور نکاح کے بعد دونوں کے درمیان محبت کی فضا قائم رہتی ہے۔ اس کے برخلاف اگر پیغام نکاح بھجوائے بغیر شادی ہو جاتی ہے تو اس کے انجام کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا۔

صحیحین کی روایت ہے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے ایک عورت کو نکاح کا پیغام بھجوایا تو نبی کریمؐ نے ان سے کہا کہ مغیرہ اسے دیکھ لو کیوں کہ یہ چیز تم دونوں کے درمیان محبت قائم کر دے گی۔

اس حدیث میں دیکھنے کی کوئی حد متعین نہیں کی گئی ہے اس لئے اس کے اطلاق کو برقرار رکھتے ہوئے اس کو اس حد تک وسعت دی جائے گی جہاں تک اسلام اجازت دیتا ہے۔

عام حالات میں کسی مرد کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ اجنبی عورت کی ہتھیلی اور چہرہ کے علاوہ بھی جسم کا کوئی حصہ دیکھے اور اس کی اجازت بھی اس لئے دی گئی ہے کہ زندگی کی ضروریات کی تکمیل کے لئے ان اعضاء کا استعمال ناگزیر ہے اور اگر اس کی اجازت نہ دی گئی ہو تو یہ بڑی دشواریوں کا سبب بنتا۔ لیکن یہ صورتِ حال مستثنیٰ ہے چنانچہ نبی کریمؐ کا ارشاد ہے:

جب تم میں سے کوئی کسی عورت کو نکاح کا پیغام بھجوائے تو اسے دیکھ لینے میں اس کے لئے کوئی حرج نہیں ہے بشرطیکہ وہ اسے اسی مقصد سے دیکھے چاہے اس عورت کو اس کا علم ہو یا نہ ہو۔" (احمد)

ایک دوسرے موقع پر آپ نے فرمایا:

"جب تم میں سے کوئی شخص کسی عورت کو شادی کا پیغام دے اور اسے دیکھنا چاہے تو دیکھ سکتا ہے۔"

واضح رہے کہ یہاں بھی اسلام نے وہ آزادی نہیں دی ہے جو موجودہ زمانے میں عام ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ شادی کا پیغام دینے والا اس کو ان کپڑوں میں دیکھ سکتا ہے جسے پہن کر وہ اپنے باپ اور بھائیوں کے سامنے جاتی ہے۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر گذری ہوئی حدیث کی روشنی میں اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ شوہر اس کے ساتھ، جب کہ کوئی محرم اس کے ساتھ ہو، مشہور مقامات کی تفریح کے لئے بھی جا سکتا

ہے تاکہ وہ اس کے ذریعہ اس کے ذوق اور فطرت کا اندازہ لگا سکے اور اس کی شخصیت کی اندرونی جھلک دیکھ سکے۔

متذکرہ بالا حدیث کے مفہوم سے یہ بات خود بخود واضح ہوتی ہے کیوں کہ جب اس میں عورت کے جسم کے حصوں کو دیکھنے کی اجازت دی گئی ہے تو اس کے اخلاق و عادات کی پرکھ تو بدرجہ اولیٰ جائز ہوگی کیوں کہ یہی دراصل وہ معیار ہے جسے پرکھنا ضروری ہے اور حدیث نبوی کے الفاظ میں اگر کہا جائے تو دراصل یہی وہ چیز ہے جو زوجین کے درمیان محبت و یگانگت قائم رکھ سکتی ہے۔

اس مخصوص صورت حال میں شریعت اسلامی کا عورت کو دیکھنے کی مطلق اجازت دے دینا واقعتہً وہ امتیازی شان ہے جس کی مثال نہیں پیش کی جاسکتی کیوں کہ اس کے ذریعہ ہر دور کے افراد کو اس بات کی آزادی ملتی ہے کہ وہ کہ اپنے مصالح اور طریقہ کار کی روشنی میں خود اس کو طے کریں۔

عام حالات میں مرد و زن کے جس اختلاط کو جو شریعت انتہائی ناپسند کرتی ہو وہی اس مخصوص حالت میں جب اس کی مطلق اجازت دیتی ہے تو بے ساختہ ہمیں اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہی نظام توسط و اعتدال کا ہے جو ہر افراط و تفریط سے پاک ہے۔ لیکن مسلمانوں کی موجودہ حالت پر جب ہم نظر دوڑاتے ہیں تو ہمیں انتہائی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ سنت نبویؐ کے ساتھ کھلا مذاق کر رہے ہیں اور وہ بھی افراط و تفریط کا شکار ہو گئے ہیں چنانچہ ایک گروہ تو پیغام نکاح دینے والے کو سوائے عورت کے دیکھنے کے اور کوئی حق نہیں دیتا اور دوسرا گروہ وہ ہے جو بلا کسی قید و شرط دونوں کو کھلے عام گھومنے کی آزادی دیتا ہے اس کا جو انجام ہو رہا ہے اس کے تذکرے ہی سے شرم آتی ہے۔

ایک عقلمند اور بابصیرت شخص جب ان تمام امور پر غور سے نگاہ ڈالتا ہے تو بے ساختہ اسے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ صحیح طریقہ وہی ہے جسے اسلام نے پسند کیا کیوں کہ وہ اس پر بالکل مطمئن ہو جاتا ہے کہ دینی، اخلاقی، عقلی ہر لحاظ سے وہی طریقہ درست ہے جسے اسلام نے نوع انسانی کے لئے پسند

فرمایا ہے۔

۲۔ کسی مسلمان کے لئے اپنے بھائی کے پیغام پر اپنا پیغام بھجوانا جائز نہیں ہے۔

کسی مسلمان کیلئے یہ درست نہیں ہے کہ وہ جانتے بوجھتے اپنا پیغام نکاح اس عورت کے پاس بھیجے جس کے پاس کوئی دوسرا شخص اس سے پہلے بھیج چکا ہو۔ کیوں کہ اس سے آپسی تعلقات خراب ہوتے ہیں اور رشک و رقابت کے جذبات پروان چڑھتے ہیں علاوہ ازیں یہ چیز اس کی ذہنیت اور عقل کی پستی پر بھی غمازی کرتی ہے۔ اسی لئے نبی کریمؐ نے اس کی ممانعت فرمائی ہے کہ "کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے پیغام پر پیغام نہ بھجوائے حتیٰ کہ وہ اسے چھوڑ دے یا اسے اس کی اجازت دے دے۔"

مندرجہ بالا حدیث اس طرح کے پیغام نکاح کو صراحتاً حرام ٹھہراتی ہے اسی لئے بعض مالکی علماء کا یہ فتویٰ ہے کہ "اگر دوسرے شخص نے اس عورت سے شادی کر لی تو اس کا نکاح فسخ ہو جائے گا۔" اور یہ بات صحیح بھی معلوم ہوتی ہے کیوں کہ یہ وہ فعل ہے جو اسلام کی روح اور مقصد کے بالکل خلاف ہے۔

مہر

مہر کی مقدار

شریعت کے ہر قانون میں سہولت اور نرمی کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ سختی اور تنگی اسلامی اسپرٹ کی ضد ہے۔ قانون نکاح بھی اسلام کا ایک جزو ہے بلکہ یہ دراصل ایک فرض ہے جس کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ کی جانب سے پوری عالم انسانیت پر ڈالی گئی ہے۔ اس لئے اس کو روبہ عمل لانے میں کسی طرح کی کوئی رکاوٹ پیدا کرنا خواہ مال کے ذریعہ یا کسی اور چیز کے ذریعہ بالکل غلط اور روح اسلام کی عین ضد ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ

(اللہ نے دین میں تمہارے لئے کوئی تنگی نہیں رکھی ہے)

اسی لئے دین کے تمام معاملات میں اللہ تعالیٰ نے اعتدال کو پسند فرمایا ہے چنانچہ شادی کے تمام معاملات میں خواہ وہ مہر ہو یا کچھ اور اسلام کے اسی اصول کو بنیاد بنایا جائے گا۔ نبی کریمؐ کا ارشاد ہے:

"سب سے بابرکت شادی وہ ہے جس میں کم سے کم خرچ کیا گیا ہو۔"

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا:

"سب سے بہتر مہر وہ ہے جو ادا کرنے والے کے لئے آسان ہو۔"

ویسے علماء نے مہر کی کوئی حد متعین نہیں کی ہے البتہ حدیث کی روشنی میں وہ اس مہر کو زیادہ بہتر کہتے ہیں جس کی ادائیگی میں زحمت نہ ہو۔ حدیث یہ ہے:

"اگر کوئی شخص کسی عورت کو اس کی مہر کے بدلہ میں ایک مٹھی بھر گیہوں دیتا ہے تو وہ اس کے لئے حلال ہے۔"

حضرت عمرؓ کا ارشاد ہے کہ: "شادی میں مہر کی مقدار بہت زیادہ نہ رکھو کیوں کہ اگر زیادہ رکھنے میں دنیادی یا اخروی کوئی بھلائی ہوتی تو اللہ کے رسول ایسا ضرور کرتے۔" (ابوداؤد، ابن ماجہ، نسائی، ترمذی)

مہر میں تخفیف کا اعتبار آدمی کو دیکھ کر کیا جائے گا کیوں کہ ایک چیز جس کا دینا ایک آدمی کے لئے آسان ہو وہی چیز دوسرے آدمی کے لئے مشکل ہو جاتی ہے اس لئے کہ دونوں کی معاشی پوزیشن یکساں نہیں ہوتی۔ اسی لئے نبی کریمؐ نے جب اُمّ المومنین حضرت ام حبیبہؓ سے نکاح کیا تو نجاشی نے آپ کی عزت کو بڑھانے کے لئے اپنی طرف سے چار ہزار درہم یا دو سو دینار بطور مہر دیئے اور آپؐ نے اس وقت اس رقم کو زیادہ نہیں سمجھا تھا اس لئے کہ بادشاہوں کے معیار کے لحاظ سے یہ کم تھی۔ لیکن جب ایک غریب شخص نے آکر آپؐ سے بتایا کہ میں نے ایک عورت سے ایک سو ساٹھ (۱۶۰) درہم کے مہر پر نکاح

کرلیا ہے تو آپ نے اسے اس کے لئے بہت زیادہ خیال کیا اور اس سے کہا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم پہاڑ سے چاندی تراشتے ہو۔

جہاں تک مہر کی ادائیگی میں آدمی کی حیثیت کا تعلق ہے تو اس کی دلیل آنحضرت صلعم کی یہ حدیث ہے کہ ایک شخص سے آپ نے کہا کہ مہر ادا کرو خواہ لوہے کی ایک انگوٹھی ہی کیوں نہ ہو لیکن جب اس نے لوٹ کر آپ کو یہ بتایا کہ اس کے پاس لوہے کی انگوٹھی بھی نہیں ہے تو آپ نے اس سے سوال کیا کیا تمہیں قرآن کی کچھ سورتیں یاد ہیں اس نے سورتوں کا نام لے کر بتایا کہ فلاں فلاں سورتیں ہیں یاد ہیں اس پر آپ نے ارشاد فرمایا کہ جاؤ ہم نے تمہاری شادی اس سے اس شرط پر کردی کہ تم اس کو وہ تمام سورتیں یاد کرادو جو تمہیں یاد ہیں اور بعض حدیثوں میں ہے کہ اس شرط پر شادی کی کہ تم اسے قرآن کی کوئی سورت یاد کرادوگے۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ حضرت ابو طلحہ رضؓ اور حضرت ام سلیم رضؓ کا بھی ہے جسے ابو نعیم نے اپنی کتاب ''الحلیۃ'' میں نقل کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ابو طلحہ رضؓ نے ام سلیم رضؓ کو شادی کا پیغام بھجوایا لیکن ابھی وہ اسلام نہیں لائے تھے حضرت ام سلیم رضؓ نے انھیں جواب دیا کہ آپ کا رشتہ تو واقعی لوٹائے جانے کے قابل نہیں ہے لیکن آپ تو کافر ہیں اور میں مسلمان ہوں میرے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ میں آپ سے شادی کروں۔

انھوں نے کہا رمیصا یہ کون سی مصیبت تم نے مول لے لی ہے؟

ام سلیم رضؓ نے جواب دیا مجھے کیا مصیبت ہے؟

حضرت ابو طلحہ نے کہا تمہیں کس قدر سونا اور چاندی درکار ہے انھوں نے کہا سونا چاندی کی کوئی ضرورت نہیں اصل مسئلہ یہ ہے کہ آپ ایسی چیز کو پوجتے ہیں جو نہ سن سکتی ہے نہ دیکھ سکتی ہے اور نہ ہی آپ کو نفع و نقصان پہونچا سکتی ہے کیا آپ کو اس لکڑی کی پوجا کرتے ہوئے شرم نہیں آتی جسے آپ کا حبشی غلام کھینچ کر آپ کے پاس لاتا ہے اس لئے میں آپ سے شادی نہیں کرسکتی۔ ہاں اگر آپ اسلام لے آئیں تو یہی ہماری مہر ہے اس کے علاوہ مجھے اور کچھ نہیں چاہئے۔

حضرت ابوطلحہ نے پوچھا میں اسلام کیسے لاؤں؟ انھوں نے جواب دیا اس کے لئے آپ نبیؐ کے پاس جایئے۔

چنانچہ ابوطلحہ نبیؐ کو ڈھونڈھتے ہوئے نکلے جب نبی کریمؐ نے انھیں آتے ہوئے دیکھا تو آپ نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے ساتھیوں سے کہا کہ ابوطلحہ آ رہا ہے اور میں اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان ایمان کی چمک دیکھ رہا ہوں۔ اس طرح حضرت ابوطلحہ نے وہاں پہونچ کر اسلام قبول کر لیا اور نبی کریمؐ سے وہ تمام باتیں بتائیں جو ان دونوں کے درمیان ہوئی تھیں۔ چنانچہ نبی کریمؐ نے ان دونوں کی شادی اسی شرط پر کرا دی۔

یہ حدیث اپنے معنی و مفہوم کے لحاظ سے بالکل واضح ہے اور ہر طرح کی تشریح سے بے نیاز ہے۔

مہر عورت کا حق ہے

مہر عورت کا وہ حق ہے جس پر تصرف کا تمام حق اسلام نے صرف عورت کو دیا ہے۔ قرآن کہتا ہے:

وَآتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً ۚ (النساء: ۴)

(اور عورتوں کے مہر خوشدلی کے ساتھ (فرض جانتے ہوئے) ادا کرو)۔

نحلۃ کا لفظی مفہوم عطیہ اور ہدیہ کا ہے اسی لئے امام قرطبی اسی آیت سے استنباط کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "یہ دراصل اللہ تعالیٰ کی جانب سے عورت کے لئے ایک عطیہ ہے"۔

اسلام نے تو اسے صرف عورت کا حق قرار دیا ہے جب کہ زمانہ جاہلیت میں مہر کی تمام رقم صرف عورت کے سرپرستوں کو ملتی تھی رہیں عورتیں تو انہیں اس میں سے ایک حبہ بھی نہ ملتا تھا لیکن اسلام نے آکر جہاں عورتوں کو اور بھی بہت سے حقوق عطا کئے وہیں اسے یہ حق بھی دلایا اور صاف صاف یہ بتا دیا کہ یہ فی الحقیقت عورتوں کا حق ہے سرپرستوں کا اس میں کوئی حق نہیں ہے۔

اس پر کامل تصرف کا حق صرف عورت کو ہے اور اگر کوئی دوسرا اس میں تصرف کرتا ہے تو وہ خائن ہے۔

یہاں اس کا تذکرہ بھی شاید دلچسپی سے خالی نہ ہو کہ مغرب اپنی تمام تر ترقیوں کے باوجود ابھی اپنی عورتوں کو یہ حق نہیں دلا سکا ہے اور وہاں بھی آجکل وہی ہو رہا ہے جو یونان و روم کی قدیم تہذیبوں میں ہوتا تھا۔ وہاں قاعدہ یہ ہے کہ لڑکی جہیز کے نام پر شادی کے وقت ایک بھاری رقم اپنے گھر سے لے جاتی ہے جس پر تصرف کا حق صرف شوہر کو ہوتا ہے اس طرح گویا وہ اپنے مہر کا بدلہ اپنے شوہر کو دیتی ہے، اور یہ چیز اس تہذیب میں اس قدر نفوذ کر گئی ہے کہ اس کے بغیر کسی شادی کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔

جہیز

ہم گذشتہ صفحات میں بتا چکے ہیں کہ مہر عورت کا وہ حق ہے جس کی ادائیگی شرعاً شوہر پر فرض ہے اور اس کے بدلے میں شوہر کسی جہیز کے مطالبہ کا قطعاً کوئی حق نہیں رکھتا ہاں اگر وہ بخوشی کوئی چیز لائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے قرآن مجید کی اس آیت میں اسی کی طرف اشارہ ہے

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ۚ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓــًٔا مَّرِیْٓــًٔا (النساء: ۴)

(اور عورتوں کے مہر خوش دلی کے ساتھ (فرض جانتے ہوئے) ادا کرو البتہ اگر وہ خود اپنی خوشی سے مہر کا کوئی حصہ تمہیں معاف کر دیں تو اسے تم مزے سے کھا سکتے ہو)

آج کل لڑکے والوں کی جانب سے، کپڑے، برتن اور دوسرے سامانوں کا جو مطالبہ ہوتا ہے اسلامی نقطۂ نظر سے یہ حرام ہے۔

بعض جگہوں پر تو یہاں تک دیکھا جاتا ہے کہ لڑکے والوں کی جانب سے مطالبات اتنے شدید ہوتے ہیں کہ مہر سے دسیوں گنا زیادہ رقم دے کر اس کی تکمیل ہو پاتی ہے جس کے نتیجے میں لڑکی کا باپ قرضوں

سے لد جاتا ہے چنانچہ اس طرح کے مال میں کبھی برکت نہیں ہوتی کیونکہ دینے والا اسے خوشی سے کبھی نہیں دیتا ہے۔

خود ہمارے ملک میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ لڑکی اپنے مہر کے رقم کی جہیز لے جاتی ہے بلکہ کبھی کبھی تو اس سے زیادہ کا بھی جہیز لے جاتی ہے اس میں اگرچہ کوئی قباحت نہیں مگر فضول خرچی سے احتراز کرنا چاہئے کیونکہ اس سے نمائش پسندی اور تکبر کے جذبات پرورش پاتے ہیں:

اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ وَکَانَ الشَّیْطَانُ لِرَبِّہٖ کَفُوْرًا

(فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہوتے ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے)

اس لئے بہترین جہیز وہی ہے جس میں حیثیت سے زیادہ نہ خرچ کیا گیا ہو کیوں کہ اس سے اللہ اور رسول کی خوشی حاصل ہوتی ہے اور ریا، ونمود کا بھی اندیشہ نہیں رہتا۔

شادی کی تقریبات

۱۔ ولیمہ

شادی کا دن، بہرحال ایک خوشی کا دن ہوتا ہے جس میں گاؤں، خاندان پاس پڑوس کے لوگ اور دوسرے اعزا، واقربا، اکٹھا ہوتے ہیں اس خوشی کے موقع پر ہر شخص کو اپنی استطاعت کے مطابق انھیں کھلانے پر مدعو کرنا چاہئے چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ جب حضرت علیؓ سے حضرت فاطمہؓ کی شادی طے ہو گئی تو نبی کریمؐ نے کہا کہ "شادی میں ولیمہ کی دعوت تو بہر حال ہونی چاہئے۔

آپ کے اس قول سے بعض فقہاء نے یہ استدلال کیا ہے کہ شادی میں ولیمہ کی دعوت فرض ہے لیکن دوسرے فقہاء کے نزدیک یہ صرف مستحب ہے۔

اسی طرح جب آپؐ نے زینب بنت جحشؓ سے شادی کی تو ایک بکری ذبح کر کے ولیمہ کی

دعوت کھلائی اور جب حضرت صفیہؓ کی رخصتی عمل میں آئی تو آپ نے لوگوں کو دعوت میں کھجور، پنیر اور گھی کھلایا۔ اور اپنی بعض دوسری بیویوں سے نکاح کے وقت آپ نے گیہوں کی روٹی سے لوگوں کی ضیافت فرمائی۔ اور خود حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے آپ نے کہا کہ "ولیمہ کی دعوت کرو خواہ ایک بکری ہی کیوں نہ ہو۔"

ان نصوص کی بنا پر علماء نے ولیمہ کی دعوت کو آدمی کی استطاعت پر موقوف کر دیا ہے اور اسے اختیار دیا ہے کہ وہ جو کچھ بھی کھلا سکتا ہو لوگوں کو کھلائے فقہ کی مشہور کتاب نیل الاوطار میں ہے کہ "مالدار کے اوپر دعوت ولیمہ کی سب سے کم حد ایک بکری ہے اور اگر اس بات کا ثبوت موجود نہ ہوتا کہ خود آپ نے اس سے کم دعوت کی ہے تو ایک بکری کی دعوت ہر شخص پر علی الاطلاق فرض ہوتی۔ آگے قاضی عیاض کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ زیادہ سے زیادہ ولیمہ کی کوئی حد متعین نہیں ہے اور کم سے کم آدمی کی استطاعت پر چھوڑ دیا گیا ہے۔[۱]

دعوتِ ولیمہ میں اپنے جان پہچان کے ہر شخص کو خواہ وہ مالدار ہو یا غریب مدعو کرنا چاہیے۔ جان بوجھ کر صرف مالداروں کو مدعو کرنا اور غریبوں کو نظر انداز کر دینا نہایت معیوب بات ہے اس سے ایک طرف تو آدمی کے ذہن کی پستی کا پتہ چلتا ہے دوسری طرف اللہ اور اس کے رسولؐ کی ناراضگی بھی مول لیتا ہے کیوں کہ نبی کریمؐ کا ارشاد ہے:

"بدترین دعوتِ ولیمہ وہ ہے جس میں صرف مالداروں کو مدعو کیا گیا ہو اور غریبوں کو چھوڑ دیا گیا ہو"
(بخاری و مسلم)

دعوت کا قبول کرنا سنت ہے کیونکہ نبیؐ کا ارشاد ہے کہ "جب تم میں سے کسی کو دعوت ولیمہ دی

---

[۱] نیل الاوطار ص ۱۷۶، ۶

جائے تو اسے قبول کرلینا چاہیے"۔ ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا کہ "اگر کوئی شخص اس دعوت کو قبول نہیں کرتا تو وہ اللہ اور رسول کی نافرمانی کرتا ہے"۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک مرتبہ ایک شخص کو دعوت طعام دی۔ اس شخص نے معذرت چاہی لیکن آپ نے معذرت قبول کرنے سے صاف انکار کردیا اور فرمایا "کیسی معذرت، چلو اٹھو.....!"

پھر جب کسی کو مدعو کیا جائے اور وہ پہونچ جائے تو اسے چاہیے کہ صبر وشکر کے ساتھ کھانا تناول کرے اور اگر روزے سے ہو تو میزبان کو بتادے اور اس کے حق میں دعائے خیر کرے کیوں کہ حدیث میں ہے کہ "جب تم میں سے کسی کو دعوت دی جائے تو اسے قبول کرلینا چاہیے۔ پھر اگر وہ روزہ سے ہو تو اسے معذرت کرنی چاہیے اور اس کے حق میں دعائے خیر کرنی چاہیے لیکن اگر روزہ سے نہیں ہے تو صبر وشکر کے ساتھ کھانا تناول کرلے"۔ (احمد، مسلم، ابوداؤد)

لیکن اگر اسے دعوت میں کوئی ایسی چیز نظر آئے جو اللہ کی ناراضگی کا باعث ہو تو اسے آہستہ سے لوٹ آنا چاہیے۔ امام ابن حزمؒ کہتے ہیں کہ اگر وہاں ریشم کا فرش بچھا ہو یا وہ گھر غبن کا ہو یا کھانا غصب شدہ ہو یا وہاں شراب کی موجودگی کے آثار پائے جاتے ہوں تو اسے وہاں سے لوٹ آنا چاہیے۔

حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے نبیؐ کی کھانے پر دعوت فرمائی لیکن جب آپ وہاں پہونچے تو آپ نے ان کے گھر میں تصویریں آویزاں دیکھیں چنانچہ آپ لوٹ آئے۔ (ابن ماجہ)

ایک اور جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"جو شخص اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہے اسے ایسے دسترخوان پر ہرگز نہیں بیٹھنا چاہیے جس پر شراب کا دور چل رہا ہو"۔

۲۔ شادی کی تفریحات

شادی میں گیت اور نغموں کے ساتھ دف بجانا بھی سنت ہے۔ ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ نے ایک

انصاری صحابی سے اپنی ایک سہیلی کی شادی کرنی چاہی تو اللہ کے رسولؐ نے فرمایا "عائشہ تم لوگوں کے پاس کوئی تفریح کا سامان نہیں ہے؟ انصار تو تفریح پسند کرتے ہیں"۔

گیت اور نغموں کے ساتھ دف بجانے کے سلسلہ میں رسول اللہ کا ایک اور قول ملاحظہ ہو آپ نے فرمایا کہ "شادی کے موقعہ پر گیت اور نغموں کے ساتھ دف بجانے میں کوئی قباحت نہیں ہے"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسی شادی کو ناپسند فرماتے تھے جو بالکل خاموشی سے ہو۔ اس کا کوئی اعلان نہ کیا جائے مسند احمد میں ہے کہ نبی کریمؐ خاموشی کے نکاح کو ناپسند فرماتے تھے جب تک کہ اس میں دف نہ بجایا جائے اور یہ نہ گایا جائے کہ

اتیناکم اتیناکم فحیونا نحییکم

(ہم تمہارے پاس آئے ہم تمہارے پاس آئے۔ پس تم ہمیں مرحبا کہو ہم تمہیں مرحبا کہیں گے)

اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شادی کی محفل میں دف بجانے کو مسنون قرار دیا اور ایسی شادی کو ناپسند فرمایا جس میں کسی قسم کا کوئی تفریح کا سامان موجود نہ ہو۔ اسی پر قیاس کرتے ہوئے آج کل بھی شادی میں ایسے گیت گانا جو اخلاقی پہلو سے معیوب نہ ہوں بالکل درست ہیں لیکن ایسے گانے جو بازاری ہوں اور جذبات کو برانگیختہ کرتے اور سننے والے کو غلط حرکات پر آمادہ کرنے والے ہوں ان کی اجازت اسلام میں قطعاً نہیں ہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ گانے والا مرد ہو یا عورت کوئی نوجوان ہو یا دوشیزہ اس کی دلیل حضرت عائشہؓ کا واقعہ ہے کہ جب انھوں نے اپنی ایک سہیلی کو نکاح کے بعد شوہر کے ہاں بھیج دیا تو اللہ کے رسولؐ نے پوچھا:

عائشہ کیا تم لوگوں نے لڑکی کو رخصت کر دیا؟

انھوں نے جواب دیا ہاں! اے اللہ کے رسولؐ۔

آپ نے پوچھا کیا تم نے اس کے ساتھ گانے والیاں نہیں بھیجیں؟

انھوں نے کہا نہیں۔

آپؐ نے کہا ارے بھائی انصار تو گیتوں کے رسیا ہیں تم نے کوئی گانے والی لڑکی کیوں نہیں بھیجی؟

انھوں نے پوچھا لیکن اے اللہ کے رسولؐ وہ کیا گائیں؟

آپؐ نے کہا گانا اس طرح کا ہو

اتیناکم اتیناکم فحیونا نحییکم

ولولا الحبۃ السمراء لم نحلل بوادیکم

(ہم تمہارے پاس آئے، ہم تمہارے پاس آئے، پس تم ہمیں خوش آمدید کہو ہم تمہیں خوش آمدید کہیں گے اگر یہ گندمی غلے نہ ہوتے تو ہم تمہاری وادی میں نہ آتے۔)

شادی کے موقع پر اس طرح کی اجازت کا مقصد دراصل یہ ہے کہ یہ تقریب ہنسی خوشی انجام پائے اور ہر شخص ہشاش بشاش رہے کیونکہ یہ دراصل ایک خوشی کا موقع ہوتا ہے۔

حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس رخصت سے فائدہ اٹھایا چنانچہ شادی کی محفلوں میں اس طرح کی تفریحات میں بذات خود حصہ لیا کرتے تھے اور اس میں وہ کوئی قباحت بھی نہیں سمجھتے تھے مشہور صحابی عامر بن سعدؓ کہتے ہیں کہ میں ایک شادی میں شرکت کے لئے گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ قرظہ بن کعبؓ اور ابو مسعود انصاریؓ وہاں پہلے سے موجود ہیں اور کچھ لڑکیاں وہاں دف بجا بجا کر گا رہی ہیں میں نے پوچھا کہ اے صحابیانِ رسولؐ یہ آپ کے سامنے کیا کیا جا رہا ہے۔ انھوں نے کہا اگر بیٹھنا چاہو تو بیٹھو اور اگر جانا چاہو تو جاؤ کیوں کہ رسول اللہ نے اس کے سماع پر کوئی پابندی نہیں لگائی ہے۔

اس طرح کی تقریبات میں جہاں دف کے بجانے میں کوئی حرج نہیں ہے میں سمجھتا ہوں کہ دوسرے آلات موسیقی کا استعمال بھی اسی پر قیاس کرتے ہوئے جائز ہونا چاہئیے — اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر میں اس طرح کے کھیل کود اور ڈراموں کو بھی جائز سمجھتا ہوں جیسا کہ حبشی کیا کرتے تھے صرف ایسی چیزیں

حرام ہیں جو شہوت کو ابھارنے والی اور غارت گر اخلاق ہوں کیوں کہ اس طرح کے کھیل کود کو خوشیوں کے مواقع پر رسول اللہ نے خود بھی دیکھا ہے اور اس کے اہتمام کا مشورہ بھی دیا ہے اور اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ اسلام اپنے ماننے والوں کو زندگی کی لذتوں اور مسرتوں سے محروم نہیں رکھتا بلکہ وہ اس سے بہرہ اندوز ہونے کے مواقع فراہم کرتا ہے تاکہ ان کی زندگیوں میں صرف جمود ہی جمود نہ رہ جائے بلکہ ذوق جمال اور ذوق عبادت دونوں ہم آہنگ و یک رنگ ہو جائیں اور اس طرح کہ وہ ان سے غلط فائدہ نہ اٹھائے بلکہ اس سے وہ اپنی ذات کو باعفت اور باعصمت بنائے۔

بیوی کے حقوق

۱۔ نفقہ

عورت خواہ مالدار ہو یا غریب اس کے خرچ کا ذمہ دار اسلام نے شوہر کو قرار دیا ہے الا آنکہ وہ خود برضا و رغبت اپنے مال میں سے کچھ دینا پسند کرے، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ البتہ شوہر کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس کے کھانے پینے اور رہنے سہنے کے لئے اپنی حیثیت کے مطابق انتظام کرے اس سلسلہ میں حضور اکرمؐ کا ارشاد ملاحظہ ہو:۔

ولہن علیکم رزقہن وکسوتہن بالمعروف

(ان کے کھانے اور پہننے کا انتظام شوہروں کے ذمہ ہے۔)

اس مقام پر حدیث شریف میں گرچہ رہائش گاہ، بستر اور دوسری چیزوں کا تذکرہ نہیں ہے مگر دراصل یہ وہ چیزیں ہیں جو بدیہیات میں آتی ہیں اور ان کے تذکرہ کی کوئی حاجت باقی نہیں رہ جاتی۔ لیکن قرآن مجید میں اس کا بھی تذکرہ موجود ہے وہ کہتا ہے:۔

اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِنْ وُّجْدِكُمْ وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ (طلاق: ۷)

(ان کو اس جگہ رکھو جہاں تم رہتے ہو جیسی کچھ بھی جگہ تمہیں میسر ہو اور انھیں تنگ کرنے کے لئے ان کو نہ ستاؤ)

جب اسلام نے رہائش کے مسئلہ کو حل کر دیا ہے تو اس سے آپ یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کے لئے رہائش کی جملہ سہولیات بھی مہیا کی جائیں گی۔

اب آگے ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عورت کے نان و نفقہ کا معیار کیا ہوگا؟ اس کا جواب اسلام یہ دیتا ہے کہ اس معاملے میں شوہر کے معیار کو پیش نظر رکھا جائے گا اگر امیر ہے تو نفقہ بھی اسی حساب سے دے گا اور اگر غریب ہے تو بھی اس کی گنجائش کو مد نظر رکھا جائے۔ کیونکہ

لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ۚ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ۚ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَآ اٰتٰىهَا ۚ سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا (طلاق: ۷)

(خوش حال آدمی اپنی خوش حالی کے مطابق نفقہ دے اور جس کو رزق کم دیا گیا ہو وہ اسی مال میں سے خرچ کرے جو اللہ نے اسے دیا ہے اللہ نے جس کو جتنا کچھ دیا ہے اس سے زیادہ کا وہ اسے مکلف نہیں کرتا بعید نہیں کہ اللہ تنگ دستی کے بعد فراخ دستی بھی عطا فرما دے)

حدیث نبویؐ کا بھی یہی تقاضہ ہے۔

ولھن علیکم رزقھن وکسوتھن بالمعروف

(دستور کے مطابق تمہاری بیویوں کا کھانے اور کپڑے کا انتظام تمہارے اوپر فرض ہے)

اس طرح مثلاً اگر کوئی مالدار شخص ہے جو اپنی بیوی کو ریشم پہنانے کی استطاعت رکھتا

ہے تو اس کی بیوی کا اس کے اوپر یہ حق ہے کہ وہ اسے ریشم پہنائے۔ امام زہری سے عورتوں کے ریشم پہننے کی بابت دریافت کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ مجھے انسؓ نے بتایا ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلعم کی صاحبزادی کو ریشم کی چادر اوڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔

حافظ ابن حجر نے الاصابہ میں اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔

۲۔ حُسنِ معاشرت

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَإِن كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا۔

(ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں ناپسند ہو مگر اللہ نے اس میں کچھ بھلائی رکھدی ہو۔)

دوسری جگہ اللہ فرماتا ہے:

وَلَا تُضَارُّوهُنَّ لِتُضَيِّقُوا عَلَيْهِنَّ (الطلاق: ۶)

(اور انھیں تنگ کرنے کے لئے ان کو نہ ستاؤ)

ان آیات کے ذریعہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو یہ بتا رہا ہے کہ بیویوں کو تنگ اور بلاوجہ پریشان کرنا ٹھیک نہیں ہے اس لئے اگر کوئی شخص صحیح معنوں میں اپنے مسلم و موحد ہونے کا اقرار کرتا ہے تو اس کے لئے خدا کی مقرر کردہ اس حد سے آگے بڑھنا جائز نہیں ہے اگر ان تنبیہات کے باوجود کوئی ان احکام کی خلاف ورزی کرتا ہے تو صریح طور پر وہ اس کی مقرر کردہ حد سے تجاوز کرتا ہے۔

مسند احمد اور ترمذی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اسی مفہوم کی حدیثیں مروی ہیں

آپؐ نے فرمایا:

خیارکم خیارکم لنساءھم

(تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنی بیویوں کے لئے بہتر ہو)

دوسری حدیث میں آپؐ نے ارشاد فرمایا:

خیرکم خیرکم لاھلہٖ وانا خیرکم لاھلی (ترمذی)

(تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے اہل وعیال کے حق میں بہتر ہو اور میں تم میں سب زیادہ اپنے اہل وعیال کے حق میں بہتر ہوں۔)

اس کے باوجود ہمیں افسوس کے ساتھ یہ عرض کرنا پڑتا ہے کہ بعض جاہل قسم کے لوگ عورتوں پر سختی کرنے میں اپنی مردانگی سمجھتے ہیں اور ان کے معاملے میں شفقت ومحبت کو مردانگی کی توہین سمجھتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بہت غلط طرزِ فکر ہے جو اس کی شخصیت کے کھوکھلے پن کی نشاندہی کرتا ہے کیونکہ اس سے ایک طرف تو اس کے لئے دلوں میں نفرت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں تو دوسری طرف اس کی خانگی زندگی تباہ وبرباد ہو جاتی ہے۔ اس لئے عورت کی شخصیت کا احترام کرنا اور اسے خوش رکھنے کی کوشش کرنا ہی دراصل مرد کا امتیازی وصف ہے اس سے جہاں اس کی عقلی برتری کا پتہ چلتا ہے، وہیں یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ یہ شخص زندگی گذارنے کے طریقوں سے واقف ہے۔ بلاوجہ کی سختی سے اس کے علاوہ اور کوئی فائدہ نہیں ہوتا کہ بار بار کی ڈانٹ پھٹکار سے حِس مردہ ہو جاتی ہے اور خانگی زندگی تلخ ہو کر رہ جاتی ہے۔

حسنِ معاشرت کے ضمن میں ایک بات یہ بھی آتی ہے کہ بلاوجہ بیوی کے تجسس میں نہ رہا جائے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بعض حد سے زیادہ غیرت مند شوہر اپنی بیویوں کے معاملے میں بدگمانی کا شکار رہتے ہیں اور ان کی حرکات وسکنات اور باتوں کو غلط معانی پہنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ نہایت خطرناک چیز ہے جو ان کی مسرتوں کو چھین لیتی ہے اور ہمہ آن وہ اس ٹوہ میں پڑے رہتے ہیں کہ ان کے گھر میں ان کے پیچھے کون کون آتا ہے اور وہاں کیا کرتا ہے۔ یہ تمام چیزیں دراصل شیطانی وسوسے ہیں جن سے تعلقات کی زنجیر ٹوٹ جاتی ہے اور آپسی رشتے خراب ہو جاتے ہیں اسی لئے نبی کریمؐ نے اسے ایک قبیح فعل قرار دیا ہے اور اس سے روکا ہے۔

"حضرت جابرؓ سے مروی ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم میں کا کوئی شخص اپنی بیوی کے پاس رات کو اس غرض سے نہ آئے کہ وہ اس کی نگرانی کر رہا ہو یا اس کی غلطیوں کی کھوج میں پھر رہا ہو۔ (مسلم)

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ شوہر کو اپنی بیوی کے پاس اچانک آنے سے احتراز کرنا چاہیئے کیوں کہ اس سے اس کی پوشیدہ خامیوں کے کھل جانے کا اندیشہ رہتا ہے جب کہ اسلام اس معاملہ میں حسنِ ظن اور ان کے اوپر اعتماد کرنے کا قائل ہے۔

امام ابن حزمؒ کہتے ہیں کہ عورت کے معاملہ میں حسن ظن کی اس قدر تاکید اسلام کا وہ امتیازی وصف ہے جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔

حسن معاشرت کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ عورت کو ایسے مواقع فراہم کئے جائیں کہ وہ خوش و خرم رہ سکے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں رسول اللہؐ کے پاس بیٹھ کر گڑیوں سے کھیلا کرتی تھی۔

یہاں صراحتاً اس بات کا تذکرہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں آپ گڑیوں سے کھیلتی تھیں اور آپ انھیں اس سے منع نہیں کرتے تھے دوسری روایتوں میں تو یہاں تک آتا ہے کہ میں رسول اللہ صلعم کے یہاں گڑیوں سے کھیلا کرتی تھی میرے ساتھ میری سہیلیاں بھی ہوتیں جو میرے ساتھ کھیلا کرتی تھیں جب آپؐ تشریف لاتے تو وہ چھپ جاتیں آپ ان کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر میرے پاس بھیجتے تاکہ وہ میرے ساتھ کھیل سکیں۔ (متفق علیہ)

ان حدیثوں کی روشنی میں ہر شخص بآسانی یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرت اپنی بیویوں کے ساتھ کس قدر بے تکلف تھی اور انھیں خوش رکھنے کے لئے آپ کس طرح مواقع فراہم کرتے تھے ۔ اس لئے نبی کے امتی ہونے کی حیثیت سے ہماری بھی یہ ذمہ داری ہے کہ ہم بھی اپنی بیویوں کے ساتھ معاشرت میں نرمی برتیں اور ان کے ذوق کا لحاظ کرتے ہوئے ان کے لئے تفریح کے مواقع فراہم کریں ۔

شوہر کے حقوق

اسلام نے شوہر کو بھی چند نہایت اہم حقوق عطا کئے ہیں ۔ ذیل میں ہم بعض اہم حقوق کا ذکر کرتے ہیں ۔

۱۔ شوہر کی اطاعت

تمام معروفات میں شوہر کی اطاعت کرے اور اگر شوہر اسے ہم بستری کے لئے بلائے تو فوراً اس کے پاس جائے ورنہ وہ اللہ اور رسول دونوں کی نافرمان ہوگی ۔

حضور اکرمؐ کا ارشاد گرامی ہے :

" جب شوہر اپنی بیوی کو ہم بستری کے لئے بلائے اور وہ آنے سے انکار کردے اور شوہر خفا ہو کر رات گذارے تو فرشتے صبح تک ایسی عورت پر لعنت بھیجتے ہیں ۔ " (متفق علیہ)

مرد کے اسی حق کی حفاظت کے لئے اسلام نے عورت کو شوہر کی موجودگی میں بغیر اس کی اجازت کے نفل روزہ رکھنے کی ممانعت فرمائی ہے اللہ کے رسول کا ارشاد ہے :

لاتصوم المرأۃ و زوجہا شاھد یوماً من غیر رمضان الا باذنہ

کوئی عورت اپنے شوہر کی موجودگی میں بغیر اس کی اجازت حاصل کئے ہوئے (نفل) روزہ نہ رکھے

(رواہ الخمسہ الا النسائی)

۲ ۔ شوہر کی عدم موجودگی میں خود اپنی اور اس کے مال کی حفاظت کرے۔ مال کی حفاظت کا مطلب یہ ہے کہ شوہر نے اس کے پاس جو امانتیں رکھی ہیں وہ اس کی پوری حفاظت کرے اور اس میں کسی قسم کی خیانت نہ ہونے دے۔ اور عورت کے اوپر شوہر کا یہ وہ حق ہے جس کے فرض ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں ہے اللہ کے رسولؐ نیک بیوی کی صفات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ان زوجہا اذا غاب عنہا نصحتہ فی نفسہا و مالہ (ابن ماجہ)

اپنے شوہر کی عدم موجودگی میں وہ اپنے اور اس کے مال کے سلسلے میں مخلص ہو۔

یہاں اس بات کا تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ اسلام بیوی کو شوہر کے مال میں سے بلا اجازت صدقہ کرنے کا اختیار دیتا ہے جب کہ شوہر کو بیوی کے مال میں اس طرح کا کوئی بھی اختیار نہیں ہے۔ البتہ اس معاملہ میں اسلام بیوی کو اس بات کا پابند کرتا ہے کہ یہ "تصرف" اس حد تک نہ ہو جس پر "تصرف بیجا" کا اطلاق کیا جا سکے یا اس سے شوہر کا استحصال ہو رہا ہو اس سلسلہ میں سرکار دو عالمؐ کا ارشاد ملاحظہ ہو:

اذا انفقت المرأۃ من بیت زوجہا غیر مفسدۃ لہ کان لہا اجرہا ولہ مثلہ بما کسب (رواہ الجماعۃ)

اگر بیوی اپنے شوہر کے مال میں سے اتنا صدقہ کرے جو شوہر کے لئے تکلیف کا باعث نہ ہو تو عورت کو اس کا ثواب ملے گا اور شوہر کو بھی اتنا ہی ثواب ملے گا کیونکہ یہ مال اسی نے کمایا تھا۔

بیوی کے اپنے نفس کی حفاظت کا مطلب دراصل وہی ہے جس کا تذکرہ رسول اللہ نے

حجۃ الوداع کے موقع پر کر دیا تھا۔ فرمایا:

ان لکم علی نساءکم حقا.... ولنسائکم علیکم حقا.... فاما حقکم علی نسآئکم فلا یوطئن فرشکم من تکرھون ولا یاذن فی بیوتکم لمن تکرھون۔ (ابن ماجہ، ترمذی)

تمہارا تمہاری بیویوں پر حق ہے۔ اور تمہاری بیویوں کا حق تم پر ہے... تمہارا ان کے اوپر یہ حق ہے کہ وہ تمہارے ہاں کسی ایسے شخص کو نہ آنے دیں جس کو تم ناپسند کرتے ہو۔)

کیوں کہ شوہر سے محبت کا یہ تقاضہ ہے کہ وہ انھیں سے محبت کرے جن سے اس کا شوہر محبت کرتا ہے اور کسی ایسے شخص کو گھر میں آنے کی اجازت نہ دے جس کی آمد کو اس کا شوہر ناپسند کرتا ہو۔ البتہ وہ شخص جسے اس کا شوہر ناپسند نہ کرتا ہو اسے آنے کی اجازت دینے میں کوئی حرج نہیں ہے مثلاً اس کے بعض بے تکلف دوست، مہمان اور بھائی ہوتے ہیں جن کا آنا جانا لگا رہتا ہے تو ایسے لوگوں کو آنے دینے میں کوئی حرج نہیں۔

یہاں اس بات کی بھی وضاحت ضروری ہے کہ دوسروں کو آنے کی اجازت دینے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے لئے پردہ سے دری، چٹائی، کرسی یا گاؤ تکیہ وغیرہ بھیج دے، رہا ان کے ساتھ تنہائی میں اٹھنا بیٹھنا تو شرعاً یہ ممنوع ہے خواہ شوہر اس کی اجازت ہی کیوں نہ دے دے۔

ازدواجی زندگی میں تعاون کی بنیادیں

تمہید

وَمِنْ اٰیٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَیْهَا

وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۚ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ

(الروم : ۲۱)

(اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں۔)

زمانۂ قدیم میں عورت کو ایک ناپاک جنس سمجھا جاتا تھا جو روح سے خالی ہو۔ اسے بیوی کی حیثیت بالکل حاصل نہیں تھی۔ لیکن جب انھوں نے اس کے ساتھ انصاف کرنا چاہا تو فرانس کے اجلاس منعقدہ ۵۸۶ء میں یہ بل پاس کیا کہ عورت حیوان نہیں، ایک انسان ہے جو مرد کی خدمت کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ یہ تھی عورت کی حیثیت۔ اس طرز فکر کو جب ہم ذہن میں رکھ کر اسلام کے احکامات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام نے عورت کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا ہے۔ کیوں کہ وہ اسے اللہ کی نشانی قرار دیتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ عورت کی تخلیق مرد سے ہوئی ہے اس لئے دونوں یکساں اہمیت کے حامل ہیں۔ اور اس نے اس کی تخلیق بیوی کی حیثیت سے کی ہے ایک خادمہ کی حیثیت سے نہیں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا (الروم : ۲۱)

(اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے خود تم ہی میں سے بیویاں بنائیں)

اور اس تخلیق کا مقصد وہ یہ بتاتا ہے کہ تم اس سے سکون حاصل کرو اور یہ سکون دراصل انسانی فطرت کا وہ مخفی جذبہ ہے جو انسانی معاشرہ کو نیک اور پاکیزہ بناتا ہے اور دونوں کے درمیان بے تکلف معاشرت پیدا کرتا ہے۔

یہ وہ روحانی ضرورت ہے جسے ایک مرد صرف ایک عورت ہی سے حاصل کر سکتا ہے۔

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے دونوں کے اندر ایک دوسرے کے لئے شفقت و محبت کے جذبات پیدا کر دیئے ہیں۔ فرماتا ہے: وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً۔

ان تفصیلات سے یہ بات بخوبی واضح ہوگئی ہے کہ اسلام کے نزدیک عورت دوسرے مذاہب کی طرح کوئی سانپ نہیں ہے جس کے شر سے بچا جائے اور نہ ہی مرد کے ہلاکت کا ذریعہ ہے۔ اس کے برخلاف وہ اسے مرد کے لئے باعث سکون خیال کرتا ہے اور اسے وہ چشمۂ صافی بتاتا ہے جس سے لطف و کرم اور رحمت و محبت کے سوتے پھوٹتے ہیں۔

انسان کی اس فطرت کا لحاظ کرتے ہوئے اسلام نے مرد اور عورت کے تعلقات کو شرعی حیثیت دی ہے اور ان دونوں کو زندگی کی دشوار گذار راہوں میں آپسی تعاون کا حکم دیا ہے۔ یہاں ہم ان کے آپسی تعاون کی ان بنیادوں کی نشاندہی کریں گے جس کا جاننا ہر ایسے مسلمان کے لئے ضروری ہے جو اپنے اہل و عیال اور خاندان و قبیلہ کی تربیت اسلامی بنیادوں پر کرنا چاہتا ہو۔

اس سلسلہ میں بنیادی اصول قرآن کی یہ آیت کریمہ ہے:

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ۔ (البقرہ: ۲۲۸)

(عورتوں کے لئے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے حقوق ان پر ہیں البتہ مردوں کو ان پر ایک درجہ حاصل ہے اور سب پر اللہ غالب اقتدار رکھنے والا اور حکیم و دانا موجود ہے۔)

اس آیتِ کریمہ سے درج ذیل اصول مستنبط ہوتے ہیں:

۱۔ عدل۔ پہلی بات جو اس آیت کریمہ سے ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کی نظر میں مرد و عورت دونوں یکساں اہمیت کے حامل ہیں اس طرح یہ دونوں گویا کارگہ حیات میں ایک دوسرے کے شریک کار ہیں جو ایک دوسرے کے حقوق و فرائض کی ادائیگی کے ذمہ دار بنائے

گئے ہیں۔ نہ تو مرد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ عورت کی حق تلفی کرے اور نہ عورت کے لئے یہ مناسب ہے کہ وہ مرد کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرے ورنہ وہ دونوں ظالم، غاصب اور خائن ٹھہریں گے۔

۲۔ مساوات ۔ دوسری بات یہ واضح ہوتی ہے کہ دونوں حقوق و فرائض کی تقسیم میں برابر ہیں جو دونوں کی فطرت سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔

واضح رہے کہ یہاں مساوات کا مطلب معنوی مساوات ہے ظاہری نہیں کیونکہ زندگی کی دوڑ میں ایک دوسرے کا دائرہ کار الگ الگ ہے اور ہر ایک کو وہی ذمہ داریاں سونپی گئی ہیں جو اس کی فطرت سے متصادم نہ ہوں۔

اسی معنیٰ کی ایک حدیث حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں اپنی بیوی کے سامنے ویسے ہی ٹیپ ٹاپ سے رہتا ہوں جیسا کہ میں اسے اپنے لئے آراستہ رہنا پسند کرتا ہوں پھر آپ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی۔

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ (البقرہ: ۲۸)

(عورت پر جیسے فرائض ہیں ویسے ہی اس کے حقوق بھی ہیں۔)

آیتِ کریمہ کا یہ نہایت لطیف نکتہ ہے جسکی طرف ہمارے بعض اسلاف بھی گئے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ مرد کی زیب و زینت عورت کی زیب و زینت سے الگ چیز ہے لیکن مقصد و نتیجہ کے اعتبار سے دونوں کی یہ آرائش یکساں ہے کیونکہ دونوں ایک دوسرے کو آراستہ و پیراستہ دیکھنا پسند کرتے ہیں اور اس سے انھیں دلی خوشی حاصل ہوتی ہے۔

۳۔ باہمی مشورہ ۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں نہ تو مردوں کے سارے حقوق کا ذکر کیا ہے اور نہ ہی عورتوں کے حقوق کا۔ اس کے برخلاف اس میں صرف چند ہی حقوق کا تذکرہ ہے اور بقیہ کو چھوڑ دیا گیا ہے تاکہ حالاتِ زمانہ کے لحاظ سے وہ خود اسے مرتب کرلیں۔ چنانچہ

ارشاد فرمایا "وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ"

یہاں معروف کی قید لگا کر اللہ تعالیٰ یہ بتانا چاہتا ہے کہ اس سے وہ تمام حقوق مراد ہیں جو عرف عام میں جانے اور سمجھے جاتے ہوں اور جن سے روزمرہ کے معمولات میں واسطہ پڑتا ہو البتہ ان تمام معاملات میں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہوگا کہ دینی آداب و معاملات مجروح نہ ہونے پائیں۔ شریعت کی نظر میں دونوں اپنے آپسی معاملات کو حل کرنے کے لئے بالکل آزاد ہیں اور وہ ان کی آزادی میں اس وقت تک مخل نہیں ہوتی جب تک کسی معاملہ میں جبر و اکراہ سے کام نہ لیا گیا ہو۔ اور اسی کو شریعت نے باہمی مشورہ سے تعبیر کیا ہے۔

چناں چہ علماء نے اللہ تعالیٰ کے اس قول کی بابت لکھا ہے کہ:

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ ۚ وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُودٌ لَهُ بِوَلَدِهِ ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَارَّ وَالِدَةٌ مِثْلُ ذٰلِكَ ۗ فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ۗ (البقرۃ: ۲۳۳)

(جو باپ چاہتے ہوں کہ ان کی اولاد پوری مدت رضاعت تک دودھ پئے تو مائیں اپنے بچے کو کامل دو سال دودھ پلائیں اس صورت میں بچے کے باپ کو معروف طریقے سے انھیں کھانا کپڑا دینا ہوگا مگر کسی پر اس کی وسعت سے بڑھ کر بار نہ ڈالنا چاہئے نہ تو ماں کو اس وجہ سے تکلیف میں ڈالا جائے کہ بچہ اس کا ہے اور نہ باپ ہی کو اس وجہ سے تنگ کیا جائے کہ بچہ اس کا ہے۔ دودھ پلانے والی کا یہ حق جیسا کہ بچے کے باپ پر ہے ویسا ہی اس کے وارث پر بھی ہے۔ لیکن اگر فریقین باہمی رضامندی

اور مشورے سے دودھ چھڑانا چاہیں تو ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔)

واضح رہے کہ یہاں مطلقہ عورت کا حکم بیان کیا جا رہا ہے کہ اگر وہ اپنے سابق شوہر کے بچے کو دودھ پلا رہی ہے اور دونوں آپسی مشورہ سے یہ طے کریں کہ دو سال سے پہلے ہی بچہ کا دودھ چھڑا دیا جائے تو اس کے دودھ چھڑانے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن اگر دونوں میں سے کوئی ایک ایسا کرنا چاہتا ہے تو اسے یہ حق نہیں دیا جائے گا۔

اس سے اندازہ لگائیے کہ جب شریعت میں مطلقہ عورت سے مشورے اور اس کی رضا کا اس درجہ خیال رکھا گیا ہے تو اس بیوی کے مشوروں کا بدرجہ اولیٰ خیال رکھنا ہوگا جسے حق زوجیت حاصل ہے

عورت پر مرد کی فوقیت

خاندانی نظام کو اسلامی خطوط پر چلانے کے لئے اسلام نے تین بنیادیں فراہم کر دی ہیں جن کا تذکرہ ہم "عدل"، "مساوات" اور "باہمی مشورہ" کے تحت کر چکے ہیں۔ اب ہم یہاں اس سوال پر بحث کریں گے کہ خاندانی نظام کو چلانے کی ذمہ داری کس پر ڈالی جائے، مرد پر؟ یا عورت پر؟

اس کے جواب میں قرآن کہتا ہے وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ اس طرح گویا وہ خاندانی نظام کو چلانے کا ذمہ دار مرد کو قرار دیتا ہے جو عقل و فطرت سے ہم آہنگ بھی ہے۔

کیوں کہ مرد لڑکوں کا باپ ہوتا ہے یہ چھوٹے بڑے سب اسی کی طرف منسوب ہوتے ہیں تو اس کے علاوہ خاندان کی امارت اور کس کے سپرد کی جا سکتی ہے؟

پھر وہی ان کے نان و نفقہ کا ذمہ دار بھی ہوتا ہے ان کے کھانے پہننے کی ذمہ داری اسی کے سر ہوتی ہے وہی ان کے جملہ معاملات کا نگراں اور محافظ بھی ہوتا ہے اس لئے عقل و فطرت کا تقاضہ بھی

یہی ہے کہ وہ خاندان کا ذمہ دار اور سربراہ ہو۔

اس کے علاوہ مرد گھر کا مالک بھی ہے جسے اپنے بال بچوں کی حفاظت اور نگہداشت کے علاوہ ان کی پرورش و پرداخت بھی کرنی پڑتی ہے ۔خاندان کی یہ تنظیم گویا خود اپنے منھ سے بول رہی ہے کہ اس کا ذمہ دار مرد ہی کو ہونا چاہئیے نہ کہ عورت کو اور یہ ذمہ داری اس نوعیت کی نہیں ہے کہ وہ گھر بیٹھ کر اپنا حکم چلائے بلکہ اس کی ذمہ داری کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ خاندانی نظام کو کامل عدل و مساوات اور اس کے جملہ معاملات کو باہمی مشوروں سے طے کرے ۔اس کی ذمہ داری کا یہ بھی تقاضہ ہے کہ وہ ان بچوں کو صرف کما کر کھلائے ہی نہیں بلکہ انھیں سماج کے مفسد عناصر سے بچائے بھی اسی لئے اسلام نے عورت کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ شوہر کی عدم موجودگی میں کسی ایسے شخص کو گھر میں نہ آنے دے جسے اس کا شوہر ناپسند کرتا ہو۔

لاتاذن المرأة فی بیت زوجہا وھو شاھد الا باذنہ (بخاری مسلم)

شوہر کی موجودگی میں عورت کسی شخص کو اس کی اجازت کے بغیر اندر نہ آنے دے۔

ظاہر ہے کہ اس سے عورت کی حق تلفی نہیں ہوتی ہے اور نہ ہی اس کے اوپر کوئی ظلم ہوتا ہے۔

مرد کی اسی فوقیت اور برتری کو تسلیم کرتے ہوئے شادی کے بعد عورت اپنے باپ کے گھر سے منتقل ہو کر اپنے شوہر کے یہاں آجاتی ہے اس طرح جہاں وہ دوسرے معاملات میں شوہر کی مرضی کی پابند ہوتی ہے ۔وہیں سکونت اور قیام کے معاملے میں بھی شوہر ہی کی مرضی کی پابند ہوتی ہے ۔اب اسے اس کا کوئی حق نہیں پہونچتا کہ وہ اپنے شوہر کو کسی خاص شہر یا خاص علاقے میں رہنے کے لئے مجبور کرے اس کے برخلاف شوہر حالات اور ماحول کا خیال رکھتے ہوئے جہاں اسے اپنی روزی کمانے میں آسانی ہو وہیں سکونت اختیار کرسکتا ہے ۔عورت کو اس معاملے میں مداخلت کا حق حاصل نہیں ہے۔

ان تفصیلات سے بخوبی واضح ہوجاتا ہے کہ مرد کو سربراہی کی یہ ذمہ داری دراصل خاندان کے وسیع تر مفادات کو پیش نظر رکھ کر دی گئی ہے جس میں عورت کی شخصیت کی کوئی توہین نہیں ہے۔

مرد اور عورت کے آپسی تعلقات کی نوعیت دراصل جذباتی ہوتی ہے وہ ایک دوسرے سے قلب و روح کی گہرائیوں سے پیار کرتے ہیں وہ جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو اپنی خارجی زندگی میں چاہے جیسے ہوں ایک دوسرے میں اس طرح کھو جاتے ہیں کہ ان کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں رہ جاتا اور وہ قانون عدل و مساوات سے بالکل بے نیاز ہو جاتے ہیں وہاں یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ خاندان کی سربراہی کون کرے۔ مرد یا عورت؟ اس کے برعکس وہ ایک ایسے مقام پر پہونچ جاتے ہیں جہاں ایک دوسرے کے لئے پیار ہی پیار ہوتا ہے ایثار کے جذبات امڈ آتے ہیں اور اگر شوہر مالدار ہے تو وہ خود اس کے لئے ایسی سہولتیں فراہم کر دیتا ہے کہ وہ گھر کی ذمہ داری سے بے نیاز ہو جاتی ہے لیکن اگر شوہر کی مالی حالت درست نہیں ہوتی تو عورت خود ہی مالی اور جسمانی ہر طرح سے اپنے شوہر کا تعاون کرتی ہے اور بعض علاقوں میں تو گھر کے باہر کی بھی بعض ذمہ داریاں وہ سنبھال لیتی ہے۔

مشہور صحابیہ حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ جو حضرت زبیر بن عوامؓ کی بیوی تھیں وہ کہتی ہیں کہ زبیر کے گھر کا سارا کام کاج میں ہی کرتی ہوں ان کے گھوڑے کو باندھتی ہوں اسے چارہ دیتی ہوں اس کی خدمت کرتی ہوں پانی بھرتی ہوں اسے پانی پلاتی ہوں اور یہ پانی میں تین فرلانگ کی دوری سے اپنے سر پر ڈھو کر لاتی ہوں۔ یہاں وہ گھر کا کام کاج کسی قانون کے تحت نہیں کرتی تھیں بلکہ یہ سارا کام ان کی محبت اور ان کا ایثار کرواتا تھا۔

مرد کی قوامیت

اسلامی معاشرہ میں مرد کو عورت پر قوام بنائے جانے کی بنیاد قرآن مجید کی یہ آیت کریمہ ہے:

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ (النساء: ۳۴)

(مرد عورتوں پر قوام ہیں اس بنا پر کہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس بنا پر کہ مرد اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔)

اس ذمہ داری کی دو قسمیں ہیں

(۱) مادی اور حسی

(۲) معنوی اور روحانی

۱۔ حسی: ہم دیکھتے ہیں کہ مرد عورت کے لئے کماتا ہے اس کی غذا اور لباس اور دیگر ضروریات کا انتظام کرتا ہے اس کو ہم حسی ذمہ داری سے تعبیر کرتے ہیں یعنی جس کو ہم خارج میں دیکھتے ہیں۔ لغت میں بھی قوامیت کا یہی مفہوم ملتا ہے۔ لغت کی مشہور کتاب القاموس المحیط میں ہے:

قام الرجل المرأة وقام علیها — مرد کا عورت کی ذمہ داری قبول کرنا اس کے

صانها وقام بشأنها — نان ونفقہ کا انتظام کرنا اور اس کے معاملات کی نگرانی کرنا

اس طرح لغوی اعتبار سے بھی مرد گویا عورت کا قوام ہے اور الرجال قوامون علی النساء کا ایک مفہوم گویا یہ بھی ہوا کیوں کہ یہ امر واقعہ ہے کہ مرد عورت کی نگہبانی اور محافظت کرتا ہے۔ کیونکہ جسمانی ساخت کے لحاظ سے عورت کو ایسے بہت سے مراحل سے گذرنا پڑتا ہے جب کہ وہ مرد کا سہارا لینے پر مجبور ہو جاتی ہے خصوصاً حمل اور رضاعت کے مراحل میں تو وہ اس قدر کمزور ہو جاتی ہے کہ اس کے لئے اٹھنا بیٹھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے اور اس موقع پر اس کی فطرت یہ تقاضہ کرتی ہے کہ وہ کسی مرد کا سہارا لے جو اس کی حفاظت اور نگرانی کرے۔ انھیں وجوہ کی بنا پر اسلام نے جہاد مردوں کے اوپر فرض کیا ہے اور عورتوں کو اس ذمہ داری سے مستثنیٰ رکھا ہے۔

اس طرح مرد گویا فطرتاً عورت کی حمایت حفاظت اور نگہداشت کا ذمہ دار ہے۔

۲۔ معنوی: اسے ہم دوسرے لفظوں میں اخلاقی اور روحانی ذمہ داری بھی کہہ سکتے ہیں اور یہ ذمہ داری بھی آیت کریمہ **الرجال قوامون علی النساء** کے مفہوم سے نکلتی ہے۔ یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری ہے جو بعض بیمار ذہن کے لوگوں میں گھسی ہوئی ہے وہ آیت کریمہ سے یہ مفہوم نکالتے ہیں کہ اسلام میں عورت کی شخصیت کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا اور اسے انسانی قدروں تک سے محروم کردیا جاتا ہے اور اس کے برعکس مرد کو وہ تمام حقوق دیئے جاتے ہیں جس سے وہ عورت کا استحصال کرسکے۔ لیکن جیسا کہ ہم پیچھے بتا چکے ہیں کہ خاندانی نظام کو چلانے کے لئے اسلام نے مرد اور عورت دونوں کو یکساں اہمیت دی ہے اور اس کے لئے وہ کامل عدل و مساوات اور باہمی مشورہ سے گھر کا انتظام چلانے کے لئے کہتا ہے اب کوئی بتائے کہ اس میں عورت کی شخصیت کو کہاں پامال کیا جارہا ہے؟ کہاں مرد کو عورت پر جبر و استبداد کی تعلیم دی جارہی ہے؟

اسلام تو مرد کو عورت کے نجی مال پر تصرف کا حق بھی نہیں دیتا بلکہ اس کا سارا اختیار صرف عورت کو دیتا ہے جسے وہ پوری آزادی کے ساتھ خرچ کرسکتی ہے اور اگر اس معاملہ میں مرد کچھ مداخلت کرتا ہے تو وہ عورت کو عدالتی چارہ جوئی کا حق بھی دیتا ہے اور میرا دعویٰ ہے کہ اس طرح اسلام نے عورت کو اسقدر بلند مقام پر پہونچا دیا ہے کہ دورِ جدید کی عورت کو بھی اس طرح کا حق ابھی جلد ہی حاصل ہوسکا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اسلام نے عورت کے معاشی استحصال کو کس طرح ختم کیا ہے۔

پھر اسلام کسی مرد کو اس بات کا بھی حق نہیں دیتا کہ وہ اپنی بیوی کے دین کو زبردستی تبدیل کرائے اگر وہ یہودیہ ہے تو یہودیہ بن کر رہ سکتی ہے اور اگر نصرانیہ ہے تو نصرانیہ بن کر بھی رہ سکتی ہے اور مرد کو اس بات کا بالکل اختیار نہیں ہے کہ وہ اس کے دین پر اعتراض کرے یا اسے زبردستی اپنا دین

بدلنے پر مجبور کرے اور یہ وہ حق ہے جو خود قرآن مجید عورت کو عطا کرتا ہے :

اَلْیَوْمَ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ ؕ وَ طَعَامُ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ حِلٌّ لَّکُمْ ۪ وَطَعَامُکُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۫ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ اِذَاۤ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ وَلَا مُتَّخِذِیْۤ اَخْدَانٍ

(المائدہ: ۵)

(آج تمہارے لئے ساری پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں، اہل کتاب کا کھانا تمہارے لئے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لئے اور محفوظ عورتیں بھی تمہارے لئے حلال ہیں خواہ وہ اہل ایمان کے گروہ سے ہوں یا ان قوموں سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی بشرطیکہ تم ان کے مہر ادا کر کے نکاح میں ان کے محافظ بنو نہ یہ کہ آزاد شہوت رانی کرنے لگو یا چوری چھپے آشنائیاں کرو)

چنانچہ اہل کتاب میں سے کسی عورت کو جو کسی مسلمان کی نکاح میں ہو اپنا دین تبدیل کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا الا آنکہ وہ خود اس بات کے لئے بخوشی راضی ہو جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں خود فرماتا ہے لَا اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ (دین میں جبر و اکراہ قطعی نہیں ہے)

اب بتایا جائے کہ جو اسلام عورت کو فکر و عمل کی یہ آزادی اس کے نجی اموال میں تصرف کا یہ اختیار اور دوسرے تمام حقوق میں اسے اس درجہ مساوات عطا کرتا ہے تو کیونکر شبہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ عورت کا استحصال کرے گا اور اللہ تعالیٰ کے اس قول اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ سے یہ کیسے استنباط کیا جاتا ہے کہ وہ مرد کو عورت پر جبر و استبداد کا حق عطا کرتا ہے؟

مرد کی قوامیت جسے ہم محافظت اور ولایت سے تعبیر کر سکتے ہیں اس کے چند مخصوص حدود ہیں جو انسانی فطرت اور زمانہ کی حکمت کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔

اس کی ایک قسم وہ ہے جسے ہم گھر کی نگرانی سے تعبیر کرتے ہیں اور جس کے تفصیلی احکام اوپر بیان ہو چکے ہیں۔

ایک اور قسم وہ ہے جسے ہم "فوجی سربراہی" کے نام سے جانتے ہیں جس میں وہ دشمنوں سے مدافعت کرتا عزت و ناموس کی حفاظت کرتا اور قوم و وطن پر جان دیتا ہے۔ پھر جب آپ مرد اور عورت کے درمیان فرق کی تلاش میں نکلتے ہیں تو آپ کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی نسوانیت کے سبب بہت سی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور مرد کے ساتھ بہت سی خصوصیات و امتیازات وابستہ ہیں۔

۱۔ حیض و نفاس، حمل و ولادت، رضاعت، راتوں کو جاگنا، دن دن بھر کام کرنا۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو ہمیشہ اس کے ساتھ دکھوں اور بیماریوں کی شکل میں لگی رہتی ہیں۔ اور مرد کو ان تمام چیزوں سے مبرّا رکھا گیا ہے اور عمر کے بڑھنے کے ساتھ یکے بعد دیگرے یہ تمام ذمہ داریاں اس کے اوپر عائد ہو جاتی ہیں۔ انسانی تاریخ کا مطالعہ کیجئے تو پتہ چلے گا کہ ہر دور میں لڑکیاں لڑکوں سے کمزور رہی ہیں اور ان کے اجسام زیادہ محنت و مشقت کے قابل نہیں بنائے گئے ہیں۔

۲۔ گھر میں عورت کا کام نہایت محدود ہوتا ہے، تجربات کم ہوتے ہیں اور ایک لگے بندھے نظام کے ماتحت وہ کام کرتی ہے جب کہ مرد کا دائرۂ کار نہایت وسیع ہوتا ہے وہ کافی تجربہ بھی رکھتا ہے مختلف طرح کے معاملات سے نمٹتا ہے ہر طرح کے حیلوں اور تدبیروں سے واقف ہوتا ہے۔ اس لئے ان دونوں کے درمیان عقلی اور جسمانی طور سے فرق رکھنا بھی ناگزیر تھا۔

۳۔ عورت کو اپنے بچے کی پرورش کرنے کے لئے اور اس کی تربیت کرنے کے لئے کسی خاص صلاحیت اور زیادہ قوت و طاقت کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اس کے لئے نازک طبعی اور لطیف جذبات درکار ہوتے ہیں اور اس کے لئے اس سے بڑھ کر اور کوئی خوشی نہیں ہوتی کہ بچوں کے ساتھ وہ خود بھی بچہ بن جائے چنانچہ وہ بچے کے عقل سے سوچتی، اسی کے الفاظ کی نقل کرتی اور اسی کے احساسات

اپنے اندر رکھتی ہے۔ جب کہ مرد کے اندر اس طرح کے جذبات بالکل نہیں ہوتے بلکہ اس کے برعکس اس کے اندر سعی پیہم، اصول پسندی، ذہن کی تیزی اور ہمت کی کثرت رکھی گئی ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کے اندر ابتدائے آفرینش سے طبیعت کی نرمی، احساس کی نزاکت اور جذبات کی شدت ودیعت کی گئی ہے۔ اور مرد کو جنگی قوت، فکری صلاحیت، قوت ارادہ اور حسن تدبیر سے بہرہ ور کیا گیا ہے۔

پس جب مرد کی جنگی اور معاشرتی صلاحیت ثابت ہو گئی اور عورت پر اس کی بالادستی مسلم ہو گئی تو عقل و فطرت کا بھی تقاضہ ہے کہ اسے گھر کا قوام بنا دیا جائے۔

پھر جب یہ بھی معلوم ہے کہ دنیا کے انقلابات، معاشرہ کی اصلاح، اور عوام کی قیادت ہمیشہ مردوں نے کی ہے تو یہ اس کا منطقی نتیجہ ہے کہ وہ ہر میدان میں آگے رہے کیوں کہ اس کی معلومات وسیع ہوتی ہیں۔ تجربات زیادہ ہوتے ہیں جنگی اور حربی صلاحیتیں اس کے اندر بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں اور صدیوں سے معاشرہ کی دیکھ بھال اسی کے ہاتھ میں رہی ہے۔

جب ہر معاملے میں سرداری اور قیادت اس کے لئے مسلّم ہو گئی تو چھوٹے چھوٹے معاملات میں قیادت کا تو وہ بدرجۂ اولیٰ مستحق ہے وہ گھر کی نگرانی کر سکتا ہے، میدانِ جنگ میں جا سکتا ہے اصلاحی انقلابات کا لیڈر ہو سکتا اور سلطنتوں اور مملکتوں کا بادشاہ بھی بن سکتا ہے۔

اور ہمارے اس استدلال کی تمام تر بنیاد اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے "اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ۔"

آج کل جو صورت حال پیدا ہو رہی ہے جسے ہم "بیداری" اور "روشن خیالی" سے تعبیر کرتے ہیں تاریخ انسانی کے لئے یہ بیداری کوئی نئی چیز نہیں چنانچہ نبی ؐ کے زمانے میں بھی کچھ عورتوں نے خواہش کی تھی کہ انھیں بھی مردوں کے ہم مثل کر دیا جائے چنانچہ ایک روایت میں

ہے کہ حضرت ام سلمہؓ ایک مرتبہ کچھ دوسری عورتوں کے ساتھ آنحضرتؐ کے پاس پہونچیں اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ کاش ہمارے اوپر بھی جہاد فرض ہوتا جس طرح مردوں پر ہے تو ہم بھی اجر میں مردوں کے برابر پہونچ جاتیں اس پر یہ آیت نازل ہوئی

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ، لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا، وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ (النساء: ۳۲)

(اور جو کچھ اللہ نے تم میں سے کسی کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ دیا ہے اس کی تمنا نہ کرو۔ جو کچھ مردوں نے کمایا اس کے مطابق ان کا حصہ ہے اور جو کچھ عورتوں نے کمایا اس کے مطابق ان کا حصہ۔)

اور ایسا اللہ تعالیٰ نے اس لئے کیا کہ اس طرح کی خواہشات کرنا اور مردوں کے کام میں دخل دینا نہایت غلط ہے جس سے مقاصد فطرت میں فساد پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے اور بقائے نوع کے لئے اللہ تعالیٰ نے جو قوانین مقرر کر دیئے ہیں اس میں خلل واقع ہوتا ہے۔ اب اگر کوئی عورت اس طرح کی خواہش اس لئے کرتی ہے تاکہ وہ زیادہ اجر حاصل کر سکے تو اللہ تعالیٰ اس کی نیت میں برکت دے گا چنانچہ فرمایا:

لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا، وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۔ (النساء: ۳۲)

(جیسا کام مرد کریں گے اسی کے مطابق ان کو بدلہ دیا جائے گا اور جیسا کام عورتیں کریں گی اسی کے مطابق ان کو بدلہ ملے گا۔)

اور یہ اجر صرف جہاد اور دوسرے کاموں پر موقوف نہیں ہے۔ اور جس کا مقصد صرف مرد سے مشابہت حاصل کرنا ہو تو یہ ایک طرح سے تخلیق الٰہی میں دخل اندازی کی کوشش ہے اور فطری قوانین کو مسخ کرنا ہے اور حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کے رسولؐ نے مردوں سے تشبہ اختیار کرنے

والی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے جب کہ ضروری ہے کہ عورت عورت ہی رہے اور صرف اپنے وظائف فطرت کو انجام دے اور وہی کام کرے جسے اللہ نے اس کے لئے مقرر کر دیا ہے۔ یہی قانونِ فطرت ہے اور معاشرہ کی ترقی کی بنیاد بھی۔

مرد کی عورت پر فضیلت

ہم پیچھے بتا چکے ہیں کہ مرد کی عورت پر سربراہی کا مطلب اس پر ظلم و جبر نہیں ہے اس کی سربراہی دراصل خاندان کی فطرت اور حکمت کا مقتضیٰ ہے، نہ کہ مرد کی ذاتی خصوصیات و امتیاز۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کے قول اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَی النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰہُ بَعْضَہُمْ عَلٰی بَعْضٍ کا مطلب عورت پر مرد کی فوقیت اور برتری جتانا نہیں ہے اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے جب کہ قرآن کے بیان کے مطابق دونوں ایک ہی جان سے پیدا کئے گئے ہیں۔ عورت مرد سے پیدا کی گئی ہے اور مرد عورت سے۔ ارشاد قرآنی ملاحظہ ہو:

فاستجاب ۔ من بعض

(المائدہ: ۱۹۵)

(جواب میں ان کے رب نے فرمایا" میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں ہوں خواہ مرد ہو یا عورت تم سب ایک دوسرے کے ہم جنس ہو۔)

اس لئے یہ کوئی ایسی برتری نہیں ہے جس سے عورت کی حیثیت یا اہمیت میں کوئی فرق واقع ہوتا ہے اسے زیادہ سے زیادہ ہم عضویاتی فرق سے تعبیر کر سکتے ہیں رہی جوہر انسانیت تو دونوں کے اندر یکساں طور پر جوہر موجود ہے۔ پھر یہ عضویاتی فرق کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو کسی کے لئے رنج و تکلیف

کا باعث ہو کیوں کہ اللہ کے نزدیک اصل فضیلت کا مستحق تو وہی شخص ہے جو اپنی روحانی تربیت کرنا چاہتا ہو رہا یہ جسمانی فرق تو اللہ کی نظر میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ قرآن کی مندرجہ ذیل آیت اسی مفہوم کی طرف اشارہ کر رہی ہے:

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۭ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ۭ وَلِلنِّسَاۗءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۭ وَسْـَٔـلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا (النساء: ۳۲)

(اور جو کچھ اللہ نے تم میں سے کسی کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ دیا ہے اس کی تمنا نہ کرو جو کچھ مردوں نے کمایا ہے اس کے مطابق مردوں کا حصہ ہے اور جو کچھ عورتوں نے کمایا ہے اس کے مطابق عورتوں کا حصہ۔ ہاں اللہ سے اس کے فضل کی دعا مانگتے رہو یقیناً اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔)

ظاہر ہے کہ اس آیت میں فضیلت سے مراد فضیلت حسی ہے جس کا تعلق آدمیت سے نہیں ہے اسی مفہوم کی دوسری آیت ملاحظہ ہو:

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰي بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ (النحل - ۷۱)

(اور دیکھو اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں فضیلت عطا کی ہے۔)

یہاں رزق میں کمی بیشی کا قانون بیان کر کے اللہ تعالیٰ کسی کی قدر و منزلت کو گھٹا نہیں رہا ہے یہ دراصل ایک تمدنی تقسیم ہے تاکہ سب ایک دوسرے کی خدمت کریں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ معاشرے میں مرد اور عورت دونوں کی الگ الگ حیثیت اور اہمیت ہے دونوں کے فرائض اور ذمہ داریاں بانٹ دی گئی ہیں۔ اب اپنے فرائض کو جو جس قدر اخلاص محنت اور نیک نیتی سے ادا کرتا ہے اللہ کی نظر میں اس کی اتنی ہی اہمیت اور حیثیت بھی ہے۔

فصل دوم

تعدّد ازدواج

ان اللہ لا یحب الذواقین من الرجال، ولا الذواقات من النساء (دارقطنی، طبرانی، دیلمی)

اللہ تعالیٰ عیش پرست مردوں اور عیش پسند عورتوں کو پسند نہیں کرتا۔

تمہید

اسلام نے جاہلیت اور بداوت کے جن افعال کو باقی رکھا ہے اس میں تعدد ازدواج بھی ہے۔ اس کا رواج اسلام سے پہلے تمام متمدن اور غیر متمدن علاقوں میں تھا خصوصاً اہل عرب اور یہود تو اس تعدد پر کوئی پابندی بھی نہیں عائد کرتے تھے اور ہر شخص کو یہ آزادی دیتے تھے کہ جتنی عورتیں وہ کر سکتا ہو کرے۔ اسے وہ شرعاً اور اخلاقاً کسی لحاظ سے بھی برا نہیں سمجھتے تھے۔

یہ حالات تھے جب اسلام اس دنیا میں آیا اور اس کے آنے کا مقصد چونکہ انسان کے جملہ معاملات کی اصلاح تھی اس لئے اس معاملے میں بھی اس کی مدافعت بالکل ناگزیر تھی چنانچہ اس نے نہ تو بالکل حرام قرار دیا اور نہ ہی اس کی مطلق اجازت دی بلکہ اس کے اوپر کچھ پابندیاں اور شرائط عائد کر دیں تاکہ اس کے برے اثرات ختم ہو جائیں اور مفید پہلو ابھر آئیں۔ اسلام نے تعدد ازدواج پر جو قیود عائد کئے ہیں ان سب کا تذکرہ قرآن کی اس آیت میں ہے:

فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا (النساء: ۳)

(جو عورتیں تم کو پسند آئیں ان میں سے دو دو، تین تین، چار چار سے نکاح کر لو لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ ان کے ساتھ عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کرو یا ان عورتوں کو زوجیت میں لاؤ جو تمہارے قبضہ میں آئی ہیں بے انصافی سے بچنے کے لئے یہ زیادہ قرین صواب ہے۔

تعدد ازدواج کا مقصد جنسی خواہشات کی تسکین نہیں ہے۔

اس موضوع کا مطالعہ کرنے سے پہلے جن بنیادی چیزوں کی واقفیت ازبسکہ ضروری ہے وہ یہ ہے کہ شادی کا مقصد اسلام میں مجرد جنسی خواہشات کی تسکین نہیں ہے اسی لئے علماء نے قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ (البقرہ: ۱۸۷)

(اب تم اپنی بیویوں کے ساتھ شب باشی کرو اور اس ذریت کو حاصل کرو جو اللہ نے تمہارے لئے لکھ دی ہے)

اس آیت میں مباشرت کی غرض خواہشات جنسی کی تسکین نہیں بتائی گئی ہے بلکہ اس کا مقصد نسل انسانی کی افزائش کو قرار دیا گیا ہے کیونکہ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ سے یہی مراد ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک آدمی نے نبی کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ ایک عورت نہایت حسین و جمیل ہے لیکن وہ بانجھ ہے۔ کیا میں اس سے شادی کر لوں؟ آپ نے جواب دیا نہیں۔ دوسری مرتبہ وہ شخص پھر حاضر ہوا اور اس نے اپنا وہی پرانا سوال دہرایا آپ نے پھر نفی میں جواب

دیا تیسری مرتبہ وہی شخص پھر حاضر ہوا اور آکر اس نے وہی اپنا پرانا سوال دہرایا آپ نے کہا نہیں۔ ایسی عورت سے شادی کرو جو حسین و جمیل ہونے کے ساتھ ساتھ بچہ بھی جن سکتی ہو تاکہ قیامت کے دن میں اپنی امت کی کثرت پر فخر کر سکوں۔

ہمیں یہ تو نہیں معلوم کہ سائل مجرد تھا یا شادی شدہ لیکن اس سے یہ بات تو بالکل صاف ہے کہ عورت کے حسن و جمال نے اسے مسحور کر دیا تھا اور باوجود یہ کہ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ بانجھ ہے لیکن پھر بھی وہ اس سے شادی کرنے کے لئے بالکل تیار ہو گیا تھا لیکن آپؐ نے اس کی اجازت نہیں دی۔ اور اس اجازت نہ دینے کا صاف مطلب یہ ہے کہ شادی کا مقصد حصولِ لذت نہیں بلکہ افزائش نسل ہے اور چونکہ اس شادی سے مقصدِ زوجیت حاصل نہیں ہو رہا تھا اس لئے آپ نے اسے اس کی اجازت نہیں دی۔ اب اگر فرض کر لیا جائے کہ سائل اس وقت غیر شادی شدہ تھا تو اس ممانعت کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ چونکہ مقصد زوجیت نہیں حاصل ہو رہا تھا اس لئے آپ نے اسے منع فرما دیا اور اگر یہ مانا جائے کہ سائل اس وقت شادی شدہ تھا تو یہ بات مزید صاف ہو جاتی ہے کہ اسلام میں محض حصول لذت کے لئے شادی کرنا غیر پسندیدہ ہے۔

چنانچہ ایک موقع پر آپ نے ان لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا جو صرف حصول لذّت کے لئے شادیاں کرتے تھے:۔

ان اللہ تعالیٰ لا یحب الذواقین ولا الذواقات

(اللہ تعالیٰ مزے چکھنے والوں اور مزے چکھنے والیوں کو پسند نہیں کرتا)

طبری اور دارقطنی میں اسی مضمون کی ایک اور حدیث آئی ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

تزوجوا ولا تطلقوا فان اللہ لا یحب الذواقین ولا الذواقات

(شادیاں کرو اور طلاق نہ دو کیونکہ اللہ تعالیٰ مزے چکھنے والوں اور مزے چکھنے والیوں کو پسند نہیں کرتا)

تعدد ازدواج محض ایک اجازت ہے

مندرجہ بالا احادیث کی روشنی میں جب ہم فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِنَ النِّسَآءِ والی آیت پر غور کرتے ہیں تو یہ بات بڑی آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ اس اجازت کا مقصد محض نفسانی خواہشات کی تکمیل یا تلذذ پسندی ہرگز نہیں ہے۔ اسی لئے ائمہ تفسیر نے مَا طَابَ لَکُمْ کی تفسیر مَا حَلَّ لَکُمْ سے کی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ دوسری شادی صرف اسی وقت حلال ہے جب اس سے مقاصد شریعت کو کوئی نقصان نہ پہونچ رہا ہو۔

امام قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ بعض لوگوں نے اس آیت میں ما کو ظرفیہ قرار دیا ہے اور اس کی تاویل وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ انکحوا مادمتم تستحسنون النکاح یعنی جب تک تم نکاح کو نبھا سکو۔

لیکن ابن عطیہ اس تفسیر کو ضعیف قرار دیتے ہیں۔ پھر یہ قول چونکہ "بعض ائمہ تفسیر" کی طرف منسوب ہے اس لئے خود بخود معلوم ہو گیا کہ یہ جمہور کی رائے نہیں ہے اور اسی لئے ابن عطیہ نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔

مقصد تحدید ہے اباحت نہیں

آیت کریمہ جس سے تعدد ازدواج کا جواز نکالا جاتا ہے یہ دراصل اس بے قید اباحت پسندی کی حد متعین کرنے کے لئے اتری ہے جو زمانہ جاہلیت میں رائج تھی۔ چنانچہ علماء و محققین نے مندرجہ ذیل آیت کے شان نزول پر گفتگو کرتے ہوئے کہا ہے کہ۔

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ

النِّسَاءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا (النساء: ۳)

(اور اگر تم کو اندیشہ ہو کہ یتیموں کے ساتھ انصاف نہ کر سکو گے تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں ان میں سے دو دو تین تین اور چار چار سے نکاح کر لو لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ ان کے ساتھ عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کرو یا ان عورتوں کو زوجیت میں لاؤ جو تمہارے قبضہ میں آئی ہیں بے انصافی سے بچنے کے لئے یہ زیادہ قرین قیاس ہے۔)

علماء و محققین اس کا شان نزول یہ بتاتے ہیں کہ اہل عرب یتیموں کی سرپرستی قبول کرنے سے اس لئے ہچکچاتے تھے کہ مبادا کہیں ان سے ان کے سلسلہ میں ظلم و زیادتی سرزد ہو جائے لیکن عورتوں کے معاملہ میں انھیں اس طرح کی قطعی ہچکچاہٹ نہیں ہوتی تھی ان کے بارے میں عدل و انصاف کے تصور سے ان کے اذہان بالکل خالی تھے۔ اس آیت کے ذریعہ انھیں اس بات کی تعلیم دی گئی ہے کہ ظلم بہرحال ظلم ہے چاہے وہ یتیموں پر ہو یا عورتوں پر اس لئے صرف اتنی ہی عورتوں سے شادی کرو جتنی عورتوں کے درمیان تم کامل عدل کر سکو اور ظاہر ہے کہ یہ تعداد جس قدر کم ہو گی اسی قدر انھیں حقوق مل سکیں گے اسی لئے آخر میں فرمایا:

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ

علامہ زمخشریؒ اس آیت کی تفسیر میں رقمطراز ہیں:

"اگر تم یتامیٰ کے حقوق میں عدل و انصاف کو ہاتھ سے چھوڑنا پسند نہیں کرتے اور اسے گناہِ عظیم سمجھتے ہو تو عورتوں کے سلسلہ میں بھی اسے ملحوظ رکھو اور کم سے کم شادیاں کرو کیوں کہ اس سے عدل و انصاف کے تقاضے مجروح ہونے کا کم سے کم اندیشہ ہوتا ہے۔"

صاحب طبری نے ابن عباس، سعید بن جبیر، قتادہ اور سدی کے واسطہ سے اس آیت

کا یہ شانِ نزول بیان کیا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں لوگ یتامیٰ کے اموال میں خیانت کرنے کو گناہ عظیم سمجھتے تھے لیکن عورتوں کے سلسلہ میں ان کا تصور اس کے برعکس تھا اور عورتوں پر ظلم و زیادتی کو قطعاً بری نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ اس آیت میں انہیں مخاطب کرکے یہ بتایا جا رہا ہے کہ جس طرح تم یتامیٰ کے اموال میں خیانت کو بری نظر سے دیکھتے ہو اسی طرح عورتوں کے حقوق کا تحفظ کرو اور اس کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ تم ایک سے لے کر صرف چار تک شادیاں کرو اس سے زیادہ نہیں۔ اب اگر تمہیں اس کا اندیشہ ہو کہ چار عورتوں کے درمیان بھی تم عدل کرنے پر قادر نہیں ہو تو صرف اتنے ہی نکاح کرو جتنے میں تم عدل و انصاف کر سکتے ہو۔"

صاحب طبری نے اسی قول کو پسند کیا ہے اور دوسرے تمام اقوال کے مقابلے میں اسے ترجیح دی ہے۔

لیکن چونکہ بیویوں سے تعلق کی نوعیت جذباتی اور قلبی ہوتی ہے اور کسی شخص کے لئے یہ مشکل ہے کہ تمام بیویوں سے یکساں محبت کا برتاؤ کرے۔ اس لئے کہ بیویوں کے درمیان عدل و مساوات کا معیار یہ ہے کہ ایسا نہ ہو کہ کسی بیوی سے اس طرح محبت کرنے لگے جس سے دوسری بیویوں کے حقوق مارے جانے کا اندیشہ ہو۔

یہی تفسیر قرطبی نے ضحاک اور دوسرے مفسرین سے بھی نقل کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

"اس آیت میں عدل کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ تمام بیویوں سے وہ حسنِ سلوک کرے" ان کے درمیان کسی طرح کا فرق نہ کرے ایسا نہ ہو کہ کسی سے تو حد درجہ محبت کرے اور کسی کی زندگی تنگ کرکے رکھ دے، یہ چیز شریعت میں حرام قرار دی گئی ہے جہاں تک قلبی میلان کا تعلق ہے تو اس کو تمام بیویوں کے ساتھ یکساں ملحوظ رکھنا انسانی فطرت کے خلاف ہے۔"

آیت مندرجہ بالا فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ میں امر ایجابی اور الزامی نوعیت کا نہیں بلکہ

التماس اور ارشاد کا ہے۔

امام طبریؒ فرماتے ہیں کہ "اگر کوئی شخص اس موقع پر یہ اعتراض اٹھائے کہ قرآن میں وارد تمام صیغہ ہائے امر کی نوعیت ایجابی و الزامی ہے الا آنکہ کوئی ایسا واضح قرینہ موجود ہو جو اس کی اس حیثیت کو ختم کر رہا ہو۔ تو کیا کوئی ایسی دلیل ہے جس سے معلوم ہو سکے کہ یہاں امر کا صیغہ ایجابی نوعیت کا نہیں ہے؟ تو اس کا جواب ہاں میں ہوگا۔ اور وہ دلیل یہ ہے کہ یہاں دراصل قرینہ موجود ہے جس کی دلیل آیت کا اگلا ٹکڑا فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَۃً ہے کیوں کہ اگرچہ فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِنَ النِّسَآءِ میں صیغہ امر استعمال ہوا ہے مگر دراصل یہ آیت اس ظلم اور زیادتی کو ختم کرنے کے لئے اتری ہے جو جاہلیت میں کئی کئی شادیاں کرکے لوگ عورتوں پر کیا کرتے تھے۔ اس میں نکاح کا حکم نہیں دیا جا رہا ہے گویا آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ اے اہل عرب جس طرح تم یتیموں کے درمیان ظلم و ناانصافی کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہو اسی طرح عورتوں پر مظالم کو بھی ناپسند کرو اور صرف اسی قدر شادیاں کرو کہ حق و انصاف پر قائم رہ سکو۔

چنانچہ قرطبی، ضحاک، طبری، زمخشری اور اگلوں میں ابن عباسؓ، سعید بن جبیر، سُدّی، قتادہ اور دیگر مفسرین نے آیت کا یہی مفہوم بیان کیا ہے۔ اور طبری تو یہاں تک کہتے ہیں کہ یہ آیت دراصل زیادہ شادیاں کرنے والوں پر پابندی عائد کرنے کے لئے اتری ہے کیوں کہ اس سے عدل و انصاف کے مجروح ہونے کا شدید اندیشہ ہے۔

تنگدستی میں تعدد ازدواج کی ممانعت

قرآن کریم کی مختلف آیتوں میں جہاں تعدد ازدواج کی اجازت دی گئی ہے وہیں پر منجملہ دوسرے شرائط کے یہ شرط بھی ہے کہ آدمی معاشی طور پر خود کفیل ہو۔ چنانچہ فرمایا:

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَۃً اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ ذٰلِکَ اَدْنٰٓی

اَلَّا تَعُوْلُوْا (النساء: ۳)

امام فخر الدین رازیؒ ذٰلِکَ اَدْنٰٓی اَلَّا تَعُوْلُوْا کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ یہ "تمہیں تنگدستی سے بچانے کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔"

عربی زبان میں رَجُلٌ عَائِلٌ فقیر اور تنگدست آدمی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اس کا مادہ دراصل ع و ل ہے اسی سے عیال بنا ہے مطلب یہ ہے کہ آدمی جس قدر کم بال بچوں والا ہوگا اسی قدر اس کے اخراجات کم ہوں گے اور جب اس کے اخراجات کم ہوں گے تو وہ مفلس نہیں رہے گا۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ایک شادی کرنے سے آدمی کے لئے جہاں ظلم و زیادتی کے مواقع ختم ہو جاتے ہیں وہیں وہ مفلسی سے بھی محفوظ ہو جاتا ہے۔

امام شافعی اس آیت کی تفسیر ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ ذٰلِکَ اَدْنٰٓی اَلَّا تَعُوْلُوْا کا مطلب اَدْنٰٓی اَلَّا تَکْثُرَ عِیَالُکُمْ یعنی اہل و عیال کو کم کرنے کا یہ بہترین ذریعہ ہے۔

عام طور پر مفسرین نے اس آیت کا دوسرا مفہوم لیا ہے وہ اَلَّا تَعُوْلُوْا کی تشریح اَلَّا تَجُوْرُوْا اور اَلَّا تَمِیْلُوْا سے کرتے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ عورتوں کے درمیان ناانصافی سے بچنے کا یہ سب سے اچھا طریقہ ہے۔ امام فخر الدین رازی نے یہ تاویل نقل کر کے اس پر یہ ریمارک کیا ہے کہ جمہور مفسرین کا پسندیدہ مسلک یہی ہے لیکن یہی امام رازی آگے چل کر قاضی کے واسطہ سے امام شافعی کے مسلک کو ترجیح دیتے ہیں اور اس کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ اگر اس آیت کا بھی وہی مفہوم لیا جائے جو جمہور لیتے ہیں تو آیت میں تکرار پیدا ہو جائے گی کیوں کہ اس سے پہلے والے ٹکڑے فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَۃً میں بھی یہی بات گذر چکی ہے۔ اس کے برخلاف اگر امام شافعی کا مفہوم لیا جائے تو آیت سے تکرار کا عیب ختم ہو جائے گا۔

امام فخرالدین رازی نے قاضی کے حوالہ سے مندرجہ ذیل عبارت نقل کی ہے۔

"آیت کی جو تفسیر شافعیؒ نے کی ہے ہمارے نزدیک وہی مرجح ہے کیوں کہ اس سے تکرار کا عیب ختم ہو جاتا ہے اس لئے کہ فان خفتم الا تقسطوا میں بھی یہی بات کہی جا چکی ہے۔ اس کے برخلاف اگر جمہور کی بات مانی جائے تو یہ عیب مسلسل برقرار رہتا ہے جو قرآنی بلاغت کے یکسر منافی ہے۔"

اس آیت کی تفسیر میں جن اصحاب نے امام شافعی پر انفرادیت کا الزام لگایا ہے امام قرطبی ان کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"دارقطنی نے اپنی سنن میں اس قول کی نسبت زید بن اسلمؒ اور جابر بن زیدؒ جیسے بزرگوں کی طرف کی ہے۔ جن کی تفسیری عظمت امت مسلمہ کے درمیان متفق علیہ ہے۔ یہ دونوں بزرگ امام شافعی سے پہلے اس آیت کی یہی تفسیر کر چکے ہیں۔"

لغوی لحاظ سے بھی امام شافعی کی تفسیر مرجح قرار پاتی ہے کیوں کہ عَالَ یَعُولُ کا مفہوم عربی لغات میں کَثُرَ عِیَالُہٗ (اہل و عیال کا زیادہ ہونا) لکھا ہے اس کی تائید کسائی، ابوعمر الدومی اور ابن اعرابی جیسے ماہرین لغت نے کی ہے۔ امام کسائی ابوالحسن علی ابن حمزہ لکھتے ہیں:

العرب تقول عال یعول وَاَعَالَ یُعِیلُ اَیْ کَثُرَ عِیَالُہٗ

اہل عرب عال یعول اور اعال یعیل اولاد کی زیادتی کے موقع پر استعمال کرتے تھے۔

ابوحاتم فرماتے ہیں کہ

"امام شافعی ہم سب سے زیادہ لغت سے واقف تھے۔"

امام ابوبکر رازی اپنی کتاب تخطئۃ الشافعی میں رقمطراز ہیں:

شافعی کی رائے کو سلف میں سے کسی نے نہیں لیا ہے اسی لئے فخرالدین رازی نے ان کی تردید

فلسفہ و منطق اور فقہ و حکمت کے حوالہ سے دلائل کے انبار لگا دیئے ہیں یہاں تک کہ اسے بالکل بے بنیاد قرار دے دیا ہے۔" امام موصوف آگے لکھتے ہیں "لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ رازی کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ سلف میں کسی نے شافعی کی رائے کی موافقت نہیں کی ہے حالانکہ یہ نہایت مشہور بات ہے کہ مشہور مفسر طاؤس کی قرات ذَالِكَ اَدنٰی اَلَّا تَعِيلُوا ہے ظاہر ہے کہ جب یہ قرات سبعہ میں شامل ہے تو اسی کو اس آیت کی تفسیر بھی بنانی چاہئے۔"

اس طرح گویا یہ قرآن سے ثابت ہو گیا کہ آدمی کا معاشی طور پر خود کفیل ہونا بھی دوسری شادی کی شرائط میں شامل ہے۔ واضح رہے لغوی لحاظ سے بھی امام شافعی کی رائے صحیح ہے۔ امام موصوف کو اس فن میں بھی کافی مہارت حاصل تھی وہ اس کے واقف کار ہی نہیں تھے بلکہ اس کے ماہرین میں ان کا شمار ہوتا ہے کیوں کہ آپ کا بچپن دیہات میں گذرا تھا جہاں کی زبان نہایت صاف ستھری اور دھلی ہوئی ہوتی تھی۔ وہاں رہ کر آپ کی زبان نکھر گئی۔ پھر قرآن کریم کے الفاظ بھی آپ ہی کی رائے کی تائید کرتے ہیں اور سلف میں زید بن اسلمؓ صحابی رسول نیز طاؤس اور جابر بن زید جیسے مشہور تابعین بھی آپ کی رائے کو ترجیح دیتے ہیں نیز علماء کی ایک جماعت جس میں قرطبی اور فخرالدین رازی جیسے لوگ ہیں آپ کی بات کو درست مانتے ہیں:

امام زمخشریؒ لکھتے ہیں:

"امام شافعی جو اَلَّا تَعُولُوا کی تفسیر الا تکثر عیالکم سے کرتے ہیں اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ عربی میں عال الرجل عیالہ کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنے بال بچوں کی کفالت کرے ان کی حفاظت کرے اور ان کی ضروریات پوری کرے۔ اب ظاہر ہے کہ جس آدمی کے اہل و عیال زیادہ ہوں گے اس کا خرچ بھی بڑھ جائے گا اور اس کے لئے حلال اور طیب رزق کمانا مشکل ہو جائے گا۔

ان تفصیلات سے یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ ہمیں تعدد ازدواج میں آدمی کی معاشی حیثیت کو

بھی نگاہ میں رکھنا چاہیے ہم چاہتے ہیں کہ اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر اچھی طرح روشنی ڈال دیں تاکہ ہماری بات کھل کر لوگوں کے سامنے آجائے۔

تعدد ازدواج کی اجازت ضرورتاً دی گئی ہے

قرآن مجید میں جہاں ہمیں چار شادیوں کی اجازت کے متعلق آیتیں ملتی ہیں وہیں مندرجہ ذیل آیتیں بھی ہیں۔

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً

(اور اگر تمہیں عدل نہ کرپانے کا اندیشہ ہو تو ایک ہی شادی کرو)

فَلَا تَمِیْلُوْا کُلَّ الْمَیْلِ

(کسی ایک کی طرف) پوری طرح نہ جھک جاؤ

وَلَنْ تَسْتَطِیْعُوْا اَنْ تَعْدِلُوْا بَیْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ

(تم اپنی) تمام بیویوں کے درمیان یکساں عدل نہ کرپاؤ گے خواہ تم اس کی کتنی ہی خواہش کیوں نہ کرو

مندرجہ بالا آیتوں میں پہلی آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اگر تمہیں کسی بیوی کے اوپر ظلم کا اندیشہ ہو تو کئی شادیاں مت رچاؤ۔ تمام مسلمان ظلم کے حرام ہونے پر متفق ہیں یہ وہ چیز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر اور اپنے بندوں کے اوپر یکساں طور پر حرام ٹھہرایا ہے۔ ایک حدیث قدسی میں خود اللہ رب العزت اپنے بندوں کو مخاطب کرکے ارشاد فرماتا ہے:

یاعبادی انی حرمت الظلم علیٰ نفسی وجعلتہ بینکم محرماً فلا تظالموا

"اے میرے بندو ہم نے ظلم کو خود اپنے اوپر اور اپنے تمام بندوں کے اوپر حرام کردیا ہے تو تم

ایک دوسرے کے اوپر ظلم مت کرو۔

اس طرح آیت کریمہ پہلے ہی قدم پر ایک سے زائد شادی کرنے والوں کو متنبہ کرتی ہے کہ یاد رہے بیویوں پر ظلم مت کرنا کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے محرمات میں سے ہے اس سے یہ غلط فہمی بھی نہیں ہونی چاہئے کہ پہلے شادی رچائی جائے پھر اگر کسی کے اوپر ظلم ہوتا ہوا دیکھیں تو اس کو طلاق دے دیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ایک سے زائد شادی اسی وقت ناجائز ہو جاتی ہے جب آدمی کو اپنے جذبات پر کنٹرول نا کر پھر جانے کا یقین ہو جس کے نتیجہ میں کسی بیوی کی حق تلفی ہو جانے کا اندیشہ ہو۔

دوسری آیت کے پہلے اور دوسرے ٹکڑے میں انسانی فطرت کا لحاظ کر کے کسی بیوی کی طرف کچھ زیادہ میلان کی اجازت دی گئی ہے مکمل میلان کی نہیں یا دوسرے لفظوں میں بعض ظلم کی اجازت دی گئی ہے مکمل ظلم کی نہیں۔ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ظلم سرتاپا حرام ہی ہے تو بعض ظلم کی اجازت کیوں دی گئی ہے؟ اس میں اللہ تعالیٰ کی کون سی حکمت اور مصلحت پوشیدہ ہے؟ کیا اس سے عیش پرست مردوں اور عورتوں کو آزادی میں وسعت دی گئی ہے؟ یا اس کی کوئی ضرورت اور اس میں کوئی مصلحت بھی ہے؟

ظاہر ہے کہ شریعت عیاشی کی حوصلہ افزائی تو کر نہیں سکتی ہے پھر اس کے علاوہ اور کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ واقعی کسی انسانی ضرورت کے تحت اس کی اجازت دی گئی ہے۔

تعدد ازدواج کی مصلحت

کسی غور کرنے والے شخص کے لئے ان مصلحتوں کا پتہ لگا لینا کوئی مشکل کام نہیں ہے، تھوڑی سی غور و فکر کے بعد ہر شخص ان مصلحتوں کو سمجھ سکتا ہے جن کی بنا پر شریعت نے ایک سے زائد شادیاں کرنے کی اجازت دی ہے بعض اہم مصلحتوں کی طرف ہم ذیل میں اشارہ کر رہے ہیں:

(الف) آدمی کے اندر فطرتاً اولاد کی طلب ہوتی ہے شادی ہونے کے بعد ہر شخص سوچتا ہے کہ جلدی

سے وہ باپ بن جائے۔ اب اگر شادی کے بعد اسے یہ معلوم ہو کہ اس کی بیوی بانجھ ہے تو کیا اسے اولاد کی طلب کی اس فطری خواہش کو دبا دینا چاہیے یا شریعت کے جائز کئے ہوئے دوسرے راستے کو اختیار کرے اور دوسری شادی کر کے اولاد حاصل کرے۔ اگر کوئی شخص اس مصیبت سے دوچار ہوتا ہے تو اس پر ہمیشہ کے لئے شادی کا دروازہ بند کر کے اسے اولاد کی نعمت سے محروم کر دینا سراسر زیادتی نہیں تو اور کیا ہے؟ اگر اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا تو اس کے علاوہ اور کیا ہوگا کہ آدمی کوئی غلط راستہ اختیار کرکے اپنی اس فطری خواہش کو پورا کرنے کی کوشش کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ معاشرہ میں ایک طرح کا فساد ہے جو شریعت کے مزاج کے منافی ہے۔

اور بسا اوقات انسان کی یہ خواہش اس قدر زور پکڑتی ہے کہ خود پہلی بیوی اپنے شوہر کو دوسری شادی کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ شادی کا پیغام وہ خود لے جاتی ہے اور نکاح کے دوسرے معاملات بھی وہی خود طے کرتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ اپنے شوہر کو خوش رکھنے کے لئے وہ اپنی تمام خواہشات قربان کر دینے کے لئے تیار ہو جاتی ہے۔

واقعات کی دنیا میں یہ کوئی نیا کیس نہیں ہے بلکہ یہاں تک دیکھا گیا ہے کہ پہلی بیوی دوسری بیوی کے بچہ کی پرورش اپنے بچے سے زیادہ کرتی ہے وہ اپنی خالی گود اسی سے آباد کرتی ہے اپنے بستر پر سلاتی ہے اس کی نگہداشت کرتی ہے اس پر جان نچھاور کرتی ہے اسے اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک خیال کرتی ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ یہی اس کی فطرت کا تقاضہ بھی ہے تو کیا فطرت کی اس آواز کو دین فطرت نظر انداز کر سکتا تھا؟

(ب) خدانخواستہ اگر کسی کی بیوی کسی مہلک مرض میں مبتلا ہو جائے اور وہ شوہر کے قابل نہ رہ جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ شوہر کیا کرے؟

یورپ کے اباحیت پسند تو شائد اس کا جواب یہ دے لیں کہ بغیر نکاح کے وہ دوسری عورتوں سے اپنی خواہش پوری کرے کیوں کہ وہ زنا کو کوئی عیب کی بات نہیں سمجھتے۔ لیکن اسلام ایک دین حنیف

ہے وہ معاشرہ سے گندگی ختم کرنا چاہتا ہے وہ کسی طرح اپنے افراد کو معاشرے میں گندگی پھیلانے کی اجازت نہیں دے سکتا اس لئے اس نے دوسری شادی کی اجازت دی ہے۔

بڑی عجیب بات ہے کہ خود مسلمانوں میں بہت سے ایسے لوگ موجود ہیں جو تعدد ازدواج کی اس اجازت پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں لیکن فاحشہ اور بدکار عورتوں سے غلط تعلقات رکھنے والوں کو وہ ایک لفظ بھی نہیں کہتے بلکہ وہ اسے اس کے "روشن خیالی" اور "ترقی پسندی" کی دلیل ٹھہراتے ہیں۔

بہر حال یہ دو طریقے ہیں۔ اب فیصلہ آپ کو کرنا ہے کہ ان دونوں میں مرد اور عورت دونوں کے لئے پاک اور باعزت طریقہ کون سا ہے؟ اور ان دونوں میں سے کس طریقہ کو اختیار کرنے میں معاشرے کی بہبود ہے؟

میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر معاشرے کو فساد سے پاک کرنا ہے اور مرد عورت کو واقعی پاکیزہ زندگی گذارنی ہے تو شادی سے بہتر کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ اس لئے بجائے اسلام پر چوٹ کرنے کے انھیں خود یہ طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔ اور اپنی فطرت کو اس قدر مسخ نہیں کرنا چاہیئے کہ وہ نکاح اور آوارگی میں فرق ہی نہ کر سکے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دوسری شادی پہلی بیوی کے اوپر ایک غیر فطری بوجھ ہے لیکن ایسا کہنے سے پہلے وہ اس سوال کا جواب نہیں دیتے کہ مذکورہ بالا صورت میں بانجھ بیوی کا شوہر کون سا فطری طریقہ اختیار کرے؟

(ج) بعض عورتوں کی یہ فطرت ہوتی ہے کہ وہ طبعی طور پر مرد کو پسند نہیں کرتیں شوہر خواہ کتنا ہی جوش کا مظاہرہ کرے لیکن اس کی جنسی خواہش نہیں بجھا سکتیں۔ یہ ایک طرح کا نسوانی مرض ہے جو عورتوں میں معروف ہے۔ اب بتایا جائے کہ شوہر کا دوسری شادی کرنا جس کی پہلی بیوی اس کو سکون نہیں دے پاتی ہے — کوئی ظلم ہے۔؟

(د) کبھی کبھی آدمی کی اقتصادی ضرورت بھی مزید شادی کا تقاضہ کرتی ہے ۔جیسا کہ کم آبادی والے گاؤں میں اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ ان کی معیشت کا دارومدار ہی کھیتی باڑی وغیرہ پر ہوتا ہے جس میں بہت سے کام کرنے والوں کی ضرورت پڑتی ہے ۔اور اس طرح تعددِ ازدواج آدمی کی اقتصادی ضرورت بن جاتی ہے۔

اس سے اسلام کے دینِ فطرت ہونے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جہاں اس نے پورے معاشرے کا خیال کیا ہے وہیں افراد کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے اور خصوصی وعمومی دونوں حالات کے لئے احکام نازل فرمائے ہیں۔

اور اس نے اپنے احکام میں فرد اور جماعت دونوں کا لحاظ کیا ہے ۔کیوں کہ اس میں شائد کسی کے لئے اختلاف کی گنجائش نہیں کہ امت کی شان وشوکت اور اس کی کثرتِ تعداد اس کی ہیبت وقوت کے اسباب میں آتا ہے اور ہم کسی بھی حال میں اس بڑے محرک کو جو امتوں کی قوت کو بڑھانے اور ان کی عظمت کو چار چاند لگانے میں اتنا موثر رول ادا کرتا ہو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

اس کے لئے ہم مصر کے شمالی علاقوں کی مثالیں پیش کر سکتے ہیں وہاں کی زمین بڑی زرخیز ہے ہر طرح کے اثرات سے بالکل پاک ہے اور باہر سے کسی اور کام کرنے والے کی ضرورت نہیں پیش آتی وہاں کی آبادی بھی بڑی گھنی ہے نسلوں کی افزائش بھی کافی ہے اور خالی پڑی ہوئی زمینیں مسلسل آباد ہو رہی ہیں ۔وہاں کا آدمی خوشحالی اور فارغ البالی کا تصور بھی نہیں کر سکتا جب تک اس کے پاس ایک سے زائد بیویاں نہ ہوں اور جس کے پاس ایک سے زائد بیویاں ہوتی ہیں وہ چند ہی دنوں میں بہت مال دار ہو جاتا ہے جبکہ اس سے پہلے وہ بالکل مفلس اور قلاش تھا جس نے بھی ان مقامات کا دورہ کیا ہے وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہے۔

(ہ) قوموں اور امتوں کو اکثر جنگوں اور لڑائیوں کی ضرورت پیش آتی ہے جس میں افراد کی سخت ضرورت پڑتی ہے تاکہ ایک طرف وہ دشمن سے لڑیں تو دوسری طرف وہ اپنی معاشیات بھی

مضبوط رکھ سکیں۔

اس سلسلہ میں بھی یہ بات بہت مشہور ہے کہ تعدد ازدواج اس کا ایک بہت بہتر ذریعہ ہے جس کا سہارا لے کر صدر اول کے مسلمانوں نے کافی ترقیاں کی تھیں انھوں نے بہت سی داخلی اور خارجی جنگیں لڑیں اور اگر ایسا نہ ہوتا تو جنگوں کی شدت سے وہ پس کر رہ جاتے۔ ہمارے اس جدید دور میں بھی جب جرمنی میں ہٹلر کی لڑائی کی وجہ سے نوجوانوں کی کثیر تعداد موت کے گھاٹ اتار دی گئی تو ہٹلر بھی اس کی ضرورت کی شدت پر سوچنے کے لئے مجبور ہو گیا کیوں کہ اس جنگ میں اتنے افراد ہلاک ہو گئے تھے کہ قومی بنیادیں ہل کر رہ گئی تھیں چنانچہ اس کے سوا اسے اور کوئی راستہ نظر نہیں آیا کہ تعدد ازدواج کا طریقہ اختیار کرے۔

مجلہ الاحرام کے ۱۳ دسمبر ۱۹۶۰ء کے شمارے میں مارشل بورمان جو ہٹلر کا نائب وزیر اعظم تھا اس کا ایک دستاویزی خط شائع ہوا ہے جسے اس نے ۱۹۴۴ء میں لکھا تھا۔ وہ اس میں کہتا ہے کہ "ہٹلر بڑی تیزی سے اس بات پر غور کر رہا تھا کہ جرمنی میں ہر فرد کے لئے قانونی طور پر دو شادیاں کرنا ضروری کر دیا جائے تاکہ جرمنی قوم کے مستقبل کا تحفظ ہو سکے"۔

پھر مزید دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ مردوں کی تعداد اگر عورتوں سے کم ہو تو یہ ایک بحران کا سبب بن جائے گا اور معاشرہ میں غیر شادی شدہ عورتوں کی کثرت ہو جائے گی اب اگر ایک مرد ایک ہی عورت سے شادی کرے تو بقیہ عورتوں کا کیا ہو رہا باقی ماندہ عورتیں اس کے علاوہ اور کیا کر سکتی ہیں کہ جب معاشرہ ان کی پرورش سے عاجز رہ جائے تو وہ غلط کام کرنا شروع کر دیں اور ظاہر ہے کہ "پرورش" صرف کھانے پینے کا نام تو نہیں ہے بلکہ اس میں اس فطری خواہش کی تکمیل بھی شامل ہے جس کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔

تعدد ازدواج کو برا بھلا کہنے والے بھی ان حقائق سے بخوبی آگاہ ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ یورپ میں اسی کے نتیجہ کے طور پر زنا کی وبا عام ہو گئی ہے اور شہوانیت پورے معاشرہ پر چھا چکی ہے لیکن وہ

جانتے بوجھتے اس حقیقت سے چشم پوشی کر رہے ہیں گویا ان کے نزدیک قانونی طور پر شادی کر کے اپنے زوجیت میں لینا حرام کاری سے زیادہ بڑا گناہ ہے اور گویا صحیح النسب بچے ان کے نزدیک حرامی بچوں سے کمتر ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی اس تحریک کا انجام کیا ہوگا اور اس کے پھیلنے سے معاشرہ میں کس قدر برائیاں عام ہو جائیں گی۔

ایک خاص بات جس کا ذکر اس مقام پر ضروری ہے وہ یہ کہ جرمنی میں جنگِ عظیم ثانی کے بعد وہاں کی عورتوں نے زنا کو قانون بنانے کے لئے ضد کرنی شروع کر دی اور انھوں نے انکار کر دیا کہ وہ اپنی ساری زندگی بدکاری کے کسی ایک ہی اڈے پر رہ کر گذار دیں اور نتیجہ کے طور پر ایک ایسے لڑکے کی ماں بن جائیں جس کا معاشرہ میں کوئی مقام نہ ہو اور وہ معاشرہ میں ذلیل ہو کر رہ جائے۔ اس پر انھوں نے مطالبہ کیا کہ ازروئے قانون شادی کا ایسا طریقہ رائج کیا جائے جس کے تحت ایک عورت ایک مخصوص مدت تک کسی مرد کے ساتھ رہے پھر وہ اس کا ساتھ چھوڑ دے اور دوسری عورت اس کی جگہ لے لے اور اس کے لئے انھوں نے ایک تنظیم کی داغ بیل ڈالی تاکہ موثر طریقہ پر وہ اپنی آواز پہونچا سکیں اور اس فعل خبیث کو قانونی مرتبہ دلا سکیں۔ یہ صورت حال اہل یورپ کے لئے نہایت مضحکہ خیز اور قابل رحم ہے کہ ایک طرف تو وہ "تعدد ازدواج" کے قانون پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور دوسری طرف ایک غیر فطری ذریعہ سے ایک مرد کو کئی عورتوں کے ساتھ رہنے کی چھوٹ دیتے ہیں۔

خاتمہ: مندرجۂ بالا تفصیلات سے ظاہر ہوتا ہے کہ قانون "تعدد ازدواج" میں فی الواقع کوئی نقص نہیں ہے اگر نقص ہے تو اس کے غلط طریقۂ استعمال میں ہے جسے ہوس پرست لوگ ذاتی مفاد کے تحت کرتے ہیں۔ اور اصل خرابی اس ذواقیت میں ہے جس کی وبا یورپ میں عام ہے وہاں زندگی صرف کھانا پانی اور شہوت رانی کا نام ہے چنانچہ وہاں طلاق کی بیماری عام ہے بلکہ لوگ شادی ہی محض حصول لذت کے لئے کرتے ہیں انھیں اس کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی کہ معاشرہ میں اس کے سبب سے

کتنا فساد پھیلاتا ہے اور لڑکوں اور بیویوں کے ساتھ کتنا برا سلوک کیا جاتا ہے۔

اس برائی کی اصلاح ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حلال کی ہوئی چیز کو حرام کر کے نہیں ہو سکتی اس کے لئے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشروع چیزوں پر عمل کیا جائے ذہنوں کو صاف کیا جائے اور دلوں کی تطہیر کی جائے اور لوگوں کو امور دینیہ سے آشنا کرایا جائے اور ان کے مقاصد زندگی کو ان کے سامنے واضح طور پر رکھا جائے۔ تبھی اس برائی کا بلکہ معاشرہ میں پھیلی ہوئی تمام برائیوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔

ایک اور بات جسے نگاہ میں رکھنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ایک سے زائد شادی کا رواج آج کل قرون اولیٰ کی بہ نسبت کم ہو گیا ہے اور یہ بات بالکل واضح طور پر ہر شخص کے سامنے ہے اس میں کسی کو شک وشبہ کی قطعاً گنجائش نہیں اور یہ اس بات کی واضح علامت ہے کہ لوگ اس کی ذمہ داریوں سے آشنا ہو چکے ہیں اور زندگی کی قدروں سے بخوبی آگاہ ہو چکے ہیں اور یہ علم وثقافت کی دین ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے ذہن ودماغ کو اچھے مقاصد اور بلند غایات تک پہونچنے کے لئے وقف کئے ہوئے ہیں۔ بیداری کی یہ لہر علم وثقافت کی یہ ترقی اور لوگوں کے اندر مذہب کی طرف پلٹنے کی یہ خواہش بتا دیتی ہے کہ لوگ بلا ضرورت اب ایک سے زائد شادی نہیں کریں گے اور زیادہ دن نہیں گذریں گے کہ اسے صرف ضرورت مند افراد ہی اپنائیں گے اور یہ چیزیں مذہب اسلام کی فضیلت وبرتری تمام دوسرے ادیان پر ثابت کر دے گی۔

فصل سوم

طلاق

ابغض الحلال الی اللہ عزوجل الطـــــلاق

(ابوداؤد، ابن ماجہ، حاکم)

(اللہ تعالیٰ کے نزدیک حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز طلاق ہے۔

اسلام طلاق کو ناپسند کرتا ہے

طلاق کی تعریف سیدھے سادے لفظوں میں یہ ہے کہ شوہر اور بیوی ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں اور اس تعلق کو توڑ ڈالیں جسے انھوں نے اللہ کے قانون کے مطابق آپس میں استوار کیا تھا۔

انسان کا سنت الہٰی کو توڑ ڈالنا در اصل اپنی صالحیت کو ختم کرنا ہے اس سے خود اس کی محبت اور اس کا سکون ختم ہوتا ہے۔ اور جب تک ان دونوں کے درمیان ایسے عوامل پیدا نہ ہو جائیں جن کی وجہ سے آپس کی جدائی ضروری ہو اس وقت تک ایک دوسرے سے الگ ہونا قانون الہٰی کا مذاق اڑانا ہے۔

اللہ کے رسولؐ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں فرماتے ہیں:

مابال احدکم یلعب بحدود اللہ یقول قد طلقت قد راجعت

(ابن ماجہ، ابن حبان)

تمھیں کیا ہو گیا ہے۔ تم حدود الہٰی کے ساتھ کھیل کرتے ہو، کبھی کہتے ہو میں نے طلاق دیا اور کبھی رجوع کر لیتے ہو۔

ایلعب بکتاب اللہ وانا بین اظہرکم (نسائی)

کیا کتاب الہٰی کے ساتھ کھیل کیا جا رہا ہے جب کہ میں ابھی تمہارے درمیان موجود ہوں۔

یہ باتیں آپ نے ایک ایسے شخص کے بارے میں کہی تھیں جس نے اپنی بیوی کو بلا وجہ طلاق دے دی تھی۔

شریعت میں طلاق دینا اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ عام طور پر آج کل لوگ سمجھتے ہیں۔ یہ ایک اہم معاملہ ہے جس کی اجازت شریعت نے مجبوری میں دی ہے اور یہ وہ آخری حیلہ ہے جسے اسلام نے نباہ نہ کر پانے کی صورت میں شوہر کو عطا کیا ہے۔ اللہ کے رسولؐ ارشاد فرماتے ہیں:

ابغض الحلال الی اللہ عزوجل الطلاق (ابوداؤد، ابن ماجہ، حاکم)

(اللہ کے نزدیک حلال چیزوں میں مبغوض ترین چیز طلاق ہے)

ماخلق اللہ شیئا ابغض الیہ من الطلاق (دارقطنی)

(اللہ تعالیٰ نے طلاق سے زیادہ مکروہ ترین چیز پیدا نہیں کی)

حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

تزوجوا ولا تطلقوا فان الطلاق یھتز منہ العرش (اخرجہ الدیلمی)

(شادیاں کرو لیکن طلاق نہ دو کیوں کہ طلاق وہ چیز ہے جس سے عرش بھی دہل جاتا ہے)

طلاق اور طلب لذّت

بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو حقائق زندگی سے ناآشنا ہوتے ہیں زندگی کے تمام معاملات پر ان کی نظر بس اچٹتی ہوئی پڑتی ہے اس کی گیرائی اور گہرائی سے وہ ناواقف ہوتے ہیں مثال کے طور پر شادی ہی کو لے لیجئے وہ اسے طلب لذت کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اور بس۔ جب یہ مقصد ختم ہوجاتا ہے اور کسی عورت سے ان کی طبیعت بھر جاتی ہے تو ان کی جنسی بھوک اس مقصد کے حصول کے لئے کسی دوسری عورت کی تمنا کرتی ہے اور جب دوسری بھی ان کی جنسی خواہشات کے بھینٹ چڑھ جاتی ہے تو وہ کسی اور کو تلاش کرتے ہیں۔ اور یہ آوارہ گردی مسلسل جاری رہتی ہے اپنی اس بھوک کو مٹانے کے لئے وہ ہزاروں عزتیں لوٹتے ہیں اور ہزاروں عفتیں پامال کرتے ہیں ایسے ہی لوگوں کے متعلق اللہ کے رسولؐ نے ارشاد فرمایا ہے:

تزوجوا ولا تطلقوا فان اللہ لایحب الذواقین والذواقات (دیلمی۔ دارقطنی)

(شادیاں کرو لیکن طلاق نہ دو کیوں کہ اللہ تعالیٰ مزے چکھنے والوں اور مزے چکھنے والیوں کو پسند نہیں کرتا)

ہم پیچھے بتا چکے ہیں کہ مغرب میں اس طرح کی جنسی آوارگی تقریباً عام ہو چکی ہے اور وہ اپنی زندگی کے اس گھناؤنے پہلو کو ظاہر کرتے ہوئے شرماتے بھی نہیں ہیں صرف یہی نہیں بلکہ وہ شادی کے بعد بھی کھلے عام آشنائی کرنے کو غلط نہیں سمجھتے بلکہ وہ اسے اپنے منطقیانہ اور فلسفیانہ دلائل سے انسان کی فطری ضرورت قرار دیتے ہیں چنانچہ شوہر شادی کے بعد بھی مختلف عورتوں کو اپنا دوست بناتا ہے اسی طرح عورت بھی یکے بعد دیگرے مختلف مرد تبدیل کرتی رہتی ہے ان کے خیال میں یہی "جدت" دراصل زندگی ہے۔

میرے خیال میں یہ انسانیت کی پستی کی انتہا ہے جس نے ان کی بصارت و بصیرت سب چھین لی ہے اور انھیں زندگی کی اعلیٰ اخلاقی قدروں سے محروم کر دیا ہے۔ عورت بھی ایک انسان ہے اور ایک انسان کی سب سے قیمتی چیز اس کی انسانیت ہوتی ہے اس کی سب بڑی سعادت اس کا باعزت اور بااخلاق ہونا ہے اس سے بڑھ کر کوئی سعادت نہیں اور اس حسن سے بڑھ کر کوئی حسن نہیں، اگر یہ دونوں چیزیں اس سے چھین لی جائیں تو وہ دنیا کی بدترین عورت بن جاتی ہے۔

طلاق اور مزاجوں کا اختلاف

یقیناً کسی عورت کے اندر کچھ ناپسندیدہ خصلتیں پائی جاسکتی ہیں جو اس کی شخصیت کو عیب دار بنا دیتی ہوں، لیکن اس کے دور کرنے کا طریقہ طلاق تو ہرگز نہیں ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ ان عیوب کے باوجود آدمی کی ازدواجی زندگی خوشگوار اور پرسکون رہے وہ مرد کو عورت کی غلطیوں سے چشم پوشی کا مشورہ دیتا ہے اور عورتوں کی طرف سے معذرت کرتا ہے کہ

ان المراۃ کالضلع ان ذھبت تقیمھا کسرتھا وان ترکتھا (ای امسکتھا علیٰ ماھی علیہ) استمتعت بھا علیٰ عوج (متفق علیہ)

عورت پسلی کے مانند ٹیڑھی ہے اگر تم اسے سیدھا کرنے لگو گے تو توڑ دو گے اور اگر اس کے

حال پر چھوڑ دوگے تو اس کے ٹیڑھے پن کے باوجود تم اس سے فائدہ اٹھا سکوگے۔

حدیث شریف کے آخری ٹکڑے (وان ترکتھا استمتعت بھا علی عوج) پر غور کیجئے وہ مرد کو عورت کے عیوب سے چشم پوشی کا حکم دیتا ہے وہ اسے بتاتا ہے کہ اسی عفو و درگزر میں تمہاری زندگی کے سکون کا راز پنہاں ہے لیکن اس کے برخلاف اگر بات بات پر تم خفا ہونے لگو گے تو تمہاری زندگی تلخ ہو کر رہ جائے گی۔

اس سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اسلام عورت کو بد اخلاق اور سراپا عیب تصور کرتا ہے۔ ہرگز نہیں اس کا مقصد دراصل مرد کو یہ تعلیم دینا ہے کہ اگر اتفاق سے عورت کے اندر کوئی عیب ہو تو اسے اپنے سے الگ کرنے میں جلد بازی کا مظاہرہ نہ کر دیں کیوں کہ ہو سکتا ہے اس میں کوئی دوسری عادت ایسی ہو جو تمہیں مرغوب ہو۔ انسان تو اچھائی اور برائی کے مجموعہ ہی کا نام ہے اور عورت بھی ایک انسان ہی ہے۔ اسی حقیقت کی طرف مندرجہ ذیل حدیث اشارہ کرتی ہے:

لا یفرک مومن مومنۃ ان کرہ منھا خلقا رضی منھا آخر (احمد مسلم)

کوئی مومن مرد کسی مومنہ عورت سے نفرت نہ کرے کیوں کہ ہو سکتا ہے کہ اگر اس کی کوئی چیز اسے ناپسند ہو تو دوسری چیز پسند آجائے۔

اس حدیث سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شریعت کس طرح اپنے افراد کے اوپر طلاق کی راہیں تنگ کرتی ہے۔ اگر بیوی کے اندر کوئی عیب ہو تب بھی وہ مرد کو خوش اسلوبی سے نباہنے کا مشورہ دیتی ہے اور صرف مشورہ ہی نہیں دیتی بلکہ اسے موجب ثواب بھی قرار دیتی ہے۔

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ فَإِن كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا (النساء: ۱۹)

ان کے ساتھ اچھے سلوک سے رہو اگر وہ تم کو ناپسند بھی ہوں تو ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند

کرو اور اللہ تعالیٰ اس میں بہت کچھ بھلائی رکھ دے۔

علامہ ابوبکر جصاص اپنی تفسیر احکام القرآن میں اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ شریعت شوہر کی ناپسندیدگی کے باوجود بیوی کو روکے رکھنے کی تلقین کرتی ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ اس میں ہمیں اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ اس میں اس نے خیر کثیر رکھ دیا ہے۔"

لیکن اگر واقعی اس کے اندر کوئی ایسی ناپسندیدہ خصلت موجود ہے جو آدمی کی معاشرتی زندگی کو غارت کر رہی ہو اور اس کا سکون ختم کئے دے رہی ہو، کسی گفتگو کا کوئی نتیجہ نہ نکلتا ہو، محبت کی کوئی گفتگو بھی کارگر نہ ہوتی ہو تو اسلام آخری چارۂ کار کے طور پر اسے جدائی کا اختیار دیتا ہے۔ حدیث نبوی ہے:

لا تطلقوا النساء الا من ريبة فان الله لا يحب الذواقين ولا الذواقات۔ (طبرانی)

عورتوں کو بلا کسی معقول وجہ کے طلاق نہ دو کیوں کہ اللہ تعالیٰ مزہ چکھنے والوں اور مزہ چکھنے والیوں کو پسند نہیں کرتا ہے۔

حدیث میں جو "ریبۃ" کا لفظ استعمال ہوا ہے اس کا مفہوم یہاں پر یہ ہے کہ جب تک طلاق کی متبادل شکل موجود ہو اس وقت تک عورت کو طلاق نہ دو طلاق کو صرف آخری چارۂ کار کے طور پر استعمال کرو۔

طلاق کے عدم وقوع کی صورتیں

قرآن کریم اور احادیث نبویہ کے غائر مطالعہ کے بعد علماء محققین نے مندرجہ ذیل صورتوں میں طلاق کو واقع نہیں مانا ہے:

غصہ کی شدت میں دی گئی طلاق نہیں واقع ہوتی۔ غصہ کی شدت سے ہماری مراد آدمی

کی وہ حالت ہے جس میں وقتی جوش آدمی کے اعصاب پر غالب آجاتا ہے اور جو وہ کہنا چاہتا ہے نہیں کہہ پاتا اور اس زبان سے وہ چیز نکل جاتی ہے جس کی اس کے دل میں کوئی نیت نہیں تھی۔ فقہاء نے یہ استدلال مندرجہ ذیل حدیث سے کیا ہے:

لا طلاق ولا عتاق فی اغلاق

(غصہ میں نہ تو طلاق واقع ہوتی ہے اور نہ آزادی)

ابن قیم نے اغلاق کی تفسیر غضب سے کی ہے اور امام ابوداؤد نے بھی اپنی سنن میں یہی مفہوم لیا ہے۔ وہ اس کی تحقیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "غلق ہر اس شخص کے لئے بولتے ہیں جس کے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت ختم ہوگئی ہے، جیسے شرابی اور مجنون اور مجبور کیا ہوا یا برسام میں مبتلا شخص۔ ان تمام حالات میں طلاق مُطلِق کی نیت کے علیٰ الرغم ہوتی ہے اس لئے اگر جان بوجھ کر طلاق نہ دی گئی ہو تو ان حالتوں میں طلاق واقع نہیں ہوتی ہے"۔

۲۔ اگر کوئی شخص اس طرح کہے کہ "اگر میں فلاں کام کروں یا نہ کروں تو میرے اوپر طلاق لازم ہے تو اس کی طلاق بھی واقع نہیں ہوتی"۔

ابن قیمؒ 'اعلام الموقعین' میں لکھتے ہیں:

"یہی مذہب امام ابوحنیفہ کا اور ان کی جماعت کے بعض مشائخ کا بھی ہے۔ قفّال "الطلاق یلزمنی" والی صورت میں یہی فتویٰ دیتے ہیں۔ اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ اس طرح کی بات کہنے والا دراصل مستقبل کے متعلق ایک عہد کرتا ہے جب کہ طلاق اس وقت واقع ہوتی ہے جب کوئی شخص حالتِ ہوش وحواس زمانۂ حال میں نیت کے ساتھ دے اگر یہ شرطیں مفقود ہوگئیں تو طلاق واقع نہیں ہوگی امام ابن قیم فرماتے ہیں کہ اس طرح کی بات کہنے والا گویا یہ کہتا ہے کہ "میرے اوپر تجھے طلاق دینا لازم ہوگا" اور یہ بات متفق علیہ ہے کہ اگر وہ اس کی صراحت بھی کردے تو بھی طلاق واقع نہیں ہوتی۔

۳۔ اگر کوئی اپنی بیوی سے یہ کہے کہ اگر تم نے فلاں سے گفتگو کی یا میری اجازت کے بغیر گھر سے باہر نکلیں تو میرے پر طلاق۔ اب اگر بیوی کسی سے گفتگو کرتی ہے یا شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر جاتی ہے تو طلاق واقع نہیں ہو گی۔ اسے ابن قیمؒ نے شافعی مسلک کے بعض ائمہ سے نقل کیا ہے پھر اس پر کلام کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"یہ قول دراصل فقہی نوعیت کا ہے جس کی تائید امام مالکؒ سے امام احمدؒ کے اصول فقہ سے ہوتی ہے"

اس کے بعد امام موصوف نے ایک لمبی بحث کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ امام مالک اور امام احمد کے اصول فقہ سے یہی مستنبط ہوتا ہے۔

۴۔ جس نے طلاق کے ذریعہ قسم کھائی اس کی قسم لغو سمجھی جائے گی۔ یا اگر کسی نے قسم کھائی اور وہ حانث ہو گیا تو اس کی طلاق بھی واقع نہیں ہو گی اور وہ حانث بھی نہیں ہو گا ابن قیمؒ اعلام الموقعین میں لکھتے ہیں

"یہ سلف وخلف کا پسندیدہ مذہب ہے جیسے حضرت علی کرم اللہ وجہ جیسے جلیل القدر صحابی کی تائید حاصل ہے اور بعض فقہاء مالکیہ اور اہل ظاہر کی رائے تو یہ ہے کہ اس میں کسی صحابی کا بھی اختلاف منقول نہیں۔ یہ الفاظ ابو قاسم الیمنی کے ہیں جو احکام عبدالحق میں منقول ہیں۔ اور ان سے پہلے ابو محمد ابن حزم کی بھی رائے یہی تھی جس کی تائید طاؤس جیسے جلیل القدر تابعی نیز ابن عباسؓ کے بعض قابل قدر اصحاب بھی کر چکے ہیں"۔

علامہ عبدالرزاق اپنی ایک تصنیف میں لکھتے ہیں:

"ہمیں باخبر کیا ابن جریج نے وہ کہتے ہیں ہمیں بتایا طاؤس نے اپنے والد کے واسطے سے وہ کہا کرتے تھے کہ طلاق کے ذریعہ سے قسم کھانا کوئی معنی نہیں رکھتا ہے۔ واضح رہے کہ اس رائے کا اظہار وہ شخص کر رہا ہے جس کا شمار کبار تابعین میں ہوتا ہے اور جس کی تائید میں چار سو سے زائد علماء ہیں اور علماء بھی ایسے جو کتاب وسنت کے ماہرین میں شمار کئے جاتے ہیں ان علماء کی آخری کڑی میں علامہ ابو محمد ابن

حزم جیسے لوگ ہیں"۔

بعض علمار کا یہ بھی خیال ہے کہ طلاق کے ذریعہ قسم کھانا یمین لغو میں نہیں آتا اس کی شرعی حیثیت ہو جاتی ہے اور حانث کو کفارہ ادا کرنا پڑتا ہے اس کا کفارہ وہی ہے جسے قرآن نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے۔

اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ۖ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ (المائدہ: ۸۹)

(قسم توڑنے کا) کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو اوسط درجہ کا کھانا کھلاؤ جو تم اپنے بال بچوں کو کھلاتے ہو یا انھیں کپڑے پہناؤ یا ایک غلام آزاد کر دو اور جو اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو وہ تین دن کے روزے رکھے)

لیکن جہاں تک طلاق کا تعلق ہے وہ واقع نہیں ہوگی کفارہ اور طلاق کے وقوع میں کوئی تعلق نہیں اگر کفارہ ادا نہیں کرتا تو گنہگار ہوگا اور اگر ادا کر دیتا ہے تو بری الذمہ ہو جاتا ہے۔

ان تفصیلات کو نظر میں رکھئے۔ دیکھئے اسلام نے رشتہ زوجیت کو کس طرح مضبوط اور مستحکم بنا دیا ہے جسے کسی پاگل کی بڑ یا کسی مجنوں کی بکواس ختم نہیں کر سکتی ہے۔ یہ عورت کو اپنے بال بچوں اور شوہر کے درمیان رہنے کے لئے نہایت باعزت مواقع فراہم کرتا ہے اور یہ رشتہ اس وقت تک ختم نہیں ہوتا جب تک دونوں کی معاشرتی زندگی میں تلخی نہ آجائے۔

طلاق کے قواعد

اسلام الجھے ہوئے مسائل کو حکمت اور صبر کے ساتھ حل کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اگر لوگ اس کے بتائے ہوئے طریقے پر چلیں اور اس کی تعلیمات کو مان لیں تو طلاق کے حادثات کم سے کم تر ہو جائیں اور نکاح ایک مضبوط اور پائیدار رشتہ بن جائے۔ اختلافات کا آغاز یا تو شوہر کی جانب سے ہوتا ہے یا بیوی

کی جانب سے یا ان دونوں ہی کا اس میں تھوڑا بہت حصہ ہوتا ہے۔ اگر ابتدا بیوی کی جانب سے ہو رہی ہو اور شوہر اسے دبانے کی کوشش کر رہا ہو تو ایسی بیوی قرآن کی اصطلاح میں "نَاشِزٌ" (سرکش) ہے اور اگر اس کے برعکس ہو تو شوہر "ناشز" ہوگا لیکن اگر اختلافات دونوں طرف سے یکساں ہو تو اسے قرآن کی اصطلاح میں "شقاق" کہتے ہیں۔

اسلام نے ان تینوں خرابیوں کا علاج بتایا ہے اور ایک صلح پسند کی طرح سے نہایت اعلیٰ درجہ کی حکمت اور دانائی کے ساتھ انھیں حل کرنے کی کوشش کی ہے ذیل میں ہم اسی اجمال کی تفصیل کریں گے۔

۱۔ بیوی کا نشوز

نشوز ایسی حالت کو کہتے ہیں جس میں شوہر یا بیوی میں سے کوئی ایک دوسرے سے متنفر ہوگیا ہو بیوی کے ناشز ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ شوہر کے قابو سے باہر ہوگئی ہو۔ اور اس کے حقوق پامال کرنے لگے۔

قرآن کریم نے اس مرض کے علاج کی درج ذیل تدبیریں بتائی ہیں۔

۱۔ شوہر اسے شفقت و محبت سے نصیحت کرے۔ اس کی غلطیوں کو نہایت حکیمانہ انداز میں اس پر واضح کرے۔ اسے بتائے کہ تمہاری یہ روش اللہ تعالیٰ کو بھی ناپسند ہے اور اس کا انجام بھی بہتر نہیں ہوتا مثالوں کے ذریعہ سے اسے اچھی بیویوں کی روش پر چلنے کی تلقین کرے۔

اس طرح کے معاملات میں شوہر کو نہایت حکمت و بصیرت سے کام لینا چاہیئے۔ وقفہ وقفہ سے اسے نصیحت کرے اور ایسے وقت میں کرے جب وہ اس کے لئے بالکل تیار اور آمادہ ہو اس سے بہت ممکن ہے کہ وہ اس کی باتوں کا خاطر خواہ اثر قبول کرے اور ایک خاندان تباہ ہونے سے بچ جائے۔

۲۔ شوہر اگر نصیحت کرتے کرتے عاجز آجائے اور اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ برآمد ہو تو اسلام اسے

دوسرا طریقہ یہ بتاتا ہے کہ وہ اسے سزا دے۔ سزاؤں کی ترتیب یہ ہے کہ پہلے تو وہ اس کی خوابگاہ سے الگ ہو جائے۔ اپنا بستر الگ کرے اس سے لاپرواہی برتے۔ اس کے پاس نہ جائے۔ اور اپنی حرکات وسکنات سے بیوی کو یہ احساس دلادے کہ وہ اس سے سخت خفا ہے۔ اس سے اس کے نسوانی غرور پر چوٹ پڑے گی اور ممکن ہے کہ وہ اپنی اس بغاوت سے باز آجائے۔ کیوں کہ وہ سب کچھ برداشت کرسکتی ہے لیکن اپنی نسوانیت کی توہین کبھی برداشت نہیں کرسکتی جب اسے اپنی اس ذلت کا احساس ہو جائے گا تو غیر ممکن ہے کہ اپنی روش پر اڑی رہے۔

۳۔ اگر شوہر اس طریقے سے اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے تو بہتر ہے۔ لیکن اگر یہ طریقہ بھی کارگر ہوتے ہوئے نہ دیکھے تو ڈانٹ ڈپٹ کے ساتھ پٹائی بھی کرے لیکن یہ خیال رہے کہ ایسی پٹائی نہ کرے جو اس کے جسم پر نشان چھوڑ جائے ایسی پٹائی ہو جس سے صرف وقتی تکلیف ہو۔

یہ وہ طریقے ہیں جنھیں عورت کے نشوز کے مقابلہ میں اسلام نے مرد کو اختیار کرنے کی ہدایت کی ہے لیکن اس میں حکمت سے کام لینا چاہیے اور صبر کے ساتھ اس کے نتائج کا انتظار کرنا چاہیے۔ اگر اس کے نتیجہ میں عورت اپنا نشوز ختم کردیتی ہے تو شوہر کو چاہیے کہ پہلے کی طرح سے شفقت ومحبت کے ساتھ اپنی معاشرت برقرار رکھے اور اگر اس کے برخلاف معاملہ ہو تو دونوں کا الگ ہو جانا ہی بہتر ہے۔ واضح رہے کہ یہ تمام تفصیلات مندرجہ ذیل آیت قرآنی سے مستنبط ہیں۔

وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَیْهِنَّ سَبِیْلًا ۚ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیًّا كَبِیْرًا

(النساء: ۳۴)

(اور جن عورتوں سے تمہیں سرکشی کا اندیشہ ہو انھیں سمجھاؤ، خواب گاہوں میں ان سے علیحدہ رہو اور مارو پھر اگر وہ تمہاری مطیع ہو جائیں تو خواہ مخواہ ان پر دست درازی کے بہانے تلاش نہ کرو یقین

رکھو کہ اوپر اللہ موجود ہے جو بڑا اور بالاتر ہے۔

ایک خاص بات جسے اس مقام پر ایک حساس قاری فوراً نوٹ کرتا ہے وہ یہ ہے کہ ایسے موقع پر اسلام نے طلاق کا ذکر اشارۃً وکنایۃً بھی نہیں کیا ہے۔ بلکہ آدمی کو اس بات کی ہدایت کی ہے کہ اس معاملہ کو کمال درجہ حکمت و دانائی کے ساتھ سلجھانے کی کوشش کرو وہ انھیں سمجھانے اور منانے کی تلقین کرتا ہے خوابگاہوں سے علیحدہ رہنے کا حکم دیتا ہے اور اگر اس سے بھی کوئی فائدہ نہ ہو تو ہلکی مار کی تعلیم دیتا ہے۔ لیکن اس کے بعد بھی وہ انھیں طلاق دینے کے لئے نہیں کہتا بلکہ یہ کہتا ہے کہ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا اس سے اسلامی معاشرے کی عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

خُلع

ایسی ناچو نشان نہ چھوڑے۔ یہ وہ آخری مقام ہے جہاں پہونچ کر مرد رک جاتا ہے۔ اب اس کے بعد کوئی اور چارۂ کار باقی نہیں رہتا جسے اپنا کر شوہر اپنی بیوی کے نشوز کا علاج کر سکے۔ اس مقام پر پہونچ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام اب اس کے بعد کیا ہدایت دیتا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس نے اس کے بعد بھی طلاق کی ہدایت نہیں کی ہے۔ اب اگر بیوی واقعی قابو سے باہر ہو رہی ہے اور اس کے ساتھ رہنے پر رضامند نہیں ہے اور یہ بات کھل کر سامنے آگئی ہے کہ شوہر کے حقوق کی ادائیگی اس کے بس سے باہر ہے تو اسلام عورت کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ اپنے شوہر سے الگ ہو جانے کا مطالبہ کرے۔ جس کے انجام کی ذمہ دار وہ خود ہوگی۔

ایک سوال جو یہاں پوچھا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ شوہر جس نے بیوی کے اوپر اپنا مال خرچ کیا ہے اس کے اخراجات کو برداشت کیا ہے وہ اتنی آسانی کے ساتھ کیسے دست بردار ہو سکتا ہے؟

اس لئے انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ بیوی نے مہر کی حیثیت سے جو مال شوہر سے لیا ہے وہ اسے لوٹا دے۔
عورت مال کی کتنی مقدار دے کر خلع حاصل کر سکتی ہے اس باب میں علماء کا اختلاف ہے
بعض علماء کا خیال ہے کہ مقدار خلع مقدار مہر ہے اور بعضوں نے اس سے زیادہ لینے کی بھی اجازت دی ہے۔

خلع کے دلائل

خلع کا استنباط قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیت کریمہ سے کیا گیا ہے:
وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ
اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا
جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ (البقرہ: ۲۲۹)

(تمہارے لئے حلال نہیں ہے کہ جو کچھ تم بیویوں کو دے چکے ہو اس میں سے کچھ بھی واپس لو الا یہ کہ میاں بیوی کو یہ خوف ہو کہ اللہ کے حدود پر قائم نہ رہ سکیں گے تو ایسی صورت میں جب کہ تم کو خوف ہو کہ میاں بیوی اللہ کے حدود پر قائم نہ رہ سکیں گے تو کچھ مضائقہ نہیں اگر عورت کچھ معاوضہ دے کر عقد نکاح سے آزادی حاصل کر لے)

خلع کا سب سے پہلا مقدمہ جو اللہ کے رسول کی عدالت میں پیش ہوا وہ جمیلہ بنت سلول کا واقعہ ہے انھوں نے اپنے شوہر ثابت ابن قیسؓ کو کچھ آدمیوں کے ساتھ آتے ہوئے دیکھا تو وہ انھیں بہت بدصورت اور بھدے لگے اور ان کے دل میں ان کے لئے تنفر پیدا ہو گیا۔ عبد اللہ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے اس واقعہ کے بعد اللہ کے رسول کے پاس آکر درج ذیل بیان دیا:
واللہ ما کرھت منہ دینا ولا خلقا الا انی کرھت دمامتہ (ابن جریر)
(خدا کی قسم میں دین یا اخلاق کی کسی خرابی کی وجہ سے ان کو ناپسند نہیں کرتی بلکہ مجھے ان کی بدصورتی ناپسند ہے)

نبیؐ نے یہ شکایت سنی اور فرمایا "اتردین علیہ حدیقتہ" جو باغ اس نے تجھ کو مہر میں دیا تھا اس کو واپس کر دو گی؟ انھوں نے عرض کیا ہاں! اے اللہ کے رسول۔ اس پر آپ نے فیصلہ فرمایا کہ ثابت کو اس کا باغ واپس کر دو اور ثابت سے کہا کہ تم اسے ایک طلاق دے دو۔

امام قرطبی مسئلہ کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کہا جاتا ہے کہ ثابت کی بیوی انھیں انتہائی ناپسند کرتی تھیں اور یہ اس سے انتہائی محبت کرتے تھے۔ اس مقدمہ پر اللہ کے رسول نے دونوں کے درمیان خلع کے ذریعہ تفریق کر دی اور یہ حکومت اسلامی میں خلع کا پہلا واقعہ تھا۔" آگے لکھتے ہیں:

"خلع کی بنیاد دراصل یہی حدیث ہے جمہور فقہاء نے اس باب میں اپنے استدلال کی بنیاد اسی حدیث کو بنایا ہے۔"

"امام مالکؒ فرماتے ہیں" ہمارے نزدیک یہ ایک متفق علیہ مسئلہ ہے جسے میں اہل علم سے مسلسل سنتا آرہا ہوں یعنی یہ کہ اگر مرد نے عورت کو کوئی نقصان نہ پہونچایا ہو اور نہ اس کے ساتھ کوئی بد سلوکی کی ہو اس کے باوجود وہ اپنے شوہر سے جدا ہونا چاہتی ہو تو شوہر کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنا دیا ہوا مال اس سے واپس لے لے اور اسے آزاد کر دے جیسا کہ نبی کریمؐ نے ثابت بن قیس کی بیوی کے سلسلہ میں کیا۔"

ابن قدامہ نے اپنی کتاب المغنی میں اسی مسئلہ پر بحث کی ہے ان کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ عورت جب اپنے شوہر کو اس کی صورت یا سیرت یا کسی بھی وجہ سے ناپسند کرے یا اسے شوہر کی اطاعت میں حقوق الٰہی کے پامال ہونے کا اندیشہ ہو تو اسے خلع کی اجازت دی جائے گی جس کے ذریعہ وہ کچھ مال دے کر اپنے آپ کو شوہر سے آزاد کرائے گی۔ اس کی دلیل مندرجہ ذیل آیت ہے۔

فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ

بِهِ

مسئلہ خلع میں قاضی کے اختیارات

قاضی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسباب خلع کی گہرائی کے ساتھ چھان بین کرے کہ عورت کے دل میں شوہر کے لئے کس حد تک نفرت و کراہیت موجود ہے اور اس کے تدارک کی کوئی شکل ہو سکتی ہے یا نہیں...؟

ابن کثیر اس سلسلہ کے ایک واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

حضرت عمرؓ کے سامنے ایک عورت نے اپنا مقدمہ پیش کیا۔ اس نے بتایا کہ وہ اپنے شوہر کو ناپسند کرتی ہے۔ اور اس کے ساتھ رہنے پر کسی طرح رضا مند نہیں ہے۔ آپ نے عورت کو نصیحت کی اور شوہر کے ساتھ رہنے کا مشورہ دیا۔ عورت نے قبول نہ کیا۔ اس پر آپ نے اسے ایک کوٹھری میں بند کر دیا جس میں کوڑا کرکٹ بھرا ہوا تھا ایک رات قید رکھنے کے بعد آپ نے اسے نکالا اور پوچھا بتاؤ آج کی رات کیسی گزری؟ اس نے کہا خدا کی قسم اپنے شوہر کے یہاں جانے کے بعد سے اتنی اچھی نیند مجھے کبھی نہیں آئی یہ سن کر حضرت عمرؓ نے اس کے شوہر کو بلا تاخیر طلاق دینے کا حکم دیا "اخلعها ولو من قرطها" (اس کو خلع دیدو خواہ اس کے کان کی بالیوں کے عوض ہو۔)

اس واقعہ کو پیش کرنے سے ہمارا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر وہ عورت جو خلع کا مقدمہ پیش کرے اسے لازماً کوٹھری میں قید کر دینا چاہئے۔ حضرت عمرؓ کا یہ حکم دراصل اس کی بدویانہ زندگی کے پیش نظر تھا۔ متمدن علاقوں میں اس طرح کا کوئی حکم نہیں دیا جائے گا البتہ حضرت عمرؓ کے اس فیصلہ سے استنباط کرتے ہوئے ہم یہ ضرور کہیں گے کہ قاضی شرع کے اوپر ان معاملات کی تحقیق ناگزیر ہے۔ اپنی بصیرت اور بصارت سے کام لیتے ہوئے وہ اس کی مشکلات کا اندازہ کرے اور پھر فیصلہ صادر کرے۔ البتہ اس سلسلہ میں عورت کی فطرت اور اس کے جذبات کا خیال رکھنا بھی ضروری ہوگا کیوں کہ ایک چیز جو بادی النظر

میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی وہی جب کسی کے ساتھ روز روز پیش آتی ہے تو اس کے لئے وہی چیز عذابِ جان ثابت ہوتی ہے۔

شوہر کا نشوز

اگر بغاوت یا سرکشی شوہر کی جانب سے ہو رہی ہو تو عورت کو بھی نہایت حکمت اور بصیرت کے ساتھ کام لینا چاہیئے اور نہایت شفقت و دانائی کے ساتھ اس کی نفرت کے اسباب کا پتہ لگانا چاہیئے اور ہر ممکن طریقے سے اس کی نفرت ختم کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے اگر اس سلسلہ میں کسی ذہنی، مالی یا جسمانی قربانی کی بھی ضرورت پڑے تو اس سے گریز نہ کرے کیوں کہ شوہر کا احترام ایک عورت کے لئے خدا کے بعد سب سے بڑھ کر ہے۔

معاشرتی زندگی میں بحران کیوں آتا ہے؟ شوہر کی نفرت کے اسباب کیا کیا ہو سکتے ہیں؟ ان کی تفصیلات میں جانے کا نہ تو کوئی فائدہ ہے اور نہ ضرورت۔ اس مقام پر صرف یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ عورت کی تمام مشکلات کا حل صرف یہ ہے کہ وہ تمام معاملات کو خوش اسلوبی سے انجام دے۔ شوہر کے جذبات کا خیال رکھے۔ اس کے لئے نہایت حساس رہنے کی ضرورت ہے کیوں کہ بیوی کے سامنے اپنی پسند و ناپسند کو بیان کرنا شوہر کی انانیت کے خلاف ہوتا ہے اس لئے بیوی کو صرف آنکھوں کے سہارے دل میں جھانک لینے کی مہارت پیدا کرنی چاہیئے۔ کبھی کبھی عورت اپنے شوہر کا مطالعہ کرنے میں سخت غلطی کرتی ہے جس سے اس کی خانگی زندگی کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ اس موقع پر امہات المومنین حضرت سودہ بنت زمعہؓ کا واقعہ قابلِ ذکر ہے۔ انھوں نے جب نبی کریمؐ کی نگاہوں میں اپنے لئے کچھ بے التفاتی کی جھلکیاں محسوس کیں اور یہ اندازہ لگالیا کہ آپ انھیں طلاق دینے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ تو اس پر انھوں نے نبی کریمؐ کے سامنے جا کر اس بے التفاتی کا سبب نہیں دریافت کیا بلکہ ان کے

نسائیت نے ان جذبات کو محسوس کرلیا اور سمجھ گئیں کہ آپ کی یہ لاپرواہی اور بے التفاتی ان کے اندر کسی عیب کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ معاملہ کچھ اور ہے اور وہ یہ کہ وہ عمر کے اعتبار سے ازواج نبیؐ میں سب سے بڑی ہیں جس کی وجہ سے وہ وظیفۂ زوجیت ذرا بہتر طریقہ سے نہیں ادا کرپاتی ہیں اس وجہ سے آپ انھیں چھوڑنا چاہتے ہیں۔ یہ خیال کرکے وہ آگے بڑھیں اور نبیؐ کے پاس جاکر خود عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول میں بوڑھی ہوچکی ہوں اور وظیفہ زوجیت کے قابل نہیں رہ گئی ہوں میں اپنی باری کے دن آپ کی چہیتی بیوی عائشہؓ کو دیتی ہوں، میری اس کے علاوہ اور کوئی خواہش نہیں ہے کہ قیامت کے دن جب میں اٹھائی جاؤں تو آپ کی بیویوں میں میرا بھی نام ہو۔ مندرجہ ذیل آیت حضرت سودہ بنت زمعہؓ کی تعریف میں نازل ہوئی ہے :

وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ۭ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ۭ وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ۭ وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا

(النساء: ۱۲۸)

(اگر کسی عورت کو اپنے شوہر سے بدسلوکی یا بے رُخی کا خطرہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں کہ میاں اور بیوی (کچھ حقوق کی کمی بیشی پر) آپس میں صلح کرلیں، صلح بہر حال بہتر ہے، نفس تنگ دلی کی طرف جلد مائل ہوجاتے ہیں لیکن اگر تم لوگ احسان سے پیش آؤ اور خدا ترسی سے کام لو تو یقین رکھو کہ اللہ تمہارے اس طرز عمل سے بے خبر نہ ہوگا)

آیت مندرجہ بالا کے مطالعہ سے ایک عقل مند شخص فوراً یہ بات محسوس کرے گا کہ اسلام نے عورت کو اپنا معاملہ خود حل کرنے کا جہاں اختیار دیا ہے وہاں صلح کا ذکر تکرار کے ساتھ کیا ہے گویا وہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ خانگی معاملات میں آپسی صلح و مصالحت بہتر ہے چنانچہ فرمایا :

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ۭ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ (النساء: ۱۲۸)

اختلاف بین الزوجین

یہ ایک تیسری حالت ہے جسے ہم نشوز سے تعبیر نہیں کر سکتے کیوں کہ نشوز اس حالت کو کہتے ہیں جس میں شوہر یا بیوی میں سے کوئی ایک دوسرے پر زیادتی کر رہا ہو۔ اس نشوز کے مقابلہ میں دونوں کا ایک دوسرے کے ساتھ کیا رویہ ہو اس کی وضاحت ہم گذشتہ صفحات میں کر چکے ہیں۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر تنفر اور کراہت کے جذبات دونوں طرف موجود ہوں تو اس کو ختم کرنے کی اسلام کیا ترکیب بتاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں کو اپنی حالت پر تو چھوڑا نہیں جا سکتا کہ وہ جو چاہیں کریں۔

قضائے شرعی

المغنی کے مصنف لکھتے ہیں:

"اگر زوجین میں اختلاف ہو جائے تو حاکم معاملہ کی اچھی طرح تحقیق کرنے کے بعد ہی کوئی فیصلہ کرے گا اگر یہ ظاہر ہو کہ قصوروار بیوی ہے تو گویا بیوی ناشزہ ہوگی اس صورت میں وہ کیا طرز عمل اختیار کرے اس کا ذکر گزر چکا ہے۔ لیکن اگر تحقیق و تفتیش کے بعد یہ معلوم ہو کہ خطا شوہر کی ہے تو وہ اس کا کوئی ایسا حل نکالے گا جس سے وہ بیوی کو شوہر کی زیادتیوں سے بچا سکے۔ اور اگر ان دونوں صورتوں کے برعکس معاملہ یہ سمجھ میں آئے کہ ظلم کا صدور دونوں کی جانب سے ہو رہا ہے دونوں اس طرح کا دعویٰ کریں کہ دوسرا فریق ہمارے اوپر ظلم کر رہا ہے تو ایسی صورت میں قاضی اس معاملہ کو دونوں کے سرپرستوں کے سپرد کر دے گا کہ وہ اچھی طرح سوچ سمجھ کر دونوں کو انصاف دلائیں۔ اب اگر اس کے باوجود دونوں کے سلسلہ میں ظلم و شقاق کا اندیشہ ہو اور یہ خوف ہو کہ یہ حدود الٰہی کو پامال کرنا شروع کر دیں گے تو قاضی فریقین کے خاندان سے ایک

ایک حکم کا انتخاب کر کے بھیجے گا تاکہ وہ دونوں کو مطمئن کر سکیں"۔

(کتاب المغنی لابن قدامہ ج ۷، صہ ۱۸)

اس سے واضح ہوتا ہے کہ علماء اسلام نے کس قدر دقت نظر سے کام لیتے ہوئے مسائل کا استنباط کیا ہے۔ وہ خاندان کی شیرازہ بندی کا آخری موقع بھی ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتے ہیں اور آخری شکل یہ نکالتے ہیں کہ اگر میاں بیوی خود مصالحت کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں تو دونوں خاندانوں کے سرپرست مل کر انھیں سمجھائیں تاکہ ایک بھرا پرا گھر اجڑنے سے بچ جائے۔ پھر مصالحت نہ ہونے کی صورت میں وہ شوہر سے یہ نہیں کہتا ہے کہ بیوی کو کسی ایک گوشہ میں بٹھا دیں کیوں کہ یہ چیز کبھی کبھی بڑی مشکلات پیدا کر سکتی ہے۔ وہ قاضی وقت کو معاملہ کی تفتیش اور چھان بین کا حکم دیتا ہے' اور فریقین کو اس طرح سے سمجھانے کا مشورہ دیتا ہے جوان کے قلب سے ہم آہنگ ہو سکے پھر معاملہ اگر سمجھانے بجھانے کی حد سے بھی آگے بڑھ جائے تو وہ زوجین کے خاندانوں میں سے دو سرپرستوں کا انتخاب کر کے بھیجے گا جو دونوں کے حالات کا مطالعہ کریں گے اور اس علت العلل کو تلاش کریں گے جس کی وجہ سے ان کے درمیان لڑائی شروع ہوئی ہے پھر وہ انھیں نصیحت کریں گے ایسی اختلافات کے نتائج کی آگاہ کریں گے اور نہایت محبت و دلسوزی کے ساتھ وہ انھیں ازدواجی زندگی صحیح ڈھنگ سے گذارنے کا مشورہ دیں گے پھر اگر وہ اسے ماننے کے لئے تیار ہو جائیں گے تو اللہ تعالیٰ انھیں اپنی اصلاح کی توفیق عنایت فرمائے گا۔ آیت مندرجہ ذیل اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے:

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ
حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ۚ
اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا

(النساء ۳۵)

(اور اگر تم لوگوں کو کہیں میاں بیوی کے تعلقات بگڑ جانے کا اندیشہ ہو تو ایک حکم مرد کے رشتہ داروں میں سے اور ایک عورت کے رشتہ داروں میں سے مقرر کرو وہ دونوں اصلاح کرنا چاہیں گے تو اللہ ان کے درمیان موافقت کی صورت نکال دے گا اللہ سب کچھ جانتا اور باخبر ہے۔)

سرپرستوں سے صلح کرانے کی درخواست کبھی تو حاکم وقت خود کرے گا اور کبھی دوست، رشتہ دار اور قرابت داروں کی درخواست پر وہ اس نیک کام کو انجام دے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ خاندان کی شیرازہ بندی کرنے اور انھیں صلح پر آمادہ کرنے کا یہ نہایت موثر ذریعہ ہے اور اگر صلح کرانے کا یہ جذبہ خلوص کے ساتھ ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ صلح نہ ہو سکے۔

فرانس میں بھی زوجین کے درمیان مصالحت کروانے کے لئے اسی طرح کا قانون بنایا گیا ہے جس میں قاضی زوجین کے خاندان میں سے دو اہم شخصیتوں کا انتخاب کر کے ان کے درمیان صلح کرانے کے لئے بھیجتا ہے، لیکن اسلام کے اصول وضوابط اس سے بھی زیادہ مضبوط اور مکمل ہیں جن کے ذریعہ سے اختلافات کے باوجوہ واسباب کا بآسانی پتہ چلایا جا سکتا ہے۔ مندرجہ ذیل آیت ایک سلیم الطبع شخص کے لئے غور وفکر کا دروازہ کھولتی ہے:

اِنْ یُّرِیْدَآ اِصْلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰہُ بَیْنَھُمَا

واضح رہے کہ یہاں صرف مسئلہ کے مثبت پہلو کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یعنی یہ نہیں کہا گیا ہے کہ اگر وہ دونوں اصلاح نہ کرنا چاہیں تو جدا ہو جانا بہتر ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسلام خانگی امن وسکون کا کس قدر خواہشمند ہے اور افتراق وانتشار سے کس قدر شدید نفرت کرتا ہے۔

اس مقام پر ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ بعض علماء کرام آیت کریمہ اِنْ یُّرِیْدَآ اِصْلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰہُ بَیْنَھُمَا کو خالص روحانی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ اگر صلح کرانے والوں کی نیت ٹھیک ہو اور وہ صلح کرانے کے خواہشمند بھی ہوں تو یہ آیت دراصل اس بات

کا وعدہ ہے کہ مصالحت ضرور ہو جائے گی۔ علامہ زمخشری رقم طراز ہیں:

"اگر صلح کرانے والے فریقین کے درمیان اصلاح کی نیت رکھتے ہوں ان کی نیت درست ہو' دل میں خلوص اور خیر خواہی کے جذبات ہوں، تو اللہ تعالیٰ ان کے کام میں برکت عطا فرمائے گا اور ان کے مصالحت کی اس کوشش کو قبول فرما کر دونوں کے درمیان الفت و محبت کی راہ ہموار کرے گا اور ان کے تعلقات درست فرمائے گا۔"

اس مقام پر خاص طور سے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا واقعہ قابل ذکر ہے انھوں نے زوجین کے درمیان صلح کرانے کے لئے دو حکم بھیجے وہ دونوں اپنی سی کوشش کرنے کے بعد واپس لوٹے اور عرض کیا، امیر المومنین ہم دونوں صلح کرانے میں ناکام رہے اس پر آپ سخت غصہ ہوئے اور فرمایا: تم دونوں نے جھوٹ کہا صحیح بات یہ ہے کہ تم دونوں کے دل میں صلح کرانے کا سچا جذبہ نہیں تھا کیوں کہ اگر تمہارا جذبہ صادق ہوتا تو اللہ تعالیٰ تمہارے اس کام میں برکت عطا فرماتا اور تم ناکام واپس نہیں آتے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنْ یُّرِیْدَآ اِصْلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰہُ بَیْنَہُمَا۔

اور واقعہ یہ تھا کہ حضرت عمرؓ کی یہ بات صد فیصد درست تھی چنانچہ وہ دونوں نادم ہوئے اور واپس جا کر پھر صلح کرانے کی کوشش شروع کر دی چنانچہ دوسری بار وہ کامیاب ہوئے اور زوجین کے درمیان مصالحت ہو گئی۔

طلاق کے شرعی ضوابط

گذشتہ صفحات میں ہم نے میاں اور بیوی کے درمیان پیدا ہونے والے اختلافات کا اسلامی حل پیش کیا ہے۔ اب اسی مسئلہ کے دوسرے پہلو پر بھی غور کیجئے۔ فرض کر لیجئے کہ اگر دونوں کے درمیان اختلافات کی دیواریں اس قدر وسیع ہو جاتی ہیں کہ اس کو گرانا ان کے بس میں نہیں رہتا اور خانگی زندگی

کے مسلسل تلخ تجربوں نے یہ بات ثابت کر دی کہ ان دونوں کا ایک ساتھ رہنا ناممکن ہے تو ایسی صورت میں دونوں کو اسلام کیا حکم دیتا ہے؟

کیا اس کا حل طلاق ہے؟

جی ہاں! اس کا واحد حل طلاق ہے۔

مگر یہ طلاق کب دی جائے اس کے اصول وضوابط کیا ہوں؟ ہمارے اکثر بھائی نہیں جانتے انھیں نہیں معلوم کہ کس وقت طلاق دینا حلال ہے اور کس وقت حرام۔

اسلام نے اس کے لئے درج ذیل اصول بنائے ہیں:

۱۔ حائضہ عورت کو طلاق دینا جائز نہیں ہے۔

۲۔ طہر کی حالت جس میں دونوں مباشرت کر چکے ہوں اس میں بھی طلاق دینا صحیح نہیں ہے۔

مندرجہ بالا دونوں قواعد اللہ تعالیٰ کے اس قول سے مستنبط کئے گئے ہیں۔

يَآيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ

(الطلاق: ۱)

(اے نبیؐ جب تم لوگ عورتوں کو طلاق دو تو انھیں ان کی عدت کے لئے طلاق دیا کرو۔)

اس آیت کی تفسیر اللہ کے رسول کا وہ مشہور فیصلہ ہے جو آپ نے حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے سلسلہ میں فرمایا جب انھوں نے اپنی بیوی کو حالت حیض میں طلاق دے دی تھی۔ آپ کو معلوم ہوا تو آپ سخت غصہ ہوئے اور فرمایا کہ لیراجعها ثم یمسکها حتی تطہر الخ اسے چاہئے کہ وہ مراجعت کرے اور پھر اسے روکے رہے تا آنکہ وہ پاک ہو جائے پھر حائضہ ہو پھر پاک ہو پھر اس کے بعد اگر مباشرت سے پہلے طہر کی حالت میں اسے طلاق دے تو یہی اس کی وہ عدت ہوگی جس کا حکم اللہ نے اپنے قول میں دیا ہے۔ پھر آپ نے فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ والی

آیت پڑھی۔

صنعانی اپنی کتاب سبل السلام میں حدیث شریف "حتیٰ تطہر ثم تحیض ثم تطہر" پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ شوہر پہلے طہر میں نہیں بلکہ دوسرے طہر میں طلاق دے گا اس طرح عدت کا شمار گویا اس طہر سے کیا جائے گا جس میں ہم بستری نہ کی گئی ہو اس لحاظ سے فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ کا مفہوم یہ ہوگا کہ اپنی بیویوں کو ایسے طہر میں طلاق دو جس میں تم نے ان سے ہم بستری نہ کی ہو، واضح رہے کہ لِعِدَّتِهِنَّ اصل میں فِي عِدَّتِهِنَّ کے مفہوم میں ہے۔

شریعت مطہرہ کا یہ قانون دراصل اپنے دامن میں حکمت و دانائی کے بیش بہا جواہر چھپائے ہوئے ہے جن میں سے بعض کا تذکرہ فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

طلاق کو نافذ کرنے میں اس قدر تاخیر سے کام لینے کی پہلی حکمت یہ ہے کہ شاید اس مدت میں میں محبت و یگانگت کی وہ فضا استوار ہو جائے جس کی توقع اس سے پہلے دور دور تک نہیں کی جاسکتی تھی۔

پھر عورت کا معاملہ ہمیشہ دو حالتوں میں رہتا ہے یا تو حائضہ ہوتی ہے یا پھر طہر کی حالت میں اب اگر شوہر اسے حالت حیض میں طلاق دیتا ہے تو اس کی طلاق حرام ہوگی اور اگر حالت طہر میں اس وقت دیتا ہے جب کہ وہ اس سے جماع کر چکا ہے تو یہ طلاق بھی حرام ہی کے ضمن میں آتی ہے۔ اس طرح شوہر کو مکمل دو حیض اور ایک طہر کی مدت کا انتظار کرنا پڑتا ہے جو تقریباً ایک ماہ کے طویل عرصہ پر مشتمل ہوتا ہے اس دوران عین ممکن ہے کہ حالات کچھ ایسے پیدا ہو جائیں جو اسے اپنی رائے بدلنے پر مجبور کر دیں اور اسے طلاق دینے سے روک دیں یہی وجہ ہے کہ آیت کریمہ کا اختتام ایک ایسی آیت پر کیا گیا ہے جو ذہن انسانی میں امیدوں کی قندیلیں روشن کر دیتی ہے۔ لا تدری لعل الله یحدث بعد ذلك امرا۔

ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ آدمی جب اپنی بیوی کو طلاق دینے کا ارادہ کرتا ہے اور ایک مہینہ تک اس کا انتظار کرتا ہے کہ طہر آئے تو وہ اسے طلاق دے اور اس دوران اسے پتہ چلتا ہے کہ جس بیوی کو وہ طلاق دینے جا رہا ہے وہ تو حاملہ ہو چکی ہے اور اس کے بچہ کی ماں بننے والی ہے۔ تو اسے طلاق سے روکنے کا یہ بھی ایک موثر عامل بن جاتا ہے۔

اس کے برخلاف اگر وہ اسے فوری طور پر طلاق دے دیتا ہے اور بعد میں اس کا حمل ظاہر ہوتا ہے تو یہ چیز اس کے لئے پریشان کن بن جاتی ہے جو فرد کے لئے مذہبی اور معاشرتی دونوں لحاظ سے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔

طلاق سنت اور طلاق بدعت

علامہ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

"فقہائے کرام نے طلاق کے احکام کا استنباط مندرجہ بالا نصوص سے ہی کیا ہے اور یہیں سے انھوں نے اسے طلاق سنت اور طلاق بدعت میں تقسیم کیا ہے۔ چنانچہ طلاق سنت اصطلاح میں اس طلاق کو کہتے ہیں جو حالت طہر میں (بغیر جماع کے) یا حالت حمل میں دی جائے جب کہ حمل واضح ہو چکا ہو اور طلاق بدعت اس طلاق کو کہتے ہیں جو حالت حیض میں دی جائے یا اس طہر میں دی جائے جس میں ہم بستری ہو چکی ہو اور یہ پتہ نہ ہو کہ بیوی حاملہ ہے یا غیر حاملہ۔

بہت سے لوگ اسلام میں طلاق کی اس تقسیم سے ناواقف ہیں چنانچہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ بغیر سنت اور بدعت کی پرواہ کئے ہوئے طلاقیں دیتے ہیں اور حلال و حرام کی قطعاً پرواہ نہیں کرتے اس کی وجہ دراصل یہی ہے کہ انھیں یہ نہیں معلوم کہ طلاق دینا کب ان کے لئے جائز ہے اور کب ناجائز۔ مسلمانوں کے لئے یہ بڑی عبرت کا مقام ہے کہ ان کی اکثریت اسلام کی بنیادی معاشرتی احکام تک

سے ناواقف ہے ، ضرورت ہے کہ وہ ان تمام مسائل سے واقفیت حاصل کریں جن کا تذکرہ ہم طلاق کے ضمن میں کر چکے ہیں کیوں کہ اللہ تعالیٰ خود انھیں آیت طلاق میں متنبہ کرتا ہے کہ وہ اس کے مقرر کردہ حدود کو نہ توڑیں اور جو ایسا کرتا ہے وہ خود اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے ۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ لَا تَدْرِیْ لَعَلَّ اللّٰهَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا

(یہ اللہ کے مقرر کردہ حدود ہیں اور جو اللہ کی حدود سے تجاوز کرے گا وہ خود اپنے اوپر ظلم کرے گا تمہیں نہیں معلوم ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے بعد کوئی نئی راہ پیدا فرما دے ۔

مندرجہ بالا تفصیلات سے یہ بات معلوم ہو گئی ہو گی کہ طلاق بدعت شریعت میں حرام ہے البتہ اس کے وقوع پذیر ہونے اور عدم وقوع کے باب میں علماء کا اختلاف ہے ۔

ایک گروہ کا خیال ہے کہ طلاق بدعت گرچہ حرام ہے مگر یہ واقع ہو جاتی ہے ۔ ان کا خیال ہے کہ گرچہ اس فعل کا فاعل ایک حرام چیز کا ارتکاب کرتا ہے مگر یہ واقع ہو جاتی ہے ، رہا جزا و سزا کا سوال تو اس کا اختیار صرف اللہ کو ہے ۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ یہ طلاق واقع نہیں ہوئی اور وہ اپنے استنباط کی بنیاد اس حدیث پر رکھتے ہیں جس کی تخریج امام احمد ابو داؤد اور نسائی نے کی ہے جس میں آتا ہے کہ عبد اللہ ابن عمرؓ کے بیان کے مطابق اللہ کے رسول نے اسے رد کر دیا اور اس کو کالعدم قرار دے دیا ۔

ایک دوسری روایت میں ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ انھوں نے اپنی بیوی کو حالت حیض میں طلاق دی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ایک بے معنی شئے قرار دیا ۔

علامہ ابن عبد البرؒ فرماتے ہیں کہ " اس کی مخالفت سوائے اہل بدعت و ضلال کے اور کسی نے نہیں کی ہے ۔"

شوکانی نے نیل الاوطار میں مخالفین طلاق کی روایتوں کو موافقین طلاق کی روایتوں پر ترجیح دی ہے اور صنعانی نے بھی سبل السلام میں شوکانی کی تائید کی ہے۔ ان کی دلیل اس سلسلہ میں یہ ہے کہ طلاق بدعت کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے اور یہ فعل حکم الٰہی اور اذن خداوندی کے بغیر کیا جاتا ہے اس لئے اس طرح کا فعل مردود ہوگا جس پر کوئی شرعی حکم نہیں نافذ کیا جائے گا۔ اس کی دلیل آنحضورؐ کی یہ حدیث ہے: "من عمل عملا لیس علیہ امرنا فھو رد" دوسری دلیل اس سلسلہ میں وہ یہ دیتے ہیں کہ یہ چیز بدعت سے تعلق رکھتی ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے اور گمراہی پر کوئی حکم شرعی نافذ نہیں کیا جاسکتا اس لئے یہ طلاق واقع نہیں ہوگی بلکہ باطل ہو جائے گی۔

بہر حال ان اختلافات سے قطع نظر جب ہم طلاق کے متفق علیہ احکام و مسائل پر نظر دوڑاتے ہیں تو یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ اسلامی معاشرہ میں فرد کی معاشرتی زندگی کا تحفظ اور بقا، واستقرار جس پیمانے پر ہوتا ہے کوئی دوسرا معاشرہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ خدا تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ سیدھے اور سچے راستہ کی طرف ہماری رہنمائی کرے۔

آداب طلاق

سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر شوہر اپنی تمام کوششوں میں ناکام ہو جائے اور اسے طلاق دینا ہی پڑ جائے تو اس کا کیا طریقہ ہے؟ اس سلسلہ میں اللہ سبحانہٗ تعالیٰ کا یہ قول بنیادی حیثیت کا حامل ہے۔

الطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ (البقرہ: ۲۲۹)

(طلاق دو بار ہے پھر یا تو سیدھی طرح عورت کو روک لیا جائے یا بھلے طریقہ سے اسے رخصت کر دیا جائے)

مندرجہ بالا آیت کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ شرعی طلاق اس وقت مانی جائے گی جب کہ طلاق وقفہ وقفہ سے دی گئی ہو۔ آیت کے الفاظ بھی یہی بتا رہے ہیں کیوں کہ الطلاق مرتان کا مطلب ہے

مرۃ بعد مرۃ اور مرۃ کا لفظ کسی واقعہ کو صرف ایک دفعہ بتانے کے لئے آتا ہے۔ اس لئے آیت کا اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ رجعت کا حق شوہر کو صرف دو بار حاصل ہوتا ہے اس شرط کے ساتھ کہ وہ طلاقیں وقفہ وقفہ سے دے بعض علماء نے اس قول کی نسبت عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، عبداللہ ابن عباس، عبداللہ ابن مسعود، عبداللہ ابن عمر، عمران ابن حصین، ابوموسیٰ اشعریؓ، ابوالدرداء اور حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہم جیسے جلیل القدر صحابہ کی طرف کی ہے۔

اسی لئے ایک مجلس کی تین طلاقیں صرف ایک مانی گئیں ہیں جس پر زمانۂ رسولؐ، خلافت ابوبکرؓ نیز دو سال تک خلافت عمرؓ میں مسلسل عمل ہوتا رہا حضرت عمرؓ کا ارشاد گرامی ملاحظہ ہو:

ان الناس قد استعجلوا فی امر کان لہم فیہ اناۃ فلو امضینا علیہم فامضاہ علیہم

لوگوں نے ایک ایسے معاملہ میں جلدبازی مچائی ہے جس میں ان کے لئے نرمی رکھی گئی تھی اس لئے ہمارا خیال ہے کہ اسے نافذ کر دیا جائے چنانچہ یہ نافذ کر دی گئی۔

مطلب یہ ہے کہ جب حضرت عمرؓ کے زمانہ میں صورت حال یہ ہوگئی کہ لوگ شریعت کی نرمی سے ناجائز فائدہ اٹھانے لگے اور سنت نبوی سے علانیہ اعراض کرنے لگے اور بار بار طلاق دینے لگے تو عاشق رسول کو سنت رسول کا یہ علانیہ مذاق برداشت نہ ہو سکا اور انھوں نے اسے تینوں نافذ کرنے کا حکم دے دیا تاکہ سنت نبویؐ کے ساتھ کھیل کرنے والوں کو تنبہ ہو جائے اور اس طرح طلاق کی کثرت نہ ہو۔

امام نسائیؒ نے محمود ابن لبیدؓ کے واسطے سے ایک نشست کی طلاق ثلاثہ کی حرمت کے متعلق حدیث نقل کی ہے فرماتے ہیں کہ:

نبی کریمؐ کو ایک ایسے آدمی کی بابت بتایا گیا جس نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں ایک ساتھ دی تھیں یہ واقعہ سن کر آپ غصے سے کھڑے ہو گئے اور فرمایا ایلعب بکتاب اللہ وانا بین اظہرکم

کیا کتاب الہٰی کے ساتھ اس طرح مذاق کیا جائے گا جب کہ میں ابھی تمہارے درمیان موجود ہوں یہ سن کر وہ آدمی اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا اے اللہ کے رسول کیا ہم اسے قتل نہ کر دیں؟

جہاں تک حضرت عمرؓ کے فعل کا تعلق ہے تو خود ان کے بیان کے مطابق اس کی حکمت یہ تھی کہ اس کے ذریعہ وہ لوگوں کو اس طرح کی طلاقوں سے باز رکھیں۔ لیکن تجربہ سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ حضرت عمرؓ کی یہ حکمت لوگوں کو اس سے باز نہ رکھ سکی اور وہ مسلسل یہی غلطیاں کر رہے ہیں اس لئے اب ہمارے لئے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں ہے کہ ہم سنت نبوی ہی پر عمل کریں اور تین طلاقوں کو ایک مانیں۔

بعض علمار کا یہ بھی خیال ہے کہ ایک نشست کی طلاق ثلاثہ سرے سے واقع ہی نہیں ہوتی نہ یہ ایک طلاق ہوتی ہے اور نہ تین کیوں کہ یہ طلاق بدعت ہے اور اس کے لئے ان کے پاس اور بھی قابل لحاظ دلائل ہیں۔

بہرحال اس طوالت سے ہمارا مقصود یہ دکھانا ہے کہ نفس طلاق وہ معاملہ ہے جس میں جلد بازی نقصان دہ ہے اگر خدانخواستہ کسی کو اس سے سابقہ پڑ جائے تو اسے نہایت صبر اور حکمت کے ساتھ غور کرنا چاہیئے تاکہ اسلام کی روح جو انسان کی زندگی کی بقا اور تحفظ کی خواہاں ہے مجروح نہ ہو۔

اچھا اب آیئے اس سوال پر غور کریں کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دے دیتا ہے تو کیا یکلخت دونوں کے تعلقات ختم ہو جائیں گے؟ اور دوسرے ہی لمحے وہ ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہو جائیں گے؟ اس سوال کا تفصیلی جواب اگلے صفحات میں آرہا ہے۔

عدت

عدت فقہ اسلامی میں اس وقفۂ انتظار کے لئے بولی جاتی ہے جو عورت طلاق کے بعد گزارتی ہے۔ یہ ایک شرعی حکم ہے۔ اس حکم کے تحت عورت ان اوقات میں اپنے ازدواجی حقوق و فرائض

نیز معاشرتی حدود و قیود سے آزاد ہو کر ایک نئی زندگی شروع کرتی ہے۔ اب اس کے اوپر سے شوہر کی قوامیت بھی ختم ہو جاتی ہے اور وہ اپنی مرضی کی آپ مختار ہوتی ہے۔

عدت کے احکام و مسائل کو ہم چار صورتوں میں بانٹ سکتے ہیں۔ مباشرت سے پہلے طلاق دی گئی ہو۔ ایسی شکل میں سرے سے کوئی عدت ہی نہیں ہے جس کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا فَمَتِّعُوْهُنَّ وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا (الاحزاب: ۴۹)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو اور پھر انھیں ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دے دو تو تمہاری طرف سے ان پر کوئی عدت لازم نہیں ہے جس کے پورے ہونے کا تم مطالبہ کر سکو لہٰذا انھیں کچھ مال دو اور بھلے طریقے سے رخصت کر دو۔

۲۔ وہ عمر کی اس حد تک پہونچ چکی ہو جب حیض آنا بند ہو جاتا ہے یا اس قدر چھوٹی ہو کہ اسے حیض ہی نہ آتا ہو ایسی عورتوں کی عدت تین مہینہ ہے جس کی دلیل یہ آیت ہے:

وَالّٰٓـِٔيْ يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآئِكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ وَّالّٰٓـِٔيْ لَمْ يَحِضْنَ (الطلاق: ۴)

(اور تمہاری عورتوں میں سے جو حیض سے مایوس ہو چکی ہوں ان کے معاملہ میں اگر تم لوگوں کو کوئی شک لاحق ہے (تو تمہیں معلوم ہو کہ) ان کی عدت تین مہینے ہے اور یہی حکم ان کا ہے جنھیں ابھی حیض نہ آیا ہو)

۳۔ حیض والیوں کی مدتِ عدت میں علماء کا اختلاف ہے بعض تین حیض مانتے ہیں اور بعض تین طہر اختلاف کی وجہ یہ آیت ہے:

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ (البقرہ: ۲۲۸)

(جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو وہ تین قروء انتظار کریں گی)

لفظ قروء یکساں طور پر عربی زبان میں حیض اور طہر دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اختلاف کی بنیاد معنیٰ کی یکسانیت ہے۔

۴۔ حاملہ عورت کی عدت وضع حمل ہے اور اس کی بنیاد یہ آیت شریفہ ہے:

وَ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ (الطلاق:۴)

(اور حاملہ عورتوں کی عدت کی حد یہ ہے کہ ان کا وضع حمل ہو جائے)

یہاں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ عدت کی مدت کوئی معمولی وقفہ نہیں ہے بلکہ یہ اس قدر طویل ہے جو ایک غلطی کی تلافی کے لئے کافی ہے اس کی طوالت کی وجہ بھی دراصل یہ ہے کہ غلطی کی تلافی کے لئے ایک اور موقع فراہم کر دیا جائے۔

زمانہ عدت کی بعض خصوصیات

زمانہ عدت میں عورت بیوی کی حیثیت اپنے شوہر کے لئے نہ تو سرے سے بالکل اجنبی ہی ہوتی ہے اور نہ ہی وہ اس کی بیوی ہوتی ہے اس لئے کہنا چاہئیے کہ اس کی حیثیت بالکل بین بین کی ہوتی ہے اس "بین بین" کی وضاحت مندرجہ ذیل احکامات شرعیہ سے اچھی طرح ہوتی ہے۔

۱۔ طلاق کے بعد بھی عورت کی حیثیت دوسری تمام چیزوں میں بیوی کی سی ہوتی ہے اور شوہر کو یہ مطلق اختیار نہیں کہ زمانہ عدت میں اگر وہ چاہے تو اپنے گھر سے نکال دے اس کی بنیاد یہ آیت ہے۔

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ، وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ، لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْ بُيُوْتِهِنَّ

(الطلاق: ۱)

اے نبیؐ، جب تم لوگ اپنی عورتوں کو طلاق دو تو انھیں ان کی عدت کے لئے طلاق دیا کرو اور عدت کے زمانہ کا ٹھیک ٹھیک شمار کیا کرو اور اللہ سے ڈرو جو تمہارا رب ہے (زمانۂ عدت میں) نہ تم انھیں گھروں سے نکالو اور نہ وہ خود نکلیں۔

اس میں شک نہیں کہ ایک گھر میں دونوں کا ایک ساتھ رکھنا اور اس قدر قریب رکھنا پُراز حکمت ہے اس کا مقصد دونوں کو صلح وصفائی کا بہترین موقع فراہم کرنا ہے۔

۲۔ عورت کے لئے شوہر کے گھر سے نکلنا جائز نہیں ہے الاّ آنکہ کوئی خاص ضرورت آن پڑے ورنہ بلا مقصد نکلنا اسے گنہ گار کر دیتا ہے مگر اس سے اس کی عدت باطل نہیں ہوتی ہے۔

۳۔ امام ابوحنیفہؒ کا خیال ہے کہ زمانہ عدت میں عورت کو زیب و زینت کے ساتھ رہنا چاہیئے بہترین کپڑوں اور زیورات کو پہننا چاہیئے بہترین خوشبو استعمال کرنی چاہیئے اور اس انداز سے رہنا چاہیئے کہ اس کا شوہر اس کی طرف کھنچ جائے۔

۴۔ اگر دوران عدت شوہر یا بیوی کا انتقال ہو جائے تو دونوں ایک دوسرے کے وارث ہوں گے۔

۵۔ عدت کے ختم ہونے سے پہلے وہ شادی نہیں کرے گی بلکہ مسلسل وہ اس کے تصرف میں رہے گی۔ اور زمانہ عدت میں جب وہ چاہے گا اس سے رجوع کرے گا خواہ بیوی پسند کرے یا ناپسند:

وَبُعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَٰلِكَ إِنْ أَرَادُوا إِصْلَاحًا۔ (البقرۃ: ۲۲۸)

ان کے شوہر تعلقات درست کر لینے پر آمادہ ہوں تو وہ اس عدت کے دوران انھیں پھر اپنی زوجیت میں واپس لے لینے کے حقدار ہیں۔

اس آیت کی رو سے شوہر کو زمانہ عدت میں رجعت کا اختیار حاصل ہے اس شرط کے ساتھ کہ اس پر دو عادل گواہ بنا لئے جائیں۔ فرمایا

وَأَشْهِدُوا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنكُمْ (الطلاق: ۲)

(اور اپنے میں سے دو ایسے آدمیوں کو گواہ بنالو جو صاحب عدل ہوں)

لیکن اگر زمانہ عدت کے ختم ہونے کے بعد وہ رجعت کرنا چاہے تو اسے اس کا اختیار نہیں ملے گا اب عورت کی حیثیت اس کے لئے ایک اجنبیہ کی ہو جائے گی اور وہ خود اس کے لئے ایک اجنبی ہوگا۔ اب از سر نو نکاح کرنے کے بعد ہی وہ اس کی زوجیت میں آسکتی ہے اور اسے اس کے قبول کرنے یا رد کرنے کا کامل اختیار ہوگا۔

رجعت کے احکام و مسائل

زمانہ عدت میں اگر شوہر رجعت کر کے اپنی نئی زندگی کا آغاز کرتا ہے پھر چند دن گذرنے کے بعد کچھ مزید ایسے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں جس سے اسے دوسری مرتبہ بھی طلاق دینی پڑتی ہے تو از سر نو ان احکام پر عمل کرنا پڑے گا جن کا ذکر ہم پیچھے کر چکے ہیں حتیٰ کہ دوسری مرتبہ طلاق دینے کے بعد بھی اگر وہ چاہے تو دوسری عدت میں ایک بار پھر رجعت کر سکتا ہے۔

لیکن اس کے بعد اسے معلوم ہونا چاہئیے کہ اب اس کے بعد اگر وہ طلاق دے گا تو اسے رجعت کا حق نہیں ملے گا کیوں کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی چھوٹ یعنی اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ کو استعمال کر لیا ہے اور تیسری مرتبہ طلاق دیتے وقت اسے یاد رکھنا چاہئیے کہ اس بار اس کی بیوی اس سے لازماً جدا ہو جائے گی اور بغیر حلالہ کئے ہوئے وہ اسے رکھنے کا مجاز نہ ہوگا۔ اس لئے اسے چاہئیے کہ یا تو وہ اسے بھلے طریقہ سے رکھے یا بھلے طریقہ سے جدا کر دے۔

علامہ ابن کثیرؒ نے آیت مندرجہ بالا فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ کی تفسیر کرتے ہوئے ابن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے۔

"جب شوہر اپنی بیوی کو دو طلاقیں دے دے تو اسے تیسری طلاق دیتے ہوئے اللہ سے

ڈرنا چاہیئے (اور دو ہی طلاقوں کے بعد اس کے لئے مناسب ہے کہ) چاہے تو وہ اسے بھلے طریقے سے رکھے یا چاہے تو بھلے طریقہ سے اسے اپنے سے الگ کردے اور اس کے حقوق کا پورا پورا خیال رکھے"۔

مرد کو رجعت کا اختیار دینے میں شریعت کی حکمت غالباً یہ معلوم ہوتی ہے کہ اپنی بیوی کی مفارقت نیز غم تنہائی کا مرد کو پورا پورا احساس ہوتا ہے اور اس میں اسے اس قدر پریشانی اور دکھ کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو نا قابل بیان ہے۔ ظاہر ہے کہ طلاق دینے سے پہلے اسے ان تکالیف و آلام کا پورا احساس نہیں تھا اس لئے رحمت الٰہی مقتضی ہوئی کہ اس کی عدم واقفیت کی رعایت کرتے ہوئے اسے اس پریشانی سے نجات دلائے تاکہ اس کی زندگی ایک بار پھر سکون اور اطمینان سے ہمکنار ہو سکے۔

رجعت کا اختیار دو مرتبہ دینے میں غالباً یہ حکمت ملحوظ رکھی گئی ہے کہ نصیحت اور خیر خواہی کا حق ایک دفعہ میں ہرگز ادا نہیں ہو سکتا اس کے لئے صرف ایک تجربہ کافی نہیں ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہ اختیار دو مرتبہ عنایت فرمایا تاکہ اتمام حجت کا حق ادا ہو سکے۔

اس حکمت کا ایک دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ جب انسان کو طلاق کے نتائج کا احساس دو مرتبہ ہو چکا ہوتا ہے تو تیسری مرتبہ طلاق دیتے ہوئے وہ بالکل مطمئن ہوتا ہے اور وہ اچھی طرح سوچ سمجھ کر اور دیکھ بھال کر ہی طلاق دیتا ہے اگر وہ مفارقت ہی میں اپنی بھلائی سمجھتا ہے تو اسے طلاق دے دیتا ہے ورنہ پھر بھلے طریقے سے اسے روک لیتا ہے۔ اس حکمت کو نظر میں رکھتے ہوئے بھی اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں پر کمال رحمت اور شفقت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

یہاں تک تو ہم نے زوجین کے تعلقات کی خرابی ان کے درمیان افتراق و اختلاف ہونے کی صورت میں اس کا اسلامی حل پیش کیا تھا اور یہ بتایا تھا کہ طلاق کے شرعی اصول و ضوابط کیا ہیں؟ اس کے وقوع اور عدم وقوع کی کیا صورتیں ہیں۔ ان تفصیلات سے اسلام کی آفاقیت نیز اس کی

وسعت وہمہ گیری کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ اسلامی نظام معاشرت میں کس قدر اعتدال ہے اور افراط و تفریط کی بھول بھلیوں سے یہ کس قدر پاک ہے۔

آخر میں ہم عورت کے مسائل پر گھلنے والوں نیز خاندانی نظام کی بربادی پر مگر مچھ کے آنسو بہانے والوں کی خدمت میں گزارش کریں گے کہ وہ مسئلہ کی گہرائی میں اترنے کی کوشش کریں اور اسلام پر طنز و تعریض کرنا چھوڑ دیں کیوں کہ اسلام ہی وہ واحد نظام حیات ہے جو انسان کی معاشرتی زندگی کو خوشگوار بنا سکتا ہے۔ اگر انھیں اس بات سے اختلاف ہے تو وہ کوئی ایسا نظام حیات پیش کریں جس میں خاندانی نظام کے تقدس کا نیز خواہشات انسانی کا اس درجہ خیال رکھا گیا ہو۔

یہاں ان لوگوں کو بھی سوچنا چاہیے جو رشتۂ ازدواج کو پہلی فرصت میں کاٹ دینا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو رافت و رحمت اور شفقت و نرمی اپنی شریعت میں رکھ دی ہے وہ خاندانی نظام کی تاسیس کے لئے کس قدر ناگزیر اور انجام کے لحاظ سے کتنا بہتر ہے۔

طلاق ــــــ اسلام اور عیسائیت کی نظر میں

گذشتہ صفحات کی روشنی میں ہم یہ بات بلا جھجک کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کی نظر میں طلاق انتہائی مبغوض چیز ہے جس کے استعمال کی اجازت وہ اس وقت دیتا ہے جب اس کے علاوہ کوئی اور چارۂ کار باقی نہ رہ گیا ہو اور اس کی اجازت دیکر اس نے افراط و تفریط کے درمیان ایک سیدھا خط کھینچ دیا ہے جو ہر صاحب بصیرت کے دل و دماغ کو اپیل کرتا ہے اور ثابت کرتا ہے کہ اسلام ایک قابل عمل نظام حیات ہے۔

فرض کر لیجئے اگر وہ طلاق کی اجازت نہ دیتا تو عملی زندگی میں اسے کس قدر دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا اس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا ہے۔ ایک پاگل اور بیوقوف بیوی یا شوہر اگر ایک بار کسی کے گلے

سے منڈھ دیا جاتا تو ساری عمر وہ روتا زندگی خواہ کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہو جاتی اسے الگ ہونے کی قطعاً اجازت نہ ہوتی۔ یا اسی طرح دونوں میں سے اگر کوئی پاگل ہو جاتا یا خطرناک بیماری لاحق ہو جاتی یا کسی کا شوہر غائب ہو جاتا تو ساری عمر دونوں جھیلتے رہتے اور پہاڑ سی زندگی کاٹے نہ کٹتی۔ تند مزاج شوہر جس طرح چاہتا بیوی سے بیگاری کرواتا اور وہ جانوروں کی طرح مجبور و بے بس ہوتی۔

یہ اور اس طرح کے اور بہت سے اسباب و وجوہ ہیں جن کی بنا پر اسلام نے دونوں کو مفارقت کی اجازت دی ہے اور جس کی بہترین صورت اس نے طلاق اور خلع تجویز کی ہے۔

رہی عیسائیت تو اس میں سرے سے طلاق کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کی تخلیق فرمائی ہے اس لئے اگر وہ ایک بار خدا کا نام لے کر ایک ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں تو وہ ایک جسم کی مانند ہو جاتے ہیں پھر اس کے بعد ان کا ایک دوسرے سے جدا ہونا بالکل جائز نہیں ہے کیوں کہ وہ بندھن جسے اللہ تعالیٰ کا نام لے کر باندھا گیا اسے توڑنے کی کسی انسان کو اجازت نہیں دی جا سکتی۔

حضرت مسیح نے اپنے حواریوں سے اسی طرح کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا:

"مرد کو اپنی عورت سے اس طرح چمٹ جانا چاہیے کہ دونوں ایک جسم اور ایک جان ہو جائیں وہ دونوں کبھی ایک دوسرے سے الگ نہ ہوں کیوں کہ جسے اللہ نے جمع کیا ہے اسے انسان جدا نہیں کر سکتا۔" (متی ص ۱۹: ۶)

مسیحیت میں طلاق کی گنجائش صرف اسی صورت میں نکلتی ہے جب کہ دونوں میں سے کوئی اپنی ازدواجی زندگی میں خیانت کا ارتکاب کرے اس کے علاوہ طلاق کے جائز ہونے کی کوئی اور شکل نہیں ہے۔

صاف ظاہر ہے کہ اس طرح کی بندش ایک تفریط ہے جسے عملی زندگی میں برتنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ پروٹسٹنٹ نے اسے مزید وسعت دی ہے اور خیانت کے علاوہ اور دوسری شکلوں میں بھی طلاق کی گنجائش نکالی ہے۔

عیسائیت میں اگر شوہر اپنی بیوی کو طلاق دے کر دوسری شادی کرتا ہے تو وہ زنا کا ارتکاب کرتا ہے اسی طرح اگر عورت اپنے پہلے شوہر کو چھوڑ کے کسی دوسرے مرد سے شادی کرتی ہے تو انجیلی شریعت کی رو سے وہ بھی زانیہ ہے۔ مرقس کی انجیل میں آیا ہے:

"جس نے اپنی بیوی کو طلاق دے کر دوسری شادی کی تو گویا وہ اس سے زنا کرتا ہے اسی طرح اگر بیوی دوسری شادی کرتی ہے تو وہ بھی زنا کا ارتکاب کرتی ہے"۔ (مرقس ص ۱۰/۱۱/۱۲)

رہا اسلام تو اس میں عدت کے ختم ہونے کے بعد عورت کو یہ اختیار حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے جس سے چاہے شادی کرلے چاہے اس کی مفارقت اپنے پہلے شوہر سے طلاق کے ذریعہ ہوئی ہو یا خلع کے ذریعہ اسی طرح مرد کا معاملہ ہے اسے بھی اپنی دوسری شادی کرنے کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ اسی حقیقت کے بعض پہلوؤں کی طرف آیت قرآنی اشارہ کر رہی ہے:

وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ (النساء: ۱۳۰)

(زوجین ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں تو اللہ اپنے وسیع خزانۂ غیب سے ہر ایک کی کفالت کرے گا۔)

آیت مندرجہ بالا کی تفسیر کرتے ہوئے مفسرین نے لکھا ہے:

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اگر شرعی ضوابط کو ملحوظ رکھتے ہوئے طلاق دی جائے تو اللہ تعالیٰ بیوی کو سابق شوہر سے اچھا شوہر اور شوہر کو سابقہ بیوی سے اچھی بیوی عطا کرے گا اور دونوں دوسری شادی کے بعد اپنے کو اس سے بہتر حال میں پائیں گے اور ان کی تمام مشکلات اللہ تعالیٰ

آسان کر دے گا۔

فی الحقیقت یہی چیز فطرت انسانی سے ہم آہنگ ہے اور اس کی خواہشات کے عین مطابق۔ شکر ہے اس خدا کا جس نے ہمیں اسلام جیسی نعمت سے بہرہ ور فرمایا۔

فصل چہارم

حلالہ

تمہید

اللہ کا ارشاد ہے:

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ، فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ (البقرہ: ۲۳۰)

پھر اگر (دوبارہ طلاق دینے کے بعد شوہر نے عورت کو تیسری بار) طلاق دے دی تو وہ عورت پھر اس کے لئے حلال نہ ہوگی۔ الا یہ کہ اس کا نکاح کسی دوسرے شخص سے ہو اور وہ اسے طلاق دیدے تب اگر پہلا شوہر اور یہ عورت دونوں یہ خیال کریں کہ حدود اللہ پر قائم رہیں گے تو ان کے لئے ایک دوسرے کی طرف رجوع کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

آیت مندرجہ بالا کا مفہوم یہ ہے کہ جب ایک مرد اپنی بیوی کو مقررہ اسلامی ضوابط کے مطابق دو طلاقیں دیتا ہے تو اس طرح وہ اپنا حق ختم کر دیتا ہے۔ اب اگر وہ تیسری مرتبہ طلاق دے تو یہ عورت اس کے لئے حرام ہو جاتی ہے الا آنکہ وہ دوسری شادی کرے اور پھر اگر دوسرے شوہر سے بھی اس کا نباہ نہ ہو سکے اور وہ بھی اسے طلاق دیدے تب پہلا شوہر اس سے دوسری شادی کر سکتا ہے۔

علماء نے اس کڑی شرط کی حکمت یہ بتائی ہے کہ اس سے مقصود شوہر کی تادیب اور اس کی زجر و توبیخ ہے۔ کیوں کہ کوئی بھی غیرت مند شوہر اپنی بیوی کو دوسرے مرد کے پہلو میں دیکھنا کبھی گوارہ نہیں کرے گا اور وہ کوئی ایسا قدم اٹھانے سے پہلے ہزار بار سوچے گا جو اسے اس کی بیوی سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دے۔

حلالہ کے شرائط

ائمہ مجتہدین کا خیال ہے کہ تین طلاق دینے کے بعد بیوی پہلے شوہر کے لئے اسی وقت حلال

ہو سکتی ہے جب وہ مندرجہ ذیل پانچ شرطیں پوری کرے :۔

۱۔ پہلے شوہر کے طلاق دینے کے بعد وہ عدت گزارے ۔

۲۔ پھر دوسرے مرد سے نکاح صحیح کرے ۔

۳۔ اور ان دونوں کے درمیان مباشرت ہو ۔

۴۔ پھر وہ اسے طلاق دے ۔

۵۔ اور پھر یہ عدت گزارے ۔

اس کے بعد اگر پہلا شوہر چاہے اور خود یہ راضی ہو تو دونوں نئے سرے سے نکاح کر سکتے ہیں ۔

حلالہ کا مفہوم

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ وقتی جوش میں آکر شوہر جب اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہے اور پھر بعد کے حالات اس کے لئے سخت ہو جاتے ہیں اس کی گھریلو زندگی انتشار و اضطراب میں گھر جاتی ہے اور بیوی کی جدائی اس کے لئے ناقابل برداشت ہو جاتی ہے تو وہ شرعی حیلے تلاش کرتا پھرتا ہے ۔ جس کی ایک شکل یہ ہے کہ کسی شخص کے پاس جا کر اس کو طے کرتا ہے اور اس شرط کے ساتھ اس کی شادی اپنی سابقہ بیوی سے کرتا ہے کہ ایک مرتبہ ہم بستری کے بعد اسے طلاق دیدے گا اور اس طرح وہ اسے اپنے لئے حلال کرتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ اس نے شریعت کے حکم کی تعمیل کر دی حالانکہ وہ شریعت کے ساتھ مذاق کرتا ہے ۔

اس طرح حلالہ کا مفہوم گویا یہ ہوا کہ بیوی کو اس کے شوہر کے لئے حلال کرانا ۔ اصطلاح شریعت میں اس فعل کے فاعل کو "مُحلِّل" اور جس کے لئے یہ کام کیا جائے اسے محلَّلُ لہٗ کہتے ہیں ۔

حلالہ کی حرمت

حلالہ کی مندرجہ بالا شکل سراسر ناجائز ہے کیوں کہ آیت قرآنی "فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ" کا مقصد شرعی شادی تھا جسے اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کے لئے مسنون قرار دیا ہے یہ کھیل کود والی شادی اس آیت کا مقصد نہیں ہے جو شادی کی روح سے ذرا بھی مطابقت نہیں رکھتی۔

شریعت کی نظر میں شادی کی اصل حقیقت یہ ہے کہ دو افراد اپنی زندگی کا آغاز نئے جذبات اور نئے ترنگ سے کرتے ہیں ان میں وفائے باہم کا عہد استوار ہوتا ہے دونوں ایک دوسرے کو جسمانی اور روحانی سکون پہونچاتے ہیں ایک دوسرے کے دلوں کو خوشیوں اور مسرتوں سے بھر دیتے ہیں جیسا کہ قرآن کریم کی اس آیت میں ارشاد ہوا:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً (الروم: ۲۱)

(اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے خود تم ہی میں سے جوڑے پیدا کئے ہیں تاکہ ان کے پاس سکون حاصل کرو اور اس نے تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کی ہے۔

اسی طرح شادی کا ایک مقصد افزائش نسل بھی ہے خود قرآن میں اور مختلف احادیث میں اس کی وضاحت کی گئی ہے حدیث شریف کے الفاظ ہیں۔

تزوجوا الولود الودود فانی مکاثر بکم (ابوداؤد، نسائی، ابن حبان، حاکم)

زیادہ محبت کرنے والی اور بچہ جننے والی عورت سے شادی کرو تاکہ ہماری امت میں اضافہ ہو۔

دوسری حدیث ہے:

تناکحوا، تناسلوا، تکثروا فانی اباھی بکم الامم یوم القیامۃ (السخاوی)

(شادیاں کرو، نسلیں بڑھاؤ، اور کثیر تعداد میں ہو جاؤ تاکہ قیامت کے دن میں تمہارے اوپر دوسری امتوں کے مقابلہ میں فخر کر سکوں)

اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی اہمیت کے پیش نظر اس میں اس قدر انتظام واہتمام کیا جاتا ہے اور دونوں کے اوپر مختلف قسم کے حقوق اور ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں مثلاً مہر کی ادائیگی، رہائش کا انتظام اور جہیز وغیرہ۔

نکاح کی حقیقت کیا ہے؟ اس کے مقاصد کیا ہیں؟ اس کی ہلکی سی جھلک ہم نے اوپر پیش کی ہے۔ اس سے خود بخود یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نکاح اور حلالہ دونوں کی حقیقتوں میں کس قدر اختلاف ہے، نکاح اپنی غایت اور نتیجہ کے اعتبار سے نہایت ذمہ دارانہ فعل ہوتا اور تحلیل سراسر مذاق۔

حدیث نبوی ہے کہ اعمال کا دارومدار نیت پر ہوتا ہے اور تحلیل وہ فعل ہے جس میں کسی کی نیت نہ تو مہر ادا کرنے کی ہوتی ہے نہ ایک ساتھ زندگی گزارنے کا کوئی عہد ہوتا ہے اور نہ ہی اس میں کسی کی نیت شریف اولاد پیدا کرنے کی ہوتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ یہ ایک ایسا فعل ہے جس کی شکل نکاح کی سی تو ضرور ہوتی ہے لیکن یہ اپنی حقیقت اور معنی کے اعتبار سے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کھلا ہوا مذاق ہوتا ہے۔ حضرت عثمانؓ کا قول ہے کہ: نکاح ایک ایسی خواہش کا نام ہے جو کسی بھی لاگ لپیٹ سے بالکل پاک ہوتی ہے۔

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے ایک آدمی نے ایک ایسے شخص کے بارے میں دریافت کیا جس نے اپنی مطلقہ بیوی کو اپنے بھائی سے بیاہ دیا تاکہ وہ اس کے ذریعہ سے حلالہ کروالے۔ اس آدمی نے دریافت کیا کہ کیا اس طرح کرنے سے یہ عورت پہلے شوہر کے لئے جائز ہو جائے گی؟ ابن

عمرؓ نے جواب دیا "نہیں نکاح تو خواہش کا نام ہے ہم تو اس طرح کے کام کو رسول اللہؐ کے زمانے میں زنا شمار کیا کرتے تھے۔ اور اسی بنیاد پر حضرت عمرؓ یہ فرمایا کرتے تھے کہ محلل اور محلل لہٗ اگر ہماری عدالت میں لائے جائیں گے تو ہم انھیں رجم کردیں گے۔

صحیح حدیثوں میں آتا ہے کہ اللہ کے رسولؐ نے محلل اور محلل لہ دونوں پر لعنت بھیجی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تحلیل دراصل نکاح نہیں زنا ہے کیوں کہ اللہ کے رسولؐ نکاح کرنے والوں پر تو لعنت بھیج نہیں سکتے۔ ایسے شخص کو آپؐ نے تَیْسٌ مُسْتَعَارٌ (کرائے کا سانڈ) سے تشبیہ دی ہے۔ حضرت عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے صحابہ سے دریافت فرمایا کہ کیا میں تم کو کرائے کا سانڈ کے بارے میں نہ بتاؤں صحابہ نے عرض کیا کیوں نہیں اے اللہ کے رسولؐ۔ آپ نے فرمایا وہ محلل ہے اللہ تعالیٰ محلل اور محلل لہ دونوں پر لعنت بھیجتا ہے۔

فصل پنجم

عورت

ماں اور بیوی کے روپ میں

تمہید

اسلامی نقطۂ نظر سے نکاح محض مرد اور عورت کے اجتماع کا نام نہیں ہے بلکہ دراصل یہ اس روحانی تعلق اور اس وفا کے عہد و پیمان کا نام ہے جس میں بندھ کر دو اپنی روحانی اور نفسانی خواہشات کی تکمیل کرتے ہیں۔ آیت کریمہ (وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْٓا اِلَیْہَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ) اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

یہی معاملہ ماں بننے کا بھی ہے کوئی عورت محض بچہ پیدا کر کے ماں نہیں بن جاتی۔ یہ دراصل اس روحانی کیفیت کا نام ہے جو عورت کے دل میں شمع بن کر جگمگاتی ہے جس کے بعض پہلوؤں کی طرف ہم ذیل میں اشارہ کریں گے :

اس سلسلہ میں بنیادی اصول قرآن کریم کی یہ آیت متعین کرتی ہے :

وَاللّٰہُ جَعَلَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَکُمْ مِّنْ اَزْوَاجِکُمْ بَنِیْنَ وَ حَفَدَۃً وَّرَزَقَکُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ (النحل:۷۲)

(اور وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لئے تمہاری ہم جنس بیویاں بنائیں اور اسی نے ان بیویوں سے تمہیں بیٹے پوتے عطا کئے اور اچھی اچھی چیزیں تمہیں کھانے کو دیں۔)

ہم دیکھتے ہیں کہ حیوانات میں بھی نر اور مادہ جنسی تعلقات قائم کرتے ہیں اور اس کے ذریعہ ان کی نسل میں افزائش ہوتی ہے۔ ہم اس سے بھی ناواقف نہیں ہیں کہ ماں کا رشتہ جانوروں میں بھی ہوتا ہے ان کے یہاں بھی ماں ایک مدت تک جنین کو اپنے پیٹ میں لئے پھرتی ہے پھر پیدائش کے بعد اس پر لطف و کرم کی بارش کرتی ہے اس کی پرورش اور نگہداشت کرتی ہے اس کے کھانے

پینے کا خاص خیال رکھتی ہے۔ پھر اگر یہی سب کچھ انسان بھی کرتا ہے تو دونوں کے درمیان کیا فرق ہو سکتا ہے اگر ان دونوں کے درمیان کوئی چیز فرق کر سکتی ہے تو وہ روحانیت اور نورانیت ہے جو انسان کا طرۂ امتیاز ہے۔

ہم پیچھے فصل اول میں "نکاح" کے عنوان کے تحت اس بات کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ انسان تکوینی لحاظ سے دو حیثیتوں کا حامل ہے ایک اس کا حیوانی پہلو ہے جو اسے قوانین طبعیہ کا پابند بناتا ہے دوسرا اس کا روحانی پہلو ہے جو اسے نیکی کے کاموں کی طرف مہمیز لگاتا ہے اور اس کی اخلاقی قدروں کے لئے بنیادیں فراہم کرتا ہے۔ اس کے پیچھے نوامیس فطرت کا قطعاً عمل دخل نہیں ہوتا۔ پھر بھی محض فضل خداوندی ہے کہ ان دونوں پہلوؤں میں بھی اس نے دونوں کو ایک دوسرے سے ممتاز کیا ہے۔ حیوانی اعتبار سے دونوں کو مرد اور عورت میں تقسیم کیا ہے اور باوجود اس کے کہ دونوں کے عناصر ترکیبی ایک ہیں ان کے اعضاء یہاں تک کہ خلیئے بھی باہم دگر مختلف ہیں۔ اسی طرح روحانی اعتبار سے دونوں کو آدمی بنایا ہے یہاں بھی گرچہ دونوں کے اندر جوہر آدمیت یکساں طور پر موجود ہے مگر کارکردگی کے اعتبار سے دونوں میں واضح اختلاف بلکہ کہنا چاہیئے کہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں ایک کی حیثیت مثبت کی ہے تو دوسرے کی منفی۔ ایک کا پہلو ایجابی ہے تو دوسرے کا سلبی جیسا کہ برقیات کی دنیا میں ہم دیکھتے ہیں اگر مثبت اور منفی دونوں طرح کے عوامل کام نہ کریں تو برق کا کوئی اثر ہم دیکھ ہی نہ سکیں، لیکن اس اختلاف کے باوجود دونوں کے اجزائے ترکیبی جوہری طور پر ایک ہی ہوتے ہیں۔ یہ سنت الٰہی ہے کہ اس نے ہر چیز کے جوڑے جوڑے بنائے ہیں اور قانون ازدواج اسی کے گرد گردش کرتا ہے۔

گذشتہ اوراق میں ہم مرد اور عورت کی انسانیت کے امتیازی اوصاف کی طرف اشارہ کر چکے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان میں مرد کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ سکون پہونچاتا ہے اور عورت اس کے ذریعہ سکون حاصل کرتی ہے جیسا کہ آیت کریمہ خَلَقَ لَکُمْ مِنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِتَسْکُنُوْا

اِلَیۡھَا" اشارہ کر رہی ہے۔ یہاں مرد کی سکون طلبی کے ساتھ تخصیص دونوں کے روحانی اختلاف کی واضح دلیل ہے۔

اب تک کی تحریر سے یہ بات صاف ہو گئی کہ انسان کی دو حیثیتیں ہیں حسی اور معنوی اور ان دونوں حیثیتوں کے لحاظ سے مرد اور عورت الگ الگ اوصاف اور خصوصیات کے حامل ہیں معنوی اختلاف تو ان دونوں کے اندر اس قدر شدید ہے کہ اگر ہمارے حواس روحِ کائنات کا مشاہدہ کر سکتے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی کہ عورت کی انسانیت اپنے اندر چند خصوصیتیں رکھتی ہے وہی ہے جو مرد کو حقیقی سکون دے سکتی ہے اور بچوں کی تربیت کے اندر اپنا ایک خاص رول ادا کر سکتی ہے۔ یقیناً مرد ان خصوصیات کا حامل نہیں ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دونوں کی خصوصیتوں میں کافی اختلاف ہے۔ مگر یہ اختلاف نوع انسانی کے لئے ضرر رساں نہیں بلکہ فائدہ مند ہے اور نوع انسانی کی بقا اسی اختلاف پر منحصر ہے یہ کیسا اختلاف ہے۔ یہ اختلاف مثبت و منفی اور ایجاب و سلب کا ہے جس کا مشاہدہ ہم برقیات کی دنیا میں آئے دن کرتے رہتے ہیں۔ مثبت اور منفی برق میں گرچہ اختلاف ہے مگر یہ اختلاف اس کے وجود کو جلا دینے کے لئے ہے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو برق نام کی کوئی چیز ہم اس دنیا میں نہ دیکھتے یہی چیز ہے جسے قرآن کی اصطلاح میں قانون زوجیت کہا جاتا ہے " وَمِنۡ کُلِّ شَیۡءٍ خَلَقۡنَا زَوۡجَیۡنِ " (اور ہر چیز کو ہم نے جوڑا جوڑا بنایا) اور ایسا دراصل اس لئے ہوتا کہ ان دونوں میں سے ہر ایک اپنے مقرر کردہ حدود کا لحاظ کرے اور اس طرح وہ حسّی اور معنوی دونوں اعتبار سے نوع انسانی کے لئے زیادہ سے زیادہ فائدہ مند ثابت ہو۔

قانون زوجیت

قانون زوجیت کا اثبات

عالم انسانی میں مرد اور عورت کی حیثیت ۔ ان کی نوعی خصوصیات سے قطع نظر مثبت اور منفی ہے ۔ ہر ایک کی اپنی الگ خصوصیات ہیں جن کی بنا پر وہ ایک دوسرے سے ممیز ہوتے ہیں ۔ اور اس کا مقصد یہ ہے کہ دونوں اپنے اصل مقصد کے حصول کے لئے زیادہ سے زیادہ فائدہ مند اور نتیجہ خیز ثابت ہوں ۔ اس طرح یہ اختلاف مقصود عین نہیں بلکہ ایک بڑے مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے اور یہ دونوں مل کر ہی اس بڑے مقصد کو حاصل کر سکتے ہیں ۔ اسی زوجیت کی طرف قرآن نے اس آیت میں اشارہ کیا ہے ۔ " وَمِنْ اٰیٰتِہٖ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجاً لِتَسْکُنُوْا اِلَیْھَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً " اس میں سکون سے مراد جذباتی یا جنسی سکون نہیں جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے اس کا مقصود دراصل روحانی سکون ہے ۔ امام رازیؒ اسی سکون کے متعلق رقم طراز ہیں کہ " سَکَنَ اِلَیْہِ سکون قلبی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور سَکَنَ عِنْدَہٗ سکون جسمانی کے لئے بولا جاتا ہے ۔ اس لئے کہ لفظ " عند " ظرف مکان کو بتانے کے لئے آتا ہے جس میں اجسام وغیرہ بھی آتے ہیں اور الیٰ غایت بتانے کے لئے آتا ہے اور یہ قلوب کے لئے استعمال ہوتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ یہ روحانی یا قلبی سکون ظاہر نہیں بلکہ پوشیدہ ہونے ہیں اس کا تعلق انسان کے اندرون سے ہوتا ہے اور اس کے اثرات خواہ مثبت ہوں یا منفی وہیں مرتب ہوتے ہیں اس لئے یہ بات بالکل صاف ہے کہ یہاں سکون سے مراد روحانی سکون ہے اس کے لئے ہم مزید دو دلائل پیش کر رہے ہیں ۔

اللہ تعالیٰ نے عورت کی تخلیق مرد سے کی ہے" خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا"
اور لفظ نفس کے جہاں اور بہت سے معنیٰ ہوتے ہیں وہیں یہ روحانیت اور معنوی خصوصیت کے اظہار
کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور یہاں یہ اسی مفہوم میں ہے۔ لغت کی مشہور کتاب 'المصباح المنیر' میں
ہے کہ جب نفس کو مونث استعمال کیا جائے تو یہ روح کے معنیٰ میں ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے
خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ۔ پھر ویسے بھی اسلام انسان کے جنسی پہلو کو نہیں بلکہ اس کے باطنی
اخلاق اور مخفی کردار کو دیکھتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ آیت کریمہ میں زوجیت سے مراد روحانی زوجیت ہے جس کا تعلق انسان کی انسانیت
سے ہے اور ان دونوں کی انسانی خصوصیات میں باہم دگر جو اختلاف ہے اس کا مقصد دراصل اس
مقصد زوجیت کا حصول ہے جس کے لئے ان کا وجود عمل میں لایا گیا ہے اور مزاج کا یہ اختلاف پوری
کائنات میں موجود ہے۔

۲۔ دوسری دلیل آیت کریمہ کا ٹکڑا لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا ہے۔ جیسا کہ ہم پیچھے وضاحت کر چکے
ہیں کہ سکن کا صلہ جب الی آتا ہے تو لغت میں یہ سکون روحانی کے لئے استعمال ہوتا ہے جس کا تعلق
دل کے اندرون سے ہوتا ہے۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ یہاں روحانی سکون ہی مراد ہے تو ہمیں زوجین
کے امتیازی اوصاف پر نظر ڈالنی چاہیئے۔ اور سب سے پہلا امتیازی وصف لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا
سے ظاہر ہوتا ہے اس طرح گویا مرد کی خصوصیات عورت کی خصوصیات کی محتاج ہوتی ہیں اور ظاہر ہے
کہ آدمی کو سکون کی ضرورت اسی وقت لاحق ہوتی ہے جب اسے کوئی پریشانی درپیش ہو۔ یہ بات
معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں علم وحکمت کے موتی بھر دیئے ہیں اور اس کا کوئی حرف
کوئی شوشہ اور کوئی گوشہ بھی خالی از معنیٰ نہیں ہے اب آیئے آیت کریمہ کے الفاظ ملاحظہ فرمایئے
آیت کے الفاظ ہیں لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا یہ نہیں فرمایا کہ لیسکن بعضکم إلیٰ بعضٍ اس

سے ایک خاص بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے وہ یہ کہ پریشانی اور سرگشتگی مرد کی خصوصیت ہے اور جس کا تعلق عورت سے نہیں ہے۔ اور لفظ الیٰ کا استعمال کسی چیز کے آغاز اور انجام دونوں کی وضاحت کے لئے آتا ہے یہاں آغاز اس بات سے ہے کہ مرد جس کی خصوصیت پریشانی ہے، اسے سکون کی تلاش ہے اور انجام یہ ہے کہ عورت اس کو سکون بخشنے کا فطری ذریعہ ہے۔

اس لمبی بحث سے ہمیں یہ بتانا مقصود تھا کہ آیت کریمہ میں سکون سے مراد روحانی سکون ہے جس کی تلاش مرد کو رہتی ہے اور زوجیت سے مراد روحانی زوجیت ہے اور تیسری بات یہ کہ مرد اور عورت دونوں کی انسانیت میں باہم دگر ایک بڑا اختلاف ہے جو نوع انسانی کے لئے فائدہ مند ہے۔

اس سے نکاح کے مقصد پر روشنی پڑتی ہے اور وہ یہ کہ شادی دو جسموں کو ملانا نہیں بلکہ دو روحوں کو ملانا ہے اور جسموں کو اس لئے ملاتے ہیں کیوں کہ یہ چیز روحانی ارتباط کا وسیلہ اور ذریعہ ہے۔

قانون زوجیت کے فوائد

اس پوری بحث میں مرکزی حیثیت قانون زوجیت کے فوائد ہی کو حاصل ہے۔ اس دنیا میں کوئی بھی کام چاہے اس کا تعلق روحانیت سے ہو یا طبعیات سے ایک متعین مقصد کے تحت ہی کیا جاتا ہے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں قانون زوجیت کے جو فوائد بتائے ہیں وہ قرآن کریم کے الفاظ میں یہ ہے:۔ لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً (تاکہ تم سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان شفقت و محبت کے جذبات پیدا ہوں) مطلب یہ ہے کہ جب دو جسموں کا اتصال ہوتا ہے تو اس سے نسل کی افزائش ہوتی ہے اور جب دو روحوں کا ارتباط ہوتا ہے تو اس کے نتیجہ میں سکون محبت اور مودت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں انسانیت کا جو پودا ضمیر انسانی میں نہایت مرجھایا ہوتا ہے اس میں

نمو پاکر بڑھنے اور بار آور ہونے کی صلاحیت مفقود ہوتی ہے قانون زوجیت اسے جلا دیتا ہے اس کے نشوونما کے مواقع فراہم کرتا ہے یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے وہ ایک تناور درخت بن جاتا ہے اور ایک دن وہ آتا ہے جب وہ محبت اور رحمت کے سدابہار پھولوں سے لد جاتا ہے اور اس کی خوشبوئے دلنواز نوع انسانی کے دل و دماغ معطر کرتی ہے۔

اگر کسی انسان کی زندگی میں یہ پھول نہ کھلیں، اس کی زندگی ان سدابہار پھولوں کی خوشبوؤں سے محروم ہو تو وہ روحِ انسانیت کی حقیقت سے کبھی آشنا نہیں ہو سکتا اس کا وجود انسانیت کے عطر سے محروم ہوتا ہے اور اس کی مثال کائنات میں ایک ایسے ذرہ کی ہو جاتی ہے جس کا کوئی مقصد نہ ہو۔ اسی طرح اگر کوئی سوسائٹی اس حقیقت سے ناآشنا اور اس کی شرافت و کرامت سے ناواقف ہو اس کی کوئی اہمیت اس کے نزدیک نہ ہو تو کہنا چاہیئے کہ یہ معاشرہ روحانی طور پر کھوکھلا ہے اور اعلیٰ روحانی قدروں کو پروان چڑھانے کا اس کے اندر مادہ نہیں ہے۔

امام رازیؒ کے نزدیک زوجین کے درمیان مودت و محبت کے جذبات ان کے روحانی ربط و اتصال کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ جذبات جنسی عوامل و محرکات کا نتیجہ ہرگز نہیں ہو سکتے یہ ایک فطری قانون ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہر انسان کے دل میں ڈال دیا جاتا ہے اور ان دونوں کے درمیان اس قدر محبت پیدا ہو جاتی ہے کہ غیر تو غیر اپنوں سے بھی اس قدر شدید محبت دیکھنے میں نہیں آتی۔ یہ خالق حکیم کی تدبیر ہے۔

امام فخرالدین رازی اپنی تفسیر کبیر میں رقمطراز ہیں کہ:۔

"زوجین کے درمیان رحم و مہربانی اور ایک دوسرے کے لئے ایثار کے جو جذبات ہوتے ہیں وہ رشتہ داروں اور قرابت داروں کے درمیان بھی نہیں ہوتے یہ جذبات مجرد شہوت جنسی کا نتیجہ نہیں ہوتے کیونکہ یہ تو عمر کے ڈھلنے کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے لیکن محبت کے جذبات ہیں وقت

گذرنے کے ساتھ جماؤ اور پختگی آتی جاتی ہے ایسا اس لئے ہے کہ یہ چیز اللہ کی جانب سے ہوتی ہے اگران دونوں کے درمیان تعلق کی بنیاد محض جنسی خواہشات کی تسکین ہوتی تو دونوں کی زندگی تلخ ہو کر رہ جاتی اور طلاق کی کثرت ہو جاتی۔ اس لئے کہنا چاہیئے کہ محبت کے یہ جذبات اللہ کی جانب سے ہوتے ہیں جس کا احساس صرف غور و فکر کرنے والے ہی کر سکتے ہیں"۔

اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے آیت کے آخر میں یہ ٹکڑا لگا دیا ہے

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ

بلاشبہ غور و فکر کرنے والوں کے لئے اس میں بڑی نشانیاں ہیں

امام موصوف کے مندرجہ بالا اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک بھی مودت و محبت کے جذبات تسکین جنسی کا نتیجہ نہیں ہیں وہ صاف صاف اسے اللہ کی رحمت کی کرشمہ سازی قرار دیتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک بھی ازدواج سے مراد ازدواج روحانی ہی ہے یہ خالق کائنات کا قانون ہے جس کا تعلق ضمیر انسانی سے ہے وہ روح کو جلا بخشتا ہے اور اس کے اندر رحمت و محبت پیدا کرتا ہے مادہ کی دنیا میں ہم اسے کوئی نام دینے سے قاصر ہیں۔

یہ نہایت بلند مقام ہے جہاں تک پہونچنے کے لئے ہمیں اپنے ضمیر اور عقل کو وسعت دینی پڑے گی اس کے بغیر ہم اس کی وسعت و ہمہ گیری کا اندازہ نہیں لگا سکتے اور ہمارا زاویۂ نظر محدود ہو کر خواہشات جنسی اور لذت جسمانی کے حصول تک رہ جائے گا۔ آیت کا خاتمہ بھی ایسے الفاظ پر ہوا ہے جو انسان کے احساس فکر و تدبر کو مہمیز کرتا ہے (إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ)

ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اس حقیقت کا ادراک کریں اور اپنی ازدواجی زندگیوں میں اسی شعور کو بیدار کریں ان اسباب کا پتہ لگائیں جن کے ذریعہ خود ہمارے اندر ایثار و محبت کے جذبات زیادہ سے زیادہ پیدا ہو سکیں ہمارا تعلق مجرد اختلاط جسمانی تک محدود نہ رہ جائے بلکہ ہم ایک دوسرے

کی روح میں اتر جائیں، خیر و شر اور نیک و بد کی موافقت و مخالفت میں شانہ بشانہ ہو کر ایک دوسرے کا تعاون کریں۔ ہمیں اس پہلو سے اپنا مطالعہ ضرور کرتے رہنا چاہیئے تاکہ ہمیں اندازہ ہو سکے کہ ہم روحانی اور جسمانی اعتبار سے ایک دوسرے کے کس قدر قریب ہیں اور ان مقاصد کو کس حد تک پورا کر رہے ہیں جن کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے ہمیں سونپی ہے۔ محض شادی کر کے یا اپنی گھریلو زندگی غم و آلام سے پاک کر کے زوجین اپنے حقوق و فرائض سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے ان دونوں کو ہمیشہ اس بات کا جائزہ لیتے رہنا چاہیئے کہ ان کی محبت کی بنیاد کیا ہے اگر انھیں اس بات کا احساس ہو کہ یہ محبت نفس انسان کی خواہش ذوق جمال اور اعلیٰ انسانی قدروں کی موجودگی کا نتیجہ ہے تو جان لینا چاہیئے کہ یہی وہ محبت ہے جسے قرآن مودت و رحمت کا نام دیتا ہے۔ اور یہ محبت بابرکت اور نتیجہ خیز ثابت ہوگی۔ لیکن اگر محبت کی بنیاد کچھ اور ہے تو جان لینا چاہیئے کہ یہ محبت نتیجہ خیز اور بار آور ثابت نہیں ہو سکتی اس کے وجوہ و اسباب پر ہم آئندہ گفتگو کریں گے۔

قانون امومت

قانون امومت کا روحانی پہلو

ماں اور بیٹے کی محبت کا تعلق فطرت انسانی ہے اس کے وجود و اسباب کا پتہ لگانا مادہ کی دنیا میں ناممکن ہے یہ ویسا ہی تعلق ہے جیسا کہ ایک مرد اور عورت کے درمیان ہوتا ہے بچہ زوجین کے عمل کا ایک روحانی پھل ہوتا ہے اس لئے یہ تعلق بھی روحانیت ہی پر مبنی ہوتا ہے۔ محسوسات کی دنیا میں کوئی ایسا پیمانہ نہیں ہے جو اس روحانی محبت کو ناپ سکے ہم اس سلسلہ میں صرف اسی قدر کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب کچھ ایک منظم قانون کے تحت ہو رہا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنے

مقصد حقیقی کو آسانی کے ساتھ حاصل کر سکے اور چونکہ اس کا تمام تر تعلق صرف دل سے ہوتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس دل کا تذکرہ مختلف مقامات پر مختلف طریقوں سے کیا ہے۔ جن میں بعض یہ ہیں: لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا (الاعراف: ۱۷۹)

(ان کے پاس دل ہیں مگر وہ ان سے سوچتے نہیں)

هُوَ الَّذِي أَنزَلَ السَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ (الفتح: ۴)

(وہی ہے جس نے مومنوں کے دلوں میں سکینت اتاری)

سَأُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ (الانفال: ۱۲)

(عنقریب میں کفر کرنے والوں کے دلوں میں رعب ڈال دوں گا)

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُم مِّن بَعْدِ ذَٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ (البقرہ: ۷۴)

(پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے پس یہ پتھر کے مانند ہو گئے)

ثُمَّ تَلِينُ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ (الزمر: ۲۳)

(پھر ان کے جسم اور ان کے دل نرم ہو کر اللہ کے ذکر کی طرف راغب ہو جاتے ہیں)

تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ (البقرہ: ۱۱۸)

(ان سب (اگلے پچھلے گمراہوں) کی ذہنیتیں ایک جیسی ہیں۔)

وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا فِي قُلُوبِكُمْ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَلِيمًا (الاحزاب: ۵۱)

(اور اللہ تمہارے دل کی باتوں کو جانتا ہے اور وہ بڑا ہی جانکار اور حکمت والا ہے۔)

قلب یا دل اپنے معروف معنیٰ میں اس عضو کا نام ہے جو ہر انسان کے سینے کے اندر موجود ہوتا ہے قرآن کریم قلب کا استعمال اس خاص عضو کے لئے نہیں کرتا بلکہ اس کے نزدیک اس سے مراد فطرت انسانی کی وہ مخصوص صلاحیتیں اور کمالات ہیں جن کے ذریعہ انسان حیوان سے ممیز ہوتا ہے

اور اس کے اندر خدا کی معرفت اس کا خوف اور اس سے ملاقات کا شوق پیدا ہوتا ہے ۔ یہ وہ روحانی حقائق ہیں جن کے اثرات ہم محسوس تو کر سکتے ہیں لیکن اس کی اصلیت یا حقیقت سے ہم پورے طور پر واقف نہیں ہو سکتے کیونکہ اس کا تعلق ضمیرِ انسانی سے ہوتا ہے حدیث نبوی ہے :

قلوب العباد بین اصابع الرحمٰن (احمد)

(انسان کے دل خدا کی انگلیوں کے درمیان ہیں)

آیت قرآنی بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے ۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ (الانفال:۲۴)

(جان رکھو کہ اللہ آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہے)

یہی حقائق اور قوانین ہیں جو ضمیرِ انسانی میں اپنا کام کرتے ہیں اسی مثال کے ذریعہ ہم قانونِ زوجیت اور قانونِ امومت کو سمجھ سکتے ہیں ۔

اس طرح گویا مامتا حمل، ولادت اور رضاعت سے قطع نظر روحانیت کا نام ہے جو اپنے بچّے کی پرورش صرف غذا، رحم اور عین رضاعت ہی سے نہیں کرتی بلکہ وہ اسے ایسے اخلاق و صفات سے آراستہ کرتی ہے جو اسے صحیح معنوں میں انسان بنا دے ایسا انسان جو نوعِ انسانی کے لئے ایک روحانی پھل ثابت ہو ۔ اسی معنیٰ کی طرف قرآن کریم کی یہ آیت اشارہ کر رہی ہے ۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ (النحل:۷۲)

(اور وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لئے تمہاری ہم جنس بیویاں بنائیں اور اسی نے ان بیویوں سے تمہیں بیٹے اور پوتے عطا کئے ہیں اچھی اچھی چیزیں تمہیں کھانے کو دیں ۔)

آئمہ تفسیر نے حفدہ کے متعدد معانی بتائے ہیں اس میں ایک رائے یہ ہے کہ حفدہ سے

مراد بیٹے ہیں۔ علامہ زمخشریؒ اپنی تفسیر کشاف میں اسی آیت کے متعلق رقمطراز ہیں کہ یہاں حفدہ سے مراد بیٹے ہیں گویا اصل عبارت یہ ہوئی کہ:

جعل لکم من ازوجکم اولاداً ھم بنون وھم حافدون ای جامعون بین الامرین

(اس نے تمہارے لئے تمہاری بیویوں سے بیٹوں کی تخلیق کی جو تمہارے بیٹے بھی ہیں اور تمہارے فرماں بردار بھی یعنی ان دونوں صفتوں سے متصف ہیں)

لغت کی مشہور کتاب لسان العرب میں الحفد کے درج ذیل معنی ہیں:

حَفَدَ: کام میں تیزی کرنا، خدمت کرنا۔ حضرت عمرؓ سے منقول ہے کہ انھوں نے قنوتِ فجر میں دعا مانگی جس کے الفاظ یہ تھے والیکَ نسعیٰ ونحفدُ ہم تیرے ہی طرف دوڑتے ہیں اور تیری ہی طرف لپکتے ہیں۔ محفود اس شخص کو کہتے ہیں جس کے ساتھی اس کی خدمت کریں اسکی تعظیم کریں اور فوراً اس کے احکام بجا لائیں"۔

اس مفہوم کے تحت حفدۃ کا لفظ ان لڑکوں کے لئے استعمال ہوگا جو اپنے والدین کی تعظیم و توقیر کریں ان کے احکام بجالانے کے لئے ہر وقت مستعد رہیں ان کی خوشی اور ناخوشی کا خیال رکھیں۔

یہ لفظ جب کسی وصی کی وصیت میں استعمال ہوگا تو اس سے مراد وہ عادات و رسوم نہیں ہوں گی جنھیں کوئی معاشرہ اعلیٰ قدروں میں شامل کرتا ہے اور اس سے متصف ہونے کو قابل فخر خیال کرتا ہے بلکہ اس سے مراد ہمیشہ وہ مقدس شعائر ہوں گے جن کی طرف قرآن نے بہت پہلے اشارہ کر دیا تھا:

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰـهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ

لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا ۝ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِي صَغِيرًا (الاسراء : ۲۳ ، ۲۴)

(تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو مگر صرف اس کی۔ والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو اگر تمہارے پاس ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہو کر رہیں تو انھیں اف تک نہ کہو نہ انھیں جھڑک کر جواب دو بلکہ ان سے احترام کے ساتھ بات کرو اور نرمی و رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو اور دعا کیا کرو کہ پروردگار ان پر رحم فرما جس طرح انھوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے والدین کی اطاعت ان سے حسن سلوک اور ان کی خدمت کے جتنے پہلو ہو سکتے ہیں سب کی نشاندہی کر دی ہے اور اس کا بیان اس نے اپنی عبادت کے ساتھ ملا کر کیا ہے۔ امام فخرالدین رازی کہتے ہیں کہ "والدین کی اطاعت اور خدا کی عبادت کی اس شدت سے تاکید کی اصل وجہ یہ ہے کہ انسان کی تخلیق میں اصل ہاتھ اللہ تعالیٰ کا ہے اور ظاہری سبب اس کی تخلیق میں والدین کا ہے اس لئے اس نے سب سے پہلے سبب حقیقی کی تعظیم کا حکم دیا اور اس کے بعد سبب ظاہری کی تعظیم کا۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ والدین کی اطاعت دراصل عبادتِ الٰہی کا مقدس ترین پہلو ہے جیسا کہ یہ آیت کریمہ اشارہ کر رہی ہے:

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ إِلَيَّ الْمَصِيرُ (لقمان: ۱۴)

(اور حقیقت ہے کہ ہم نے انسان کو اپنے والدین کا حق پہچاننے کی خود تاکید کی ہے۔ اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اسے اپنے پیٹ میں رکھا اور دو سال اس کا دودھ چھوٹنے میں لگے (اسی لئے ہم نے اس کو نصیحت کی کہ) میرا شکر کر اور اپنے والدین کا شکر بجا لا

میری ہی طرف تجھے پلٹنا ہے۔)

آیت مندرجہ بالا سے ثابت ہوتا ہے کہ والدین کے سلسلہ میں انسان کو اللہ تعالیٰ نے شکر کی وصیت کی ہے (ان اشکر لی ولوالدیک) یہاں ان دونوں کے شکر کی تاکید اللہ تعالیٰ نے اپنے شکر کے ساتھ جوڑکر بیان کی ہے اس طرح اسے بھی عبادت کا درجہ حاصل ہے۔ ایک خاص بات جس کی نشاندہی ائمہ نے کی ہے وہ یہ ہے کہ یہ "شکر" والدین کی اطاعت کا ایک الہٰی طریقہ ہے جس سے صحیح معنوں میں خدمت کا حق ادا ہو سکتا ہے۔ امام رازیؒ اپنی تفسیر میں اس آیت کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ:

"اللہ تعالیٰ نے غیر اللہ کی عبادت سے تو روکا ہے لیکن غیر اللہ کی خدمت کی اجازت ہے جو عبادت کی قریب ترین شکل ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدمت نہ صرف یہ کہ جائز بلکہ بعض حالات میں واجب ہو جاتی ہے مثلاً والدین کی خدمت"۔

خلاصہ یہ کہ حفد ایک ملکوتی صفت ہے جو بیٹوں کے دلوں میں والدین کی خدمت واطاعت کا جذبہ پیدا کرتی اور ان کی تعظیم وتوقیر کے لئے مہمیز کرتی ہے۔ اور اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ والدین کی خدمت کر کے وہ خدا کی خوشنودی حاصل کر سکیں۔

اس مقام پر 'حفد' کی اسی قدر تشریح ہم کافی سمجھتے ہیں۔ ایک خاص بات جس کا نگاہ میں رہنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ حفد کا تعلق قانونِ امومت سے نہیں ہے بلکہ یہ اس کا لازمی نتیجہ ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاللّٰہُ جَعَلَ لَکُم مِّنْ اَنفُسِکُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَکُم مِّنْ اَزْوَاجِکُم بَنِیْنَ وَحَفَدَۃً اس سے واضح ہوتا ہے کہ حفد قانونِ امومت میں نہیں آتا ہے بلکہ یہ اس کا لازمی پھل ہے۔ یہ بالکل ویسا ہی ہے جیسے ہم دیکھتے ہیں کہ مودت محبت کا تعلق گرچہ قانون زوجیت سے نہیں ہوتا مگر اسکا قانون زوجیت سے ایسا اٹوٹ رشتہ ہوتا ہے جسکے بغیر ہم قانون زوجیت کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ایسا دراصل اس لئے ہوتا ہے کہ

مودت ومحبت کے یہ جذبات انسان کی فطرت میں ہوتے ہیں اور قانون زوجیت اس کو بڑھاتا ہے اور اس کی آبیاری کرتا ہے۔ خدمت واطاعت کا یہی تعلق قانون امومت سے ہے یہ جذبات انسان کی فطرت میں پہلے ہی سے موجود ہوتے ہیں ماممتا اس کے اندر زندگی کی لہر دوڑا دیتی ہے اور اس طرح یہ ننھا سا پودا بچے کے دل میں پروان چڑھتا ہے اور ترقی کر کے درخت بن جاتا ہے۔ یہیں پر ایک خاص بات یہ جان لینی چاہیئے کہ قانونِ امومت قانونِ زوجیت سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ قانون زوجیت کا تعلق مرد اور عورت سے برابر کا ہوتا ہے جس کا پھل زوجین کے ملاپ سے حاصل ہوتا ہے وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۔ لیکن قانون امومت کا تعلق خاص بیوی سے ہوتا ہے۔ وہ خالص ایک روحانی کیفیت کے زیر اثر اپنے بچے کی پرورش کرتی ہے اور اسی کے نتیجہ میں بچے کے اندر اطاعت، خدمت اور شکرگزاری کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔

اس خصوصیت اور انفرادیت کی وجہ مندرجہ ذیل آیت میں بیان کی گئی ہے:

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَّفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ ط (لقمان: ۱۴)

والدین کے لئے شکر کی وصیت آیت سے بالکل صاف سمجھ میں آتی ہے۔ اَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ ۔ لیکن اس وصیت کی علت بیان کرتے ہوئے دو خاص چیزوں کی نشاندہی کی گئی ہے اور وہ ہے حمل اور رضاعت اس سے مقصود دراصل عورت کی انفرادیت کی طرف اشارہ اور اس کی اس روحانیت کا اظہار ہے جس کے زیر اثر وہ اپنے بچے کی تربیت کرتی ہے اور اس کے اندر اطاعت وخدمت گزاری کے جذبات پیدا کرتی ہے۔ وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ أَزْوَاجِكُم بَنِينَ وَحَفَدَةً ۔

اسی آیت میں اور ایک خاص بات ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قانون امومت محض روحانیت

پر مبنی ہے اور وہ ہے وَوَصَّيۡنَا الۡاِنۡسَانَ بِوَالِدَيۡهِ .... اَنِ اشۡكُرۡ لِىۡ وَلِوَالِدَيۡكَ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنے والدین کے لئے شکر کی وصیت کی، سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس وصیت کا طریقہ کیا تھا؟ اپنی وصیتوں اور معاہدوں کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ اس نے اسے انسان کی فطرت میں روزِ اوّل ہی سے رکھ دیا ہے اور اس عہد کو یاد دلانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے وحی کا نزول فرمایا تاکہ یہ چیز ہمیشہ انسان کے ذہن میں موجود رہے۔ مثال کے طور عہد ربوبیت کو لے لیجئے اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق ہی اسی فطرت پر کی ہے اور وحی کو اس کا رہنما بنا دیا ہے۔ بنی نوع انسانی سے اس طرح کا ایک معاہدہ ماضی میں ہو چکا ہے جس پر خود ان کی شہادت موجود ہے۔ (اَلَسۡتُ بِرَبِّكُمۡ .... ؟ قَالُوۡا بَلٰى) یہ اثبات دراصل اس بات کا اشارہ ہے کہ فطرت انسانی میں اس عہد کا اعتراف موجود ہے۔ اسی طرح والدین کی اطاعت اور ان کی خدمت گزاری کا بھی عہد ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ذہن انسانی میں بٹھا دیا ہے۔ چنانچہ تمام انسان اسے اعلیٰ انسانی قدروں میں شمار کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو نصیحت کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیز انسان کی فطرت میں چھپی ہوئی ہوتی ہے۔

جس کی نصیحت ہر شخص ایک دوسرے کو کرتا ہے لیکن اس فطرت خفی کو جلا کون بخشتا ہے؟ وہ ماں ہی کی ذات ہے جو اپنی فطری ممتا سے مجبور ہو کر حمل و رضاعت کی تکلیفیں گوارہ کرتی ہے اور ہزار مشقتیں اٹھا کر وہ بچے کے اس نازک پودے کی آبیاری کرتی ہے اور انھیں تکلیفوں کا ذکر قرآن نے اس طرح کیا:

وَوَصَّيۡنَا الۡاِنۡسَانَ بِوَالِدَيۡهِ‌ۚ حَمَلَتۡهُ اُمُّهٗ وَهۡنًا عَلٰى وَهۡنٍ
وَّفِصٰلُهٗ فِىۡ عَامَيۡنِ اَنِ اشۡكُرۡ لِىۡ وَلِوَالِدَيۡكَ ؕ اِلَىَّ الۡمَصِيۡرُ ۝

(لقمان: ۱۴)

قانونِ امومت کے فوائد

قانونِ امومت کے فوائد میں سرفہرست آدابِ حَفَد (انسان کے اندر اطاعت اور خدمت گزاری کی صفت) آتے ہیں جن کی مختلف شکلوں کی طرف ہم پیچھے اشارہ کرچکے ہیں۔ اس سے ہم اس قانون کی برکات کا اندازہ لگا سکتے ہیں اور ان اثرات کو جان سکتے ہیں جو اس کی بدولت انسانی زندگی میں آتی ہیں خصوصاً آج کے حالات میں جب کہ والدین اور اولاد کے تعلقات مودت و محبت نیز وفاداری اور اطاعت شعاری سے یکسر خالی ہوکر رہ گئے ہیں۔ یہاں ہم ان وجوہ اور اسباب سے بحث نہیں کریں گے جن کی وجہ سے یہ لعنت آج ہمارے معاشرے میں عام ہوئی ہے اس مقام پر صرف ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اگر پوری انسانیت کا خمیر ہمدردی و محبت، ایثار و غمخواری نیز اطاعت و فرمانبرداری کے جذبات سے خالی ہوجائے تو وہ کس قدر بے وزن ہوکر رہ جاتی ہے جب کہ اس سے پہلے جب وہ محض گوشت کا ایک لوتھڑا تھا تو دوسروں نے کس طرح اس کے ساتھ نرمی اور مہربانی کا سلوک کیا اس کی معمولی معمولی تکلیفوں پر بے چین ہوئے اور خود تکلیف سے رہ کر اسے آرام دینے کی پوری کوشش کی۔ لیکن آج جب وہ بڑا ہوچکا ہے تو اس کا دل ان جذبات سے یکسر خالی ہوچکا ہے اس کے اندر سے شکر گزاری اور احسان مندی کے جذبات بالکل ختم ہوچکے ہیں غیر تو غیر اپنے والدین تک کو وہ فراموش کر بیٹھا ہے۔ ایسا انسان صحیح معنوں میں انسان نہیں رہ جاتا ہے۔ اس کا ضمیر مرچکا ہوتا ہے اور وہ شیطان کا بندہ بن جاتا ہے۔

اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے ایسے ممالک جہاں اس طرح کی اعلیٰ اخلاقی قدریں ناپید ہوتی ہیں مادی لحاظ سے نہایت ترقی یافتہ ہوتے ہیں۔ لیکن میں پوچھتا ہوں اگر کوئی معاشرہ نیکی اور محبت کے جذبات سے خالی ہوجائے وہاں سے روحانیت اور اخلاقیات کا نام و نشان

مٹ جائے۔ ان کے اندر سے دوسروں کے لئے قربانی و ایثار کے جذبات ختم ہوجائیں تو ان کی زندگی کی کیا حقیقت رہ جاتی ہے؟ ایسی سوسائٹی جس کے افراد مشین کے بہرے گونگے پرزوں کی طرح ہو گئے ہوں کیا وہاں تقدس اور پاکیزگی نام کی کوئی چیز پائی جا سکتی ہے۔

ہم جیسے جیسے اس پر غور کرتے ہیں اس قانون کی برکتیں اور اس کے اثرات انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں سے ہمارے سامنے کھل کر آجاتے ہیں اور کسی حد تک ہم اس حکمت سے آشنا ہو جاتے ہیں جس کے تحت جنت کو ماں کے قدموں تلے رکھا گیا ہے۔

اس سے یہ قطعاً نہیں سمجھ لینا چاہئیے کہ قانونِ امومت کے فوائد محض آداب حفد کو جلا دیتے ہی تک محدود ہیں۔ نہیں یہ دراصل عبادت الٰہی کا بھی ایک جز ہے جیسا کہ ہم پیچھے بتا چکے ہیں۔ اس سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ انسانی زندگی میں عبادت کا دائرہ کس قدر وسیع ہے۔ اس کی وسعت میں وہ تمام بھلے کام آجاتے ہیں جسے انسان نیت کی پاکیزگی اور دل کی ستھرائی کے ساتھ انجام دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے کسی اور کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا بلکہ آدمی کا پاک جذبات کے ساتھ زندگی گزارنا اور دوسروں کی عزت و توقیر کرنا خود اسکو مہذب بناتا ہے اس کے اندر سے بیہودگی اور لاابالی پن ختم کرتا ہے اور اس کے تمام معاملات کو کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے سنوارتا ہے اور اس کی پوری زندگی مجموعی اعتبار سے نہایت مہذب بن جاتی ہے۔

اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ قانون امومت سراسر روحانیت پر مبنی ہے جو قوانین فطرت کے ضوابط کا پابند نہیں ہوتا۔ اس کا تمام تر تعلق اللہ کے احکامات سے ہوتا ہے اس کی پہچان اس کے آثار سے ہوتی ہے۔ اس کی طرف وحی الٰہی اشارہ کرتی ہے۔ اس کی حقیقت کا علم سوائے خدا کے اور کسی کو نہیں ہوتا۔ اس کی دیکھ بھال اور اس کا اہتمام انسان کو قوانین طبعیہ سے ماورا کر دیتا ہے اور اسے آفاقی بنا دیتا ہے اور اسی وقت انسان حسی اور روحی دونوں اعتبار سے مکمل ہوتا اور صحیح

معنوں میں اسی وقت زندگی بابرکت اور کامیاب کہی جانے کی مستحق ہوتی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ ایسا معاشرہ جس میں نیکی کا چلن ہو، لوگ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہوں احسان مندی اور تشکر کے جذبات پائے جاتے ہوں لوگوں کی زندگی کے جملہ اعمال عبادتی حیثیت کے حامل ہوں افراد کی پوری زندگی پر عالم غیب اور عالم شہادت کی روحانیت اور نورانیت چھائی ہو تو فی الواقع ایسا معاشرہ تمام غلاظتوں سے پاک ہوگا تمام مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے اور وہاں کے تمام لوگ خوش ہوں گے ہر طرف سکون و اطمینان کی فضا ہوگی اور صحیح معنوں میں وہ ایک مثالی معاشرہ کہلائے جانے کا مستحق ہوگا۔

وہ حالات ــــ جن میں قوانین زوجیت اور امومت اپنا اثر دکھاتے ہیں

قارئین دیکھ سکتے ہیں کہ ہم قوانین زوجیت اور امومت کی اس پوری بحث میں کہیں بھی کتاب الٰہی سے دور نہیں ہوئے۔ اس کے باوجود یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ موجودہ دور میں ان قوانین کے وہ فوائد اور اثرات ظاہر نہیں ہو رہے ہیں جن کی طرف ہم نے پیچھے اشارہ کیا ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں یہ کہ ہمارے بیان کئے ہوئے اکثر فوائد موجودہ دور میں نہیں حاصل ہو پا رہے ہیں۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟

یہ سوال ذہنوں میں ابھرتا ہے حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ دونوں قوانین اپنا اثر دکھانے کے لئے جن حالات وظروف کے متقاضی ہیں وہ آج کل کہیں نظر نہیں آتے۔

واضح رہے کہ قوانین روحانی بھی اپنا اثر دکھانے کے لئے کچھ شرائط کے پابند ہوتے ہیں جس طرح قوانین فطری اپنے عمل کے لئے حالات اور ظروف کے پابند ہوتے ہیں۔ یہ دونوں قوانین جیسا کہ ہم پیچھے بتا چکے ہیں روحانیت کے قبیل سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے ان کے اثرات

نتائج اور فوائد بھی کچھ مخصوص حالات اور شرائط کے پابند ہیں۔

ذیل میں ہم بعض اہم شرائط کا تذکرہ کر رہے ہیں۔

ا۔ سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ زوجین کا ملاپ اس طریقہ کے مطابق ہو جسے شریعت نے مشروع کیا ہے۔ اسی کے ذریعہ انسانی تعلقات میں طہارت اور پاکیزگی پیدا ہو سکتی ہے یہ نہایت پاکیزہ فکر ہے جو قانون زوجیت اور امومت دونوں کو مضبوط سے مضبوط تر بنا دیتی ہے اور اس میں کسی طرح کی کوئی کمزوری یا شگاف پیدا نہیں ہونے دیتی کیوں کہ ان دونوں قوانین کی ترقی کا اصل راز آدمی کا جنسی تعلقات میں کرامت کا احساس ہے اور کرامت کا یہ احساس زنا اور آشنائیت سے کبھی پیدا نہیں ہو سکتا کیوں کہ اس طرح کا تعلق ــــ اس کے ان مفاسد سے قطع نظر جو مذہبی یا معاشرتی نقطۂ نظر سے اس میں پائی جاتی ہیں۔ بجائے خود انسانی ضمیر میں تحفظ اور وقار کا کوئی احساس نہیں پیدا کرتا۔ چنانچہ اگر کسی معاشرہ میں یہ مرض عام ہو اور وہاں کے باشندے اس طرح کے تعلقات میں کوئی قباحت نہ محسوس کرتے ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ان کا ضمیر بھی اسے اعلیٰ انسانی اقدار میں شمار کرنے لگا ہے اس کے برخلاف ان کی اکثریت اسے غلط سمجھے گی اور اسے بری نظر سے دیکھے گی۔ قانون زوجیت کے ترقی کرنے اور اسے پھلنے پھولنے سے روکنے میں اس طرح کے حالات کا بڑا دخل ہوتا ہے جس میں انسان کے جنسی تعلقات کی کرامت کا احساس دلوں سے کھرچ دیا گیا ہو یہی وجہ ہے کہ دو زناکاروں یا دو غلط تعلقات رکھنے والوں کے درمیان اس طرح محبت، رحم اور ایثار کا جذبہ کبھی پیدا نہیں ہو سکتا جیسا کہ ان دونوں کے درمیان ہوتا ہے جنھوں نے حلال طریقے سے ایک دوسرے کا ساتھ نباہنے کا وعدہ کیا ہو۔

فطری بات ہے کہ جو چیز قانون زوجیت کو ختم کر دیتی ہے وہی قانون امومت کو بھی عمل کرنے سے روک دیتی ہے۔ چنانچہ وہ حمل جو شادی کا نتیجہ ہوتا ہے جس میں مذہبی پابندیوں کا لحاظ نہ کیا جائے یا اسی طرح وہ حمل جو آپسی محبت یا زنا کا نتیجہ ہوتے ہیں وہ ماں کے اندر وہ احساس محبت ہرگز نہیں پیدا

کر سکتے ہیں جو قانون امومت کا تقاضہ ہوتا ہے کیوں کہ ان کا دل پاکیزگی کے احساس سے خالی ہوتا ہے۔ اسی طرح اس بچے کے اندر بھی ماں کے لئے تقدس اور احترام کا وہ جذبہ ہرگز نہیں پیدا ہو سکتا جس کی ماں فی الحقیقت مستحق ہوتی ہے۔

ہو سکتا ہے کہ اس طرح کے ماں اور بیٹوں کے درمیان ایک انسیت پیدا ہو جائے مگر یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اسے ممتا کا وہ تقدس اور وقار بھی مل جائے جو اسے خدا کی اطاعت اور اس کی گھیری ہوئی حدود میں رہ کر حاصل ہو سکتا تھا اور اس کا کوئی خاص اثر نہ تو بیٹوں پر ہو سکتا ہے اور نہ ہی سوسائٹی پر کیوں کہ ممتا کا تقدس اس سے چھن چکا ہوتا ہے۔

یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ سے تعلق اور اس سے والہانہ وابستگی قوانین زوجیت اور امومت کی پہلی سیڑھی ہے۔ چنانچہ جس دل میں خدا کی محبت اور اس سے والہانہ وابستگی کی کیفیت نہ پائی جاتی ہو اس کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے بچے کے اندر ایسی روحانیت پروان چڑھا سکے جو اسے صحیح معنوں میں نیک اور صالح اولاد بنائے اور اس کے اندر بہترین اخلاق و کردار پیدا کر سکے۔

قرآن مجید میں حضرت عمرانؑ کی بیوی کے اسوہ کو ایک قابل تقلید نمونہ کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے جن کا تعلق اللہ سے اس قدر گہرا تھا کہ انھوں نے اپنے پیٹ کے بچہ کو جس نے ابھی دنیا میں قدم بھی نہیں رکھا تھا اسے اللہ کی راہ میں وقف کر دیا۔ دل کا یہی سوز تھا جس نے بچی کے اندر پاکیزہ ترین جذبات پیدا کر دیئے۔ اور بڑی ہو کر اس نے پوری دنیا کو خیر و برکت اور شرافت و کرامت سے بھر دیا۔ قرآن مجید نے اس دعا کو ان الفاظ میں نقل کیا ہے۔

رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَکَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ ۔ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

(آل عمران: ۳۵)

(میرے پروردگار، میں اس بچے کو جو میرے پیٹ ہے تیری نذر کرتی ہوں وہ تیرے ہی کام کے

کے لئے وقف ہوگا میری اس پیشکش کو قبول فرما تو سننے اور جاننے والا ہے۔)

اور اس طرح گویا وہ اپنے حق سے دستبردار ہوگئیں اور اسے خدا کے لئے وقف کر دیا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس پیشکش کو قبول فرمایا اور اسے ایک مثالی اولاد بنایا۔

بلاشبہ یہ ماؤں کے لئے ایک قابل تقلید اسوہ ہے۔ جس کی مثال پوری تاریخ میں خال خال ہی ملتی ہے۔

یہ بچی کوئی اور نہیں بلکہ حضرت مریم علیہا الصلوٰۃ والسلام ہیں جن کے بارے میں قرآن مجید نے یہ الفاظ کہے ہیں۔

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَّ اَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا (آل عمران: ۳۷)

(آخر کار اس کے رب نے اس لڑکی کو بخوشی قبول فرمایا اور اسے بڑی اچھی لڑکی بنا کر اٹھایا۔)

اور صرف اسی پر بس نہیں کیا بلکہ ان کو اور ان کے بیٹے کو پوری دنیا میں ایک ممتاز مقام عطا کیا اور حضرت عیسیٰؑ کو ان برکتوں سے نوازہ جس کی طرف وہ خود اپنے قول میں اشارہ کرتے ہیں۔

وَّبَرًّا بِوَالِدَتِيْ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا (مریم: ۳۲)

(اور اپنی والدہ کا حق ادا کرنے والا بنایا اور مجھ کو جبار اور شقی نہیں بنایا۔)

اور اسی برکت کو وسعت دیتے ہوئے مزید فرمایا:

وَّجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ ۠ وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا (مریم: ۳۱)

(اور مجھے بابرکت کیا جہاں بھی میں رہوں، اور نماز و زکوٰۃ کی پابندی کا حکم دیا جب تک میں زندہ رہوں۔)

چنانچہ اس عظیم الشان برکت کے اثرات سے ہم سب واقف ہیں کہ انھوں نے اپنی زندگی میں کس طرح یہودی مادہ پرستوں اور دوسری طاغوتی طاقتوں کی صفوں میں ہلچل پیدا کر دی اور اپنے بعد انھوں

نے وہ اخلاقی تعلیمات چھوڑیں جو رہتی دنیا تک باقی رہیں گی۔

ہمارا خیال ہے کہ اس بحث کی وضاحت کے لیے تنہا یہی مثال کافی ہے اس کے بعد کسی اور مثال کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔

۲۔ قانونِ زوجیت کے عمل کی دوسری شرط یہ ہے کہ زوجین کے مابین مضبوط تعلقات ہوں دونوں کے دل ایک دوسرے کی محبت سے معمور ہوں اس کے بغیر صحیح ازدواجی زندگی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ذہنی ہم آہنگی اور دائمی نباہ کی خواہش اور فکری شرافت و کرامت اس کے لئے شرائط اولین ہیں نیز دونوں کے دلوں میں یہ احساس بھی ہو کہ انھیں ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔

اور اس احساس کی نوعیت کچھ اس طرح ہو کہ مرد عورت کو اپنے لئے باعث سکون خیال کرے اور عورت مرد کو اپنا قوام سمجھے۔ شوہر کو اس بات کا احساس ہو کہ اس کے سکون کے لئے بیوی ایک روحانی ضرورت ہے۔ اور اسے اس بات کا احساس ہو کہ مرد کی قوامیت اس کی نگرانی اور حمایت و حفاظت اس کے لئے نہایت ضروری ہے اور کسی بھی حال میں اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتی۔ اسے مرد کی ضرورت حسی اور معنوی دونوں اعتبار سے ہے کیوں کہ وہ ایک کمزور مخلوق ہے جیسے حمل، رضاعت اور حیض جیسے حوصلہ شکن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اور اس کے لئے اسے ایک مضبوط سہارے کی ضرورت ہوئی ہے جو مرد کے اندر بدرجہ اتم پایا جاتا ہے اس لئے وہ مرد کی جانب سے بے لطفی اور بے توجہی کو کبھی برداشت نہیں کر سکتی۔

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اگر زوجین کے درمیان تعلقات کی یہ پختگی ختم ہو جائے اور دائمی نباہ کا وہ عہد جو انھوں نے استوار کیا تھا ٹوٹ جائے یا ان کے ذہن فکر کی بلندی اور روح کی پاکیزگی سے خالی ہو جائیں تو حقیقت میں زوجیت کی روح ختم ہو جاتی ہے اور ان کے تعلقات کی نوعیت خالص جنسی اور مادی رہ جاتی ہے ان کے دل انسانیت کے جوہر سے خالی ہو جاتے ہیں اور ان کی آپسی محبت

ومحبت نیز قربانی وایثار کے لئے کوئی بنیاد باقی نہیں رہ جاتی ہے۔

تعلقات کی اس نوعیت کو ہم زنا یا آشنائی سے تعبیر نہیں کر سکتے کیوں کہ زانیوں کے درمیان ازدواجی رشتہ نہیں ہوتا اس کے برعکس میاں اور بیوی ازدواجی زندگی کو برقرار رکھنے کے خواہش مند ہوتے ہیں لیکن کچھ ایسے عوامل پیدا ہو جاتے ہیں جو زندگی کو برقرار رکھنے میں رکاوٹ ثابت ہوتے ہیں۔

اسے ایک مثال کے ذریعہ اس طرح سمجھئے کہ کسی گھر میں میاں اور بیوی دونوں کماتے ہیں اور دونوں دن دن بھر کام کر کے شام کو تھکے ماندے گھر واپس آتے ہیں۔ ان کی ساری جد وجہد اور پوری تگ و دو صرف اس بات کے لئے ہوتی ہے کہ وہ کس طرح زیادہ سے زیادہ پیسہ کمائیں اور اپنا معاشی معیار اونچا کریں، چمکتی کار ہو، شاندار بنگلہ ہو اور نفیس ملبوسات ہوں۔ اور اسی کو حاصل کرنے کے لئے وہ اپنی پوری زندگی داؤں پر رکھ دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے گھر میں ذہنی سکون اور احساس محبت تو بالکل ختم ہو جائے گا اور ان کی زندگی بے لطف، بے مزا اور بے کیف ہو کر رہ جائے گی۔ عورت کسی طرح بھی اپنے آپ کو شوہر سے کم نہیں سمجھے گی کیوں کہ وہ بھی اسی کی طرح کماتی ہے اور اس طرح ان کی خانگی زندگی برباد ہو کر رہ جائے گی اور رشتہ زوجیت کی وہ تمام بنیادیں مٹ جائیں گی جنھوں نے انھیں جمع کیا تھا۔

خانگی زندگی کے بقا کی پہلی بنیاد یہ ہے کہ عورت مرد کے لئے سکون کا باعث ہو۔ ذرا بتایئے کہ کیا وہ عورت باعث سکون ہو سکتی ہے جو دن بھر کارخانے میں کام کرتی ہو اور جب اس کا شوہر گھر آئے تو وہ یا تو کارخانے میں ہو یا اگر گھر میں ہو تو دن بھر کی تھکی ہوئی؟

خانگی نظام کے بقا واستحکام کی دوسری بنیاد یہ ہے کہ مرد عورت کا قوام ہے اور یہ اس معنی میں کہ گھر کے تمام معاملات میں اس کا حکم مانا جائے لیکن اس صورت میں کیا ایسا ممکن ہوگا جب کہ عورت بھی اسی کی طرح محنت کرتی ہو اور گھر کے اخراجات برداشت کرتی ہو۔؟

یاد رہے کہ ہم یہاں عورتوں کی ملازمت کے سلسلہ میں جواز یا عدم جواز کی کوئی بحث نہیں کر رہے

ہیں۔ ہمارا موضوع بحث اس مقام پر صرف ان حالات وظروف کا جائزہ لینا ہے جو قوانین زوجیت کی نشو ونما میں ممد ومعاون ثابت ہو سکتے ہیں نیز ان اسباب کی وضاحت ہے جو ذہنی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے ان کے وظیفۂ زوجیت میں خلل انداز ہو سکتے ہیں۔ جہاں تک عورت کی زندگی میں مرد کی بالادستی کا تصور ہے وہ تو موجودہ حالات میں خارج از بحث ہو چکا ہے۔

مرد کا معاملہ بھی اس سے کچھ مختلف نہیں ہے وہ عورت کی مزدوری کو نہ صرف ٹھنڈے پیٹوں برداشت کرتا ہے بلکہ اسے اپنی آمدنی میں اضافہ سمجھتا ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس کی زندگی سکون سے محروم ہو گئی ہے اور عورت پر بالادستی کا تصور بھی اب ممکن نہیں رہا۔ نتیجہ کے طور پر ہم اس کا ہولناک انجام خانگی نظام کی بربادی کی صورت میں دیکھ رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو زندگی اعلیٰ انسانی اقدار سے خالی ہو چکی ہو اور جس کا مقصد صرف مادہ کا حصول ہو گیا ہو وہ کبھی پر سکون اور مطمئن نہیں ہو سکتی، اخلاقی اقدار اس میں ہرگز نہیں پنپ سکتیں اور اس کی انسانیت تباہ ہو کر رہ جاتی ہے۔

یقیناً یہی سبب ہے جس کی وجہ سے قانون زوجیت سے وہ ثمرات ونتائج نہیں حاصل ہو پا رہے ہیں جو اس سے حاصل ہونے چاہئیں اور میاں بیوی کے تعلقات اس قدر کمزور ہو چکے ہیں کہ معمولی گھریلو جھگڑے بھی اسے ختم کر دینے کے لئے کافی ہوتے ہیں۔

اس کے بعد شاید ہمیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اس کے اثرات ماں کی ممتا پر کس قدر شدید ہوتے ہیں۔ ہر وہ عورت جو گھر کا خرچ چلانے کے لئے مرد کے شانہ بشانہ کام کرتی ہے لازمی طور پر اس کے احساسات وخیالات بدل جاتے ہیں۔ اب وہ گھر کے اندر شرم وحیا اور اخلاق وعفت کا پیکر بن کر رہنے والی عورت نہیں ہوتی۔ اس کے اندر اپنی کمائی کا غرور ہوتا ہے مادیت اس کا مقصد زندگی قرار پاتی ہے اور اس کی روحانیت مر جاتی ہے اور وہ ایسے قواعد وضوابط کو نہیں برداشت کرتی جو اسے ایک مثالی ماں بنائیں اور اس کے تقدس کو چار چاند لگا سکیں۔

یاد رہے کہ نکاح محض جنسی عمل کے استعداد کا نام نہیں ہے اسی طرح حمل اور رضاعت کی استعداد بھی ماں بننے کے لئے کافی نہیں ہوتی ہے۔ ہم پیچھے حکمت الٰہی کی ان تفصیلات پر روشنی ڈال چکے ہیں جس کے تحت ایک مرد اور عورت رشتۂ زوجیت میں منسلک ہوتے ہیں۔ یہ ملاپ دراصل ایک مرد اور عورت کا نہیں بلکہ ایک انسان کا دوسرے انسان سے ہوتا ہے۔ جس کا مقصد اس روئے زمین پر ان معنوی ثمرات و برکات کا حصول ہے جو عام طور پر مادہ کی دنیا میں ممکن نہیں ہوتا۔ یہ وہی ثمرات ہیں جنھیں ہم "مودت اور رحمت" کے نام سے جانتے ہیں۔ اسی طرح امومت کا معاملہ بھی ہے کیوں کہ ممتا محض ولادت اور حمل کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ایک خاص روحانی کیفیت ہے جو اپنے بچے کے دل میں روحانیت کی شمعیں روشن کرتی ہے اور اس طرح پوری سوسائٹی اس کی روشنی سے جگمگا اٹھتی ہے۔

اس طرح اسلام کا نظام معاشرت زندگیوں میں ایک انقلاب برپا کرتا ہے اور سوسائٹی میں پھیلے ہوئے تمام مادی علائق کو ختم کر کے روحانیت کی قندیلیں جلاتا ہے۔

مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں ہم اس کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ قوانین زوجیت اور امومت کو عمل سے روکنے میں کون سے عوامل و اسباب کار فرما ہیں؟ نظام زوجیت سے روحانیت کیوں ختم ہوگئی ہے؟ اور لڑکوں کے اندر سے والدین کی اطاعت و فرمانبرداری کے جذبات کیوں ختم ہوتے جارہے ہیں؟

۳۔ قانون زوجیت کے عمل کرنے کی تیسری شرط یہ ہے کہ زوجین کے تعلقات میں تقدس اور وقار ہو ان کے تعلقات مادی علائق سے بلند ہوں۔ گویا کہ شادی کا مقصد ایک ایسا روحانی پھل ہے جو زمین کے بس کا نہیں ہے نہ طبعی قوانین کے تحت اس کی پیداوار ہو سکتی تھی۔ یہ کیا چیز ہے؟ اس کا مقصد صرف بچوں کی پیدائش نہیں ہے بلکہ اس سے مراد ان دونوں کے روحانی تعلقات ہیں اور اس کے ذریعہ وہ ایک مقدس اور پاک رشتہ میں بندھتے ہیں اور عبادت الٰہی کے بعد سب سے زیادہ اسی کی اہمیت ہے کیوں کہ یہ چیز ربط و تعلق کے ایک ایسے حسین باب کا آغاز کرتی ہے جو آدمی کے نفس کو پاک اور اس کے ضمیر کو شاداب کر دیتا ہے۔

اور اس تعلق کی سب سے پہلی کڑی یہ ہوتی ہے کہ ان دونوں کے ذہن میں یہ بات واضح رہتی ہے کہ انسان کی سب سے قیمتی چیز اس کی انسانیت ہے اگر اس کے عقائد، اعمال اور افعال ٹھیک ہیں تو وہ سب سے اچھا ہے۔ اس طرح ان دونوں کی محبت روحانی محبت ہوتی ہے جو نفس کی آلائشوں سے پاک ہوتی ہے اس محبت کا تمام تر تعلق اس کے ضمیر اور روح سے ہوتا ہے۔ اسی لئے ان دونوں کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ دونوں اپنے رفیقِ زندگی کے اس روحانی جمال کو پرکھیں اور یہ دیکھیں کہ ان کے ساتھی کے اندر اخلاق کی کتنی بلندی، روح کی کتنی پاکیزگی اور کردار کی کتنی پختگی ہے تب صحیح معنوں میں وہ ایک آئیڈیل میاں بیوی بن سکتے ہیں۔

بس اس مقام پر اتنا ہی کافی ہے اور قوانین زوجیت وامومت سے پورا فائدہ حاصل کرنے کے لئے ان شرائط کی تکمیل ناگزیر ہے۔

مندرجہ بالا اوصاف کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو آنحضرتؐ اور آپ کی بیوی حضرت خدیجہ کی زندگی اس کا بہترین نمونہ ہے۔ یہ رشتہ تمام مادی علائق سے پاک ہو کر صرف روحانی تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دل کی گہرائیوں سے چاہتے تھے اور ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ محبت کا یہ انتہائی جذبہ دراصل ان کی فکری رفعت اور اخلاق کی بلندی کا نتیجہ تھا۔ اسی لئے حسن ظاہری اور عمر کا فرق ان کے تعلقات کے اٹوٹ رشتہ میں ذرہ برابر بھی رخنہ نہیں پیدا کر سکا اس کے برخلاف ان کی زندگیوں کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ رسالت سے پہلے بھی ان کے تعلقات ناقابل تصور حد تک مضبوط اور مستحکم تھے اور رسالت کے بعد تو یہ اور مضبوط ہو گئے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگائیے جب آپ پہلی بار وحی الٰہی سے خوفزدہ ہو کر ہانپتے کانپتے حضرت خدیجہؓ کے پاس پہونچتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے خدیجہ مجھے اپنی جان کا اندیشہ ہے اس موقع پر کوئی اور بیوی ہوتی تو تسلی دینا تو درکنار وہ خود بھی کانپ جاتی مگر حضرت خدیجہؓ کے الفاظ سنئے فرماتی ہیں ہرگز نہیں۔ اللہ آپ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا

کیوں کہ آپ تو صلہ رحمی کرتے ہیں۔ دور دراز سے آئے ہوئے مہمانوں کی مہمان نوازی کرتے ہیں تھکے ہوؤں کا بوجھ اٹھواتے ہیں مفلسوں کے لئے کماتے ہیں اور ناگہانی مصیبتوں میں لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔"

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ دعوت کے سخت مراحل میں جب آپ پر کبھی اضمحلال طاری ہوتا ہے تو یہی حضرت خدیجہؓ ہیں جو آپ کو غلط اندیشوں سے بچاتیں اور آپ کو تسلیاں دیتی ہیں یہی وجہ ہے کہ حضرت خدیجہؓ کا جس سال انتقال ہوا اسے آپ نے اپنے لئے "عام الحزن" قرار دیا اور تاریخ رسالت میں یہ سال "سال غم" کے نام سے معروف ہوگیا۔

پھر آپ دونوں کے درمیان جو مودت و محبت رسالت سے پہلے اور رسالت کے بعد پائی جاتی ہے وہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔ اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ آنحضرتؐ حضرت خدیجہ کو پوری زندگی نہیں بھلا سکے اور نہایت محبت و شفقت کے ساتھ آپ کا تذکرہ کرتے تھے حتیٰ کہ آپ کی بعض بیویاں حضرت خدیجہ کی قسمت پر رشک کرتی تھیں جن کی تعریف ان کی وفات کے بعد بھی ان کا عظیم شوہر کیا کرتا تھا۔

گذشتہ صفحات میں ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس میں ہم نے قرآن مجید اور احادیث کی روشنی میں ان تمام اجتماعی، معاشرتی اور نفسیاتی شرائط کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی ہے جو قوانین زوجیت و امومت کو نشو و نما اور ترقی دینے میں ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں اور اس کے اصل مقصد الفت و محبت کو فروغ دے سکتے ہیں۔

اس موقع پر یہ یاد رکھنا چاہئیے کہ مندرجہ بالا دونوں قوانین میں اگر مذکورہ بالا شرائط کا لحاظ نہ کیا جائے تو یہ قطعاً بار آور اور نتیجہ خیز نہیں ہو سکتے۔ اور اس کا انجام ان پھولوں اور کلیوں کا سا ہوگا جن کی مناسب دیکھ ریکھ نہ کی گئی ہو اور ان کی نشو و نما میں ان قوانین طبعیہ کا لحاظ نہ کیا گیا ہو جو ان کی نشو و نما اور ارتقاء کے لئے ناگزیر ہے۔

مثال کے طور پر ان قوانین کو بروئے عمل لانے کے لئے سب سے پہلی چیز جس کا لحاظ کرنا ضروری ہے وہ اللہ کے حقوق ہیں اور اس کے بعد ان اعلیٰ اخلاقی اور انسانی قدروں کا نمبر آتا ہے جن کا تذکرہ اوپر ہوچکا ہے۔ یہ اس کا بلند ترین معیار ہے۔ اس کا پست ترین معیار یہ ہے کہ عورت اس سرحد تک پہونچ جائے جسے ہم آشنائیت یا زنا جیسے ناموں سے موسوم کرتے ہیں یا یہ کہ وہ کوئی ایسی سروس شروع کردے جس میں اسے غیر مردوں سے تعلقات رکھنے کے لئے مجبور ہونا پڑے اور بچوں کی حفاظت ونگہداشت اور شوہر کی خدمت اس کے لئے ناممکن ہوجائے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں بچوں کے تعلقات بھی اپنے والدین کے ساتھ خوشگوار نہیں ہوسکتے اور ان کے دل میں ان کے لئے ادب و احترام کا وہ مقدس جذبہ ہرگز پروان نہیں چڑھ سکتا جو شریعت پر عمل کرنے کی صورت میں پروان چڑھتا۔

ان حالات کو نظر میں رکھتے ہوئے جب ہم اسلام کے ان خطوط پر نظر ڈالتے ہیں جنھیں اسلام نے ایک آئیڈیل اور مثالی ازدواجی زندگی کی حیثیت کو نظر میں رکھ کر کھینچا ہے تو دل خود بخود اعتراف حق پر مجبور ہوجاتا ہے اور زبان اس کی حمد وثنا سے تر ہوجاتی ہے۔ دیکھئے ایک سادہ سی آیت میں اسلام نے کس طرح ایک کامیاب ازدواجی زندگی کا تصور پیش کیا ہے۔ فرمایا

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ ۖ وَقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُم مُّلَاقُوهُ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ (البقرہ: ۲۲۳)

(تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں تمہیں اختیار ہے جس طرح چاہو اپنی کھیتی میں جاؤ مگر اپنے مستقبل کی فکر کرو اور اللہ کی ناراضی سے بچو خوب جان لو کہ تمہیں ایک دن اس سے ملنا ہے اور اے نبی جو تمہاری ہدایت کو مان لیں انھیں (فلاح وسعادت کی) خوشخبری دیدو)

۴۔ ماں کے حقوق

اسلام محبت، فرمانبرداری اور حسن سلوک کا مذہب ہے، اور زندگی کے تمام معاملات میں

وہ اسی حق کا علمبردار ہے۔ اسی لئے جب وہ کسی عمل کی تعریف کرتا ہے یا کسی کے حق کی وصیت کرتا ہے تو اس کے پیچھے نہایت عظیم الشان حقائق کارفرما ہوتے ہیں۔ چنانچہ ماں کی عظمت اور اسکی اہمیت و حیثیت کا تذکرہ کہیں تو اس نے الگ تھلگ کیا ہے اور کہیں مجموعی طور پر والدین کے حقوق کے ضمن میں اس سے اس کا مقصد والدین سے عارضی محبت کے جذبہ کو ختم کرنا نیز ان احساسات و خیالات کو اجاگر کرنا اور فروغ دینا ہے جو والدین سے تعلق کے جذبہ کے تحت انسان کے ذہن و دماغ میں موجود ہوتے ہیں۔ وہ محبت اور احترام میں کسی تکلف یا تصنع کا قائل نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ اس نے والدین کا مقام و مرتبہ بہت بلند کیا ہے اور ان کی خدمت کو نہایت اہم قرار دیا ہے۔ والدین کی خدمت کا یہ جذبہ یوں تو وہ پوری سوسائٹی میں اجاگر کرنا چاہتا ہے مگر خاص طور پر حقیقی اولاد کے اندر وہ اسے رچا بسا دیکھنا چاہتا ہے کیوں کہ اس دنیا میں اس کا وجود دراصل اس کے والدین ہی کا مرہون منت ہے۔ اس موقع پر میں باپ کی قربانیوں اور ماں کی شفقت اور پریشانیوں کا تذکرہ نہیں کروں گا جو انھوں نے اس کی پرورش کے دوران اٹھائی ہیں ان قربانیوں سے قطع نظر اس کا وجود بجائے خود اس کے والدین کی طرف سے اس کے حق میں ایک ایسا احسان ہے جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

پھر انسان کا وجود بھی کوئی ایسی بڑی نعمت نہیں ہے اگر اس کی زندگی کا مقصد کھانا، پینا اور عیش کرنا ہو۔ اصل نعمت تو انسان کے لئے اللہ تعالیٰ کی وہ معرفت ہے جس کے ذریعہ وہ کائنات میں بکھری ہوئی نشانیوں کو پہچانتا ہے اور خدا کے جلال و جمال اور اس کی علم و حکمت کا مشاہدہ کرتا ہے۔ انسان کا یہی وہ باطنی شعور ہے جس کی بنا پر اسے دوسروں سے ممیز کیا گیا ہے اسی کے ذریعہ وہ جمالِ کائنات کا مشاہدہ کرتا ہے اور غور و فکر اور نصیحت و عبرت کے لئے وافر سامان پاتا ہے اور اسی سے اس کی روح میں تازگی اور بالیدگی آتی ہے اور یہی وہ منزل ہے جہاں پہونچ کر آدمی دنیا کی تمام پریشانیوں کو بھول جاتا ہے اور اسے اس دنیا ہی میں وہ سب کچھ مل جاتا ہے جس کی توقع اسے آخرت میں بھی اس کے دل میں طہارت و کرامت کے

چشمے پھوٹ پڑتے ہیں اور علم و آگہی کی وہ قوت اسے حاصل ہوتی ہے جو اسے لازوال بنا دیتی ہے۔ جب وہ آنکھیں کھول کر کائنات کا مشاہدہ کرتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ پوری کائنات اس کی حمد و ثنا کر رہی ہے چنانچہ اس کا دل جذباتِ سفلیہ سے پاک ہو جاتا ہے اور دنیا کی پوری سلطنت خدا کی سلطنت کے مقابلہ میں اسے ہیچ اور بے مایہ نظر آتی ہے۔ یہ وہ روحانی کیفیت ہے جو ایک مومن موحد کو خدا برتر و بالا کی خالص عبادت سے حاصل ہوتی ہے۔

اور جسے یہ عظیم الشان نعمت یا اس کا تھوڑا سا بھی حصہ حاصل ہو جاتا ہے اسے گویا لازوال نعمت مل جاتی ہے اور اس کا سبب اس کے والدین ہی تو ہوتے ہیں اسی لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو والدین کے ساتھ احسان کرنے کی تلقین کی ہے اور اس کا تذکرہ ایمان اور عبادت کے ساتھ کیا ہے:

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (الانعام: ۱۵۱)

اے نبیؐ، ان سے کہو کہ آؤ میں تمہیں سناؤں تمہارے رب نے تم پر کیا پابندیاں عائد کی ہیں: یہ کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (النساء: ۳۶)

اور تم سب اللہ کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو۔

صرف یہی نہیں بلکہ اپنے شکر کے ساتھ ان کا شکر ادا کرنا بھی واجب ٹھہرایا ہے۔

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصَالُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ (لقمان: ۱۴)

(اور یہ حقیقت ہے کہ ہم نے انسان کو اپنے والدین کا حق پہچاننے کی خود تاکید کی ہے اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اسے اپنے پیٹ میں رکھا اور دو سال اس کا دودھ چھوٹنے

میں رگے (اسی لئے ہم نے اس کو نصیحت کی کہ) میرا شکر کر اور اپنے والدین کا شکر بجالا میری ہی طرف تجھے پلٹنا ہے)

آیات بالا پر غور کرنے سے دو حقیقتیں واضح طور سے ہمارے سامنے آتی ہیں:

اوّل: یہ کہ اللہ تعالیٰ کا والدین کی تعظیم کا حکم دینا اور وہ بھی اس طرح کہ اس کا تذکرہ اپنے معاً بعد کرنا یہ ثابت کرتا ہے کہ اسلام کی نظر میں دونوں (والدین) یکساں تقدس و احترام کے مستحق ہیں۔

دوم: یہ کہ ان کی تعظیم کرنا، ان کی خدمت کی بجاآوری میں جلدی کرنا، ان کے جملہ احکام کی فوری تعمیل کرنا تمام بیٹوں کے اوپر فرض ہے۔

مندرجہ بالا دونوں حقوق ماں اور باپ دونوں کے درمیان مشترک ہیں ان کی ادائیگی میں دونوں کی حیثیت یکساں ہے۔ البتہ دو مقامات ایسے ہیں جن میں ماں انفرادی حیثیت کی حامل ہے۔

مقام اوّل: حمل اور رضاعت یہ دو امتیازی اوصاف ہیں جن کا تعلق صرف ماں سے ہے حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِیْ عَامَیْنِ یہ دو امتیازی اوصاف ہیں جن کا تذکرہ اس آیت میں کیا گیا ہے۔ اس میں ماں کو کتنی مشقت اور پریشانی ہوتی ہے اس کا تذکرہ کرکے خواہ مخواہ ہم وقت ضائع کرنا نہیں چاہتے کیوں کہ یہ سب کو معلوم ہے۔ البتہ قابل غور بات یہ ہے اگر مجرد سبب کا وجود والدین کی تعظیم کے لئے کافی ہے تو حمل اور رضاعت تو اس حق کو اور بڑھا دیں گے۔

امام فخر الدین رازیؒ اس آیت کی تفسیر میں رقمطراز ہیں:

حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت سے یہ اس کے وجود کا باعث بنی۔ وَّفِصٰلُهٗ فِیْ عَامَیْنِ کا مطلب یہ ہے کہ صرف یہ اس کے وجود ہی کا باعث نہیں بنی بلکہ اس کے سبب سے اس کا بقاء و تحفظ بھی ہوا چنانچہ یہ دونوں چیزیں مل کر ماں کو نہایت اہم مقام عطا کرتی ہیں اور

اس کی خدمت عبادت الٰہی کے مشابہ ہو جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ آپؐ نے ماں کی خدمت کو عبادت کی ایک صورت قرار دیا ہے"۔ (متفق علیہ)

اس طرح گویا ماں کی حیثیت صرف اسی قدر نہیں کہ وہ اس کو عالم وجود میں لانے کا باعث بنی ہے بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ اس کے بقاء و تحفظ کی ضامن بنی ہے اس لئے بلا شک و شبہ اس کی اہمیت ہونی چاہیئے جس کا تذکرہ ہم اوپر امام رازیؒ کے الفاظ میں کر چکے ہیں۔

مقام دوم: اس کی دوسری حیثیت یہ ہے کہ قانون امومت کا قیام اسی کے ذریعہ ہوتا ہے۔

قانون امومت کا تذکرہ تفصیل سے اوپر ہو چکا ہے۔ انتہائی اختصار سے کام لیتے ہوئے ہم اس کے بارے میں صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک خاص روحانی صلاحیت کا نام ہے جو صرف ماں کے اندر پائی جاتی ہے۔ اور اس کے توسط سے اللہ تعالیٰ بچے کی فطرت میں وہ صلاحیت ودیعت کرتا ہے جس کے ذریعہ وہ والدین کے حقوق پہچانتا ہے اور اس کے دل میں والدین کے لئے تعظیم کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ اسی روحانی صلاحیت کی طرف اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اشارہ کیا ہے: وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا وَجَعَلَ لَكُم مِّنْ أَزْوَاجِكُم بَنِينَ وَحَفَدَةً۔ پیچھے ہم تفصیل کے ساتھ "حفدہ" کی تشریح کر چکے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ دراصل نبوۃ کی صفت ہے بلکہ فی الواقع یہ اس کی لازمی شرط ہے جو قانون امومت کو بروئے کار لانے کے لئے ناگزیر ہے۔ اسی بنا پر یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ اگر بالفرض کسی زمانہ میں علم الحبار کے ماہرین نر کے مادہ منویہ اور مادہ کے بیضے کو لے کر اس کی اچھی طرح دیکھ ریکھ کر کے اسے زندگی دینے میں کامیاب ہو جائیں تو گرچہ وہ ہاتھ پاؤں والے ایک ذی روح کو وجود بخشنے میں کامیاب ہو جائیں گے مگر فی الواقع وہ اس کے اندر وہ روحانیت پیدا کرنے سے قاصر رہیں گے جو بچوں کے اندر "قانون امومت" کے توسط سے پیدا ہوتی ہے یا ہو سکتی ہے۔

اس لئے جنین کا ماں کے پیٹ میں ہو کر ایک خاص مرحلے سے گزرنا "قانون امومت" کی

ایک کڑی شرط ہے ورنہ اس کے بغیر بچہ کے اندر وہ خاص کیفیت ہرگز نہیں پیدا ہو سکتی جسے قرآن "حفد" سے تعبیر کرتا ہے۔

اس طرح ماں کی ایک خصوصیت گویا یہ بھی ہے کہ وہ اپنے بچے کے اندر قوت تمیز اور قوت احساس پیدا کرتی ہے جو اللہ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے اور یہی وجہ ہے کہ ماں کا مقام و مرتبہ باپ کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے۔

چنانچہ شرعی نقطۂ نظر سے بیٹے کے اوپر ماں کا حق باپ کے مقابلے میں تین گنا زیادہ ہے اس کی دلیل حضرت ابو ہریرہؓ کی وہ روایت ہے جسے حدیث کی مستند کتابیں بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ہمارے ساتھ رہنے والوں میں کون ہمارے حسن سلوک کا زیادہ مستحق ہے آپؐ نے فرمایا تمہاری ماں۔ اس نے پھر پوچھا آپؐ نے پھر یہی جواب دیا کہ "تمہاری ماں" اس کے بعد اس نے پھر پوچھا تو آپ نے جواب دیا کہ "تمہارا باپ" اسی لئے علماء حدیث کے درمیان اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ماں کو باپ کے مقابلہ میں تین گنا زیادہ حق حاصل ہے۔

واضح رہے کہ ہم یہاں ماں کے ان بہت سے حقوق کا تذکرہ نہیں کر رہے ہیں جو بیٹے کے اوپر ماں کے تعلق سے واجب ہوتے ہیں اور جنھیں پوری دنیا جانتی ہے ان میں سے چند حقوق یہ ہیں ماں کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کرنا، اس کے اخراجات برداشت کرنا وغیرہ اس کو ہم نے نظر انداز اس حد لئے کر دیا ہے کہ اس کا تذکرہ ہم اس سے پہلے کہیں کر چکے ہیں دوسری بات یہ ہے کہ ہم یہاں ماں کے امتیازی اوصاف پر روشنی ڈال رہے ہیں، ورنہ ماں کا حق کتنا بڑا ہے اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگائیے کہ ایک مرتبہ ایک شخص نے آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول میں جہاد میں حصہ لینا چاہتا ہوں مگر میں اس کا اہل نہیں ہوں آپؐ نے پوچھا کہ کیا تمہارے والدین میں سے کوئی زندہ ہے

اس نے جواب دیا ہاں میری ماں زندہ ہیں آپؐ نے فرمایا کہ جاؤ خلوص دل کے ساتھ ماں کی خدمت کرو اگر تم ایسا کروگے تو تمہیں حج، عمرہ اور جہاد تینوں کا ثواب ملے گا (طبرانی)

اسی سے ملتا جلتا ایک اور واقعہ ہے جسے ابن ماجہ، نسائی اور حاکم نے صحیح سندوں کے ساتھ روایت کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول میں جہاد میں شریک ہونا چاہتا ہوں اور اسی سلسلہ میں آپ سے مشورہ کرنے حاضر ہوا ہوں آپ نے پوچھا کہ کیا تمہاری ماں موجود ہے اس نے جواب دیا ہاں۔ آپؐ نے فرمایا "اسی کے ساتھ رہو اور اس کی خدمت کرو کیوں کہ جنت اس کے قدموں کے نیچے ہے۔"

یہ واقعات اپنی نوعیت کے اعتبار سے خواہ کتنے ہی چھوٹے کیوں نہ ہوں مگر ان کے اندر ذہن انسانی کو ماں کی خدمت اور اطاعت پر ابھارنے کا جو جذبہ موجود ہے انسان کی زبان اسے بیان کرنے سے قاصر ہے۔

فصل ششم

حجاب

تمہید

لفظ حجاب ایک طویل مدت تک خود مسلمانوں کے لئے اجنبی رہا ہے۔ حالات اور زمانہ کے تغیر کے ساتھ ساتھ اس لفظ کو بھی مختلف معانی پہنائے گئے چنانچہ بہت سے لوگوں نے اس کا مفہوم یہ سمجھا کہ عورت کو پردہ کرانے کا مطلب یہ ہے کہ اسے کال کوٹھری میں بٹھا دیا جائے جہاں سے وہ کہیں آجا بھی نہ سکے چنانچہ بہت سے گھروں کا معاملہ یہ ہوگیا کہ شادی کے بعد عورت سوائے اپنے باپ کے گھر کے اور کہیں آجا نہیں سکتی تھی اور شوہر ہی کے گھر سے اس کا جنازہ اٹھتا تھا۔ اسی کو خاندان کی شرافت کی دلیل سمجھا جاتا تھا اور اسے ایک قابل تعریف فعل تصور کیا جاتا تھا۔

چنانچہ گھر میں رہتے ہوئے نہ تو وہ کسی اجنبی کو دیکھ سکتی تھی اور نہ کوئی اجنبی اسے دیکھ سکتا تھا حتیٰ کہ اگر کسی عورت کو کوئی خطرناک مرض لاحق ہو جاتا تو کسی ڈاکٹر تک کو اس بات کی اجازت نہیں ہوتی تھی کہ وہ اکر اسے دیکھ لے کیوں کہ وہ اس کے لئے اجنبی ہوتا تھا۔

یہاں تک کہ اہل خاندان میں سے بھی بہت سے لوگوں کو اسے دیکھنے کی اجازت نہیں تھی صرف کچھ مخصوص لوگ ہی ہوتے تھے جنھیں اس کو دیکھنے کی اجازت ہوتی تھی مثال کے طور پر خود بیوی کے والد اور بھائی نیز شوہر کے والد ہی کو اس بات کا حق تھا کہ وہ اسے دیکھ سکیں ان کے علاوہ کسی اور کو دیکھنے کی مطلق اجازت نہیں تھی چاہے وہ کوئی قریب ترین رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔

بعض جگہوں پر یہ بندش ذرا ڈھیلی ہوتی تھی وہاں عورت کو اعزہ واقارب کو دیکھنے جانے اور ان سے ملاقات کرنے کی اجازت ہوتی تھی البتہ یہ گھر سے صرف رات کے وقت نکل سکتی تھی کیوں کہ رات میں لوگوں کی نگاہیں پڑنے کا اندیشہ کم ہوتا تھا۔ بعض امیر گھرانوں میں کہیں آنے جانے کے لئے عورت چھکڑا گاڑی استعمال کرتی تھی لیکن اس کی کھڑکیاں بالکل بند ہوتی تھیں اور اگر کھڑکی نہیں ہوتی تو اوپر سے پردہ ڈال

دیا جاتا تھا۔

البتہ خواہ پیدل ہوں یا سواری پر دونوں حالتوں میں پردے کا خصوصی اہتمام کیا جاتا تھا اور کپڑوں کے اوپر ایک اور ڈھیلا ڈھالا کپڑا ڈال لیا جاتا تھا جو اس کے پورے جسم کو سر سے لے کر پیر تک ڈھانپ لیتا تھا اور وہ اس قدر لمبا ہوتا تھا کہ زمین پر گھسٹ کر چلتا تھا چنانچہ اس کے پیر کا بھی کوئی حصہ نظر نہیں آتا تھا بعض مقامات پر تو آج تک یہ لباس دیکھنے میں آتا ہے۔ یہ قوم کے اکابرین، اہل ثروت، صاحبان علم و منصب کا فیشن تھا جو شہر میں بھی رائج تھا اور دیہاتوں میں بھی۔

چنانچہ مشہور متجدد قاسم امین بک نے جب آزادیٔ نسواں کا علم اٹھایا تو اس نے اسی طرح کے مروجہ حجاب کا سہارا لے کر اس کو غیر شرعی قرار دیا اور بتایا کہ اس طرح کا پردہ انسانی مساوات کے خلاف ہے اور اس سے عورت کی شخصیت مجروح ہوتی ہے چنانچہ اس نے اپنے انھیں دلائل کی بنا پر مشہور دانشوروں اور اصحاب فکر و نظر کو اپنے حق میں ہموار کر لیا۔

ازواج مطہرات رضؓ کا پردہ

عام طور پر یہ بات مشہور ہے کہ پورے قرآن میں صرف ایک "آیت حجاب" کے علاوہ اور کوئی آیت اس سلسلہ میں نہیں اتری ہے، اس کا نزول ازواج مطہرات کے سلسلہ میں ہوا اور اس کے پس منظر میں وہ مشہور واقعہ ہے جو اس آیت کی شان نزول میں مختلف سیرت اور تفسیر کی کتابوں میں موجود ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتَ النَّبِیِّ اِلَّآ اَنْ یُّؤْذَنَ لَکُمْ اِلٰی طَعَامٍ غَیْرَ نٰظِرِیْنَ اِنٰهُ وَلٰکِنْ اِذَا دُعِیْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَاْنِسِیْنَ لِحَدِیْثٍ اِنَّ ذٰلِکُمْ کَانَ یُؤْذِی النَّبِیَّ فَیَسْتَحْیٖ مِنْکُمْ وَاللّٰهُ لَا یَسْتَحْیٖ مِنَ الْحَقِّ وَاِذَا سَاَلْتُمُوْھُنَّ مَتَاعًا

فَسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمًا

(الاحزاب: ۵۳)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو نبی کے گھروں میں بلا اجازت نہ چلے آیا کرو نہ کھانے کا وقت تاکتے ہو ہاں اگر تمہیں کھانے پر بلایا جائے تو ضرور آؤ مگر جب کھانا کھالو تو منتشر ہو جاؤ باتیں کرنے میں نہ لگے رہو تمہاری یہ حرکتیں نبی کو تکلیف دیتی ہیں مگر وہ شرم کی وجہ سے کچھ نہیں کہتے اور اللہ حق بات کہنے میں نہیں شرماتا نبی کی بیویوں سے اگر تمہیں کچھ مانگنا ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگا کرو یہ تمہارے اور ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لئے زیادہ مناسب طریقہ ہے تمہارے لئے یہ ہرگز جائز نہیں ہے کہ اللہ کے رسول کو تکلیف دو اور نہ یہ جائز ہے کہ ان کے بعد ان کی بیویوں سے نکاح کرو یہ اللہ کے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے، تم خواہ کوئی بات ظاہر کرو یا چھپاؤ اللہ کو ہر بات کا علم ہے)

یہی آیت ہے جس کو آیت حجاب کہا جاتا ہے۔ اس آیت کے نزول سے بہت پہلے حضرت عمرؓ محض شریعت کی مزاج شناسی اور وحی الٰہی سے فطری لگاؤ کی بنا پر یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ ازواج مطہرات کو پردہ کرنا چاہیئے چنانچہ متعدد بار آپ نے حضور کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ اپنی بیویوں سے کہئے کہ وہ پردہ کریں مگر چونکہ قانون سازی میں آپ خود مختار نہ تھے اس لئے آپ اشارہ الٰہی کے منتظر رہے۔ صحیحین میں حضرت انس بن مالکؓ کی روایت موجود ہے کہ حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ کے یہاں بھلے اور برے سب طرح کے لوگ آتے ہیں، کاش آپ اپنی ازواج مطہرات کو پردہ کا حکم دے دیتے چنانچہ یہ آیت حجاب نازل ہوئی اور اس کا نزول اس صبح کو ہوا جس میں آپ نے حضرت زینبؓ بنت جحش سے شادی کی

پھر یہی نہیں بلکہ ایک دوسری روایت میں یہ ہے کہ حضرت عمر کی رائے یہ تھی کہ یہ پردہ اس نوعیت کا ہو کہ نہ تو کوئی ان کے گھر میں جائے اور نہ وہ خود گھر سے باہر نکلیں حتیٰ کہ کسی کی نگاہ بھی انھیں نہ دیکھ سکے۔

روایتوں میں ایک اور واقعہ نقل کیا جاتا ہے کہ آپؐ کی ایک بیوی حضرت سودہ بنت زمعہؓ ایک رات اپنی کسی ضرورت سے باہر نکلیں اور وہ پردہ سے تھیں اتفاق سے حضرت عمرؓ کی نظر ان پر پڑ گئی اور چونکہ آپ طویل قامت تھیں اس لئے حضرت عمرؓ نے انھیں پہچان لیا اس پر آپ نے کہا کہ بخدا اے سودہؓ آپ ہماری نگاہوں سے چھپ نہیں سکتیں، پہچان میں آجاتی ہیں اس لئے آپ باہر مت نکلیں۔ یہ سن کر حضرت سودہؓ نبی کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں آپؐ اس وقت حضرت عائشہؓ کے حجرے میں تھے وہاں پہونچ کر آپ نے سارا واقعہ من وعن بیان کر دیا آپ اس وقت شام کا کھانا کھا رہے تھے کہ اسی اثنا میں آپؐ پر الہامی کیفیت طاری ہوئی اور آپ نے فرمایا کہ "لَقَدْ اُذِنَ لَکُنَّ اَنْ تَخْرُجْنَ لِحَاجَتِکُنَّ" (تمہیں اس بات کی اجازت ہے کہ تم اپنی ضرورتوں کے تحت باہر نکل سکتی ہو۔)

(یہ واقعہ امام بخاری کی صحیح اور تفسیر کی دیگر کتابوں میں مثلاً طبری، ابن کثیر اور قرطبی کی تفسیروں میں دیکھا جا سکتا ہے حوالہ کے لئے ان کتابوں کی طرف رجوع کریں)

حافظ ابن حجر فتح الباری میں رقمطراز ہیں کہ:۔

آیت حجاب کے نزول کے بعد حضرت عمرؓ اس بات کا خاص اہتمام کرنے لگے کہ وہ پردہ میں لپٹی ہوئی کسی خاتون کی شخصیت سے واقف نہ ہو سکیں اور اس میں انتہائی مبالغہ سے کام لیا چنانچہ آپ کو اس سے روک دیا گیا اور ازواج مطہرات کو اپنی ضرورتوں کے پیش نظر باہر نکلنے کی اجازت بھی دے دی گئی تاکہ یہ مشقت میں نہ پڑیں۔

مندرجہ بالا تفصیلات سے ثابت ہوتا ہے کہ ازواج مطہرات کے لئے جو پردہ فرض کیا گیا تھا وہ ان کے چہرے اور ہتھیلیوں کا پردہ تھا ان کی شخصیت کا پردہ نہیں تھا بشرطیکہ وہ مستور ہوں

چنانچہ مشہور فقیہ قاضی عیاض اسی کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ :

"اس میں علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ امہات المومنین کے اوپر جس طرح کا پردہ کرنا فرض کیا گیا تھا اس میں چہرہ اور ہتھیلی داخل ہے کھولنے کی انھیں خاص موقع پر بھی اجازت نہیں تھی خواہ وہ شہادت کا معاملہ ہو یا اس کے علاوہ"

چنانچہ اسی کے پیش نظر معزز گھرانوں کی خواتین نے اپنے لئے بھی وہی پردہ تجویز کیا جسے اللہ تعالیٰ نے ازواج مطہرات کے لئے پسند فرمایا تھا اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں تھی کہ افضل پر عمل ہو سکے چنانچہ عہد نبوت سے اسی پر عمل ہوتا رہا اور جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا اس پر مزید پابندیوں کا اضافہ ہوتا چلا گیا جس کے بعض پہلوؤں کی طرف ہم ابتدا میں اشارہ کر چکے ہیں، یہ پابندی مزید شدت اختیار کرتی گئی اور انھیں کو خاندان کی شرافت و کرامت کی دلیل ٹھہرایا گیا اور اس طرح معاملہ اس حد تک پہونچ گیا کہ دین کے مزاج اور روح سے بھی صرف نظر کر لیا گیا۔[1]

چنانچہ قاسم امین نے جب پردے کو اعتراض کا نشانہ بنایا تو اس کی مراد اسی پردہ سے تھی جو فی زمانہ رائج تھا جہاں تک شرعی پردے کی بات تھی تو اس نے اس پر کوئی تنقید نہیں کی۔

مسلمان عورت کا پردہ

پردہ مسلمان عورت کا وہ امتیازی وصف ہے جسے اسلام نے اس کے لئے مقرر کیا ہے تاکہ اس کے ذریعہ جاہلیت کی بے پردگی کو ختم کیا جا سکے اور مخلوط معاشرت میں پیدا ہونے والی بے

---

[1] چنانچہ کسی شادی کا پیغام دینے والے کو بھی اس بات کی اجازت نہیں تھی کہ وہ اپنی ہونے والی بیوی کو دیکھ سکے حالانکہ شریعت میں اسکی اجازت موجود تھی مگر فی الواقع وہ شریعت پر کہاں عمل کرتے تھے وہ تو معاشرے کے چلن کو دیکھتے تھے۔

راہ روی اور جنسی آوارگی کو مٹایا جا سکے۔

یہاں مناسب تھا کہ اسلام کی حقانیت کو ثابت کرنے کے لئے اور اسلامی معاشرہ میں عورتوں کی حیثیت اور اہمیت کو واضح کرنے کے لئے زمانۂ جاہلیت کے کچھ ایسے واقعات نقل کئے جاتے جن سے معلوم ہوتا کہ اس زمانہ میں عورتوں کے ساتھ کیسا بہیمانہ رویہ اختیار کیا جاتا تھا اور کس طرح انھیں محض شہوت رانی اور ہوس پرستی کا آلۂ کار بنالیا گیا تھا لیکن ان ناپاک اور فحش واقعات کا تذکرہ کر کے ہم قارئین کے ذہنوں کو پراگندہ نہیں کریں گے۔

البتہ اس کی تھوڑی سی جھلک دکھانے کے لئے ہم قارئین کو قرآن کی ان آیتوں کے مطالعہ کا مشورہ ضرور دیں گے جن میں زمانۂ جاہلیت کے عادات و اخلاق پر تنقید کی گئی ہے اور ان کے اندر پھیلی ہوئی برائیوں پر ان کی گرفت کی گئی ہے اور ساتھ ہی ایسے احکامات دیئے گئے ہیں جن پر عمل کر کے وہ اپنی زندگیوں کو سنوار سکتے ہیں۔ ان آیتوں پر غور کرنے والا فوراً سمجھ جائے گا کہ زمانۂ جاہلیت میں عورت کی کیا حیثیت تھی اور اسلام نے کس طرح اسے احترام و تقدس کے منصب پر سرفراز کیا اور اس کو وہ زندگی دی جس نے اسے محترم و مکرم بنا دیا۔ زمانۂ جاہلیت میں وہ مردوں کے لوٹ کھسوٹ کا ذریعہ بنی ہوئی تھی اسلام نے اسے اعلیٰ انسانی قدروں سے روشناس کرایا اور اسے ذلت و پستی کے گڑھے سے نکال کر روحانیت اور نورانیت کے اعلیٰ مقام پر فائز کیا اسے انسان سمجھنے میں بھی تامل کیا جاتا تھا اسلام نے نہ صرف اسے انسان بنایا بلکہ اس کی خدمت اور اطاعت کو خدا کی عبادت بتایا۔ ذیل میں ہم ایسے چند مخصوص ضوابط کا تذکرہ کریں گے جو اجتماعی اور نفسیاتی اعتبار سے کسی سوسائٹی میں بہت قیمتی سمجھے جاتے ہیں۔

اس سے پہلی خصوصیت تو یہ ہے کہ اسلام نے مرد اور عورت کے درمیان صحیح معنوں میں مساوات قائم کی اور دونوں کو اپنے تمام احکامات کا یکساں مخاطب قرار دیا۔ چنانچہ قرآن مجید میں جہاں ہمیں یہ آیت ملتی ہے کہ قُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَیَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ

یعنی یہ کہ اے نبیؐ مومن عورتوں سے کہو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ ذہن اس سے ملی ہوئی یہ آیت بھی ہماری نظروں سے گزرتی ہے: قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ۔ یعنی یہ کہ اے نبیؐ مومن مردوں سے کہو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ یہاں اس آیت میں ہم عورت اور مرد دونوں سے خطاب کی یکسانیت کو ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

۲۔ اسلام دل کی صفائی اور قلب کی طہارت کرنا چاہتا ہے وہ انسان کے باطن کو درست کرتا ہے اور سوسائٹی کے ماحول اور اس کی فضا کو فحشاء و منکر کی تمام تحریکات سے پاک کر دینا چاہتا ہے کیوں کہ ان تحریکات کا سرچشمہ انسان کے باطن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ مرد عورت کی تفریق کا بالکل قائل نہیں ہے کیوں کہ یہ دونوں الگ الگ سوسائٹی کے دو اہم عناصر ہیں۔ مثال کے طور پر آیت حجاب کو لیجئے۔ فرمایا

وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ۔

اس آیت پر غور کیجئے صاف نظر آئے گا کہ اس کے مخاطب مرد اور عورت دونوں ہیں اور اس سے اس کا مقصود دل کے چور کو پکڑنا ہے چنانچہ آیت کے اگلے ٹکڑے میں صاف طور سے اس کی وضاحت کر دی گئی کہ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ۔ یہ ٹکڑا اس دعوے کا ناقابل تردید ثبوت ہے کہ اسلام کا اصل مقصد قلوب انسانی کی تطہیر ہے۔ امام طبری اس ٹکڑے کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ کا مفہوم یہ ہے کہ اس میں آنکھ سے گناہ کا احتمال ختم ہو جاتا ہے۔ اور اس کا خاص طور سے اس لئے ذکر کیا ہے کیوں کہ دل کے جذبات

بھڑکانے میں آنکھ بہت موثر رول ادا کرتی ہے عورت اور مرد دونوں اس تیر سے بہت جلد شکار ہوجاتے ہیں۔

چنانچہ غضِ بصر کا حکم اس حکمت کو ملحوظ رکھتے ہوئے دیا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ لوگ ہر وقت نیچے ہی دیکھتے رہیں اور کبھی اوپر نظر ہی نہ اٹھائیں۔ اگر ایسا ہوتا تو دراصل یہ مشقت میں ڈالنا ہوتا کیوں کہ انسان ایک سوسائٹی میں رہتا ہے وہ راستہ میں چلتا پھرتا ہے۔ راستے میں گندگی اور غلاظتیں بھی ہوتی ہیں اب اگر وہ ہر وقت اپنی نظر نیچی رکھے گا تو ہر قدم پر ٹھوکر کھائے گا اس لئے غضِ بصر کے حکم کا یہ مدعا ہرگز نہیں ہے۔ اس کا مقصود دراصل یہ ہے کہ دل کو ان تمام خواہشات و میلانات سے پاک رکھو جن سے ذہن کی پراگندگی کے سوا اور کچھ ہاتھ نہیں آتا ہے۔ برخلاف اس کے قرآن مومنین اور مومنات کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ وہ اپنے دل و دماغ کو غلط چیزوں میں الجھانے کے بجائے اس سے وہ کام لیں جس سے معاشرہ اور سوسائٹی کا بھلا ہو۔ دماغ سے ایسی باتیں سوچیں جن سے وہ زندگی کی اعلیٰ قدروں سے آشنا ہوسکیں اور اپنی حقیقت کو پہچان سکیں۔ یہ چیزیں آدمی کو حوصلہ کی بلندی اور فکر کی پختگی عطا کرتی ہیں معمولی اور پست کاموں کی طرف سے اس کی توجہ ہٹا دیتی ہیں۔ ان تمام جذبات و احساسات کو لے کر آدمی جب اپنے ماحول پر نظر ڈالتا ہے تو اس کی نظر ہمت اور حوصلہ سے بھرپور ہوتی ہے وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں پر اپنی نگاہ کی توجہ صرف نہیں کرتا اور اگر اتفاق سے ایسی کسی چیز پر اس کی نظر پڑ بھی جاتی ہے تو اس پر زیادہ توجہ صرف نہیں کرتا ہے مثال کے طور پر اگر کسی حسین عورت پر اس کی نگاہ پڑ جاتی ہے تو اس کا دل و دماغ قابو سے باہر نہیں ہوتا وہ اپنی نگاہیں اس طرح پھیر لیتا ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو اور یہی حال ایک نیک اور پاکباز مومنہ کا بھی ہوتا ہے۔

۳۔ تیسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ اسلام انسان کو پاکباز، عفیف اور باحیا بنانا ہے جیسا کہ معلوم ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں جہاں اور بہت سے غلط رسوم و عادات رائج تھے وہیں اخلاقی بے راہ روی بھی عام تھی جس کا ارتکاب کھلے عام مرد اور عورت دونوں کرتے تھے۔

زمانۂ جاہلیت کی فاسد رسوم میں ایک رسم تبرج کی تھی۔ تبرج کے معنیٰ ہیں زینت اور محاسن

کا اظہار کرنا، چلنے میں ناز و انداز دکھانا، اٹھلاتے ہوئے چلنا، لچکے کھانا، جسم کو توڑنا، ایسی چال اختیار کرنا جسمیں ایک ادا پائی جاتی ہو[۱] چنانچہ اسلام جب آیا تو اس نے اس سے روک دیا اور فرمایا وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ (الاحزاب - ۴) یعنی یہ کہ زمانہ جاہلیت کے سے بناؤ سنگھار نہ دکھاتی پھرو۔ مطلب یہ ہے کہ انھیں حکم دیا گیا جس طرح اسلام سے پہلے تم سب اظہار زینت کے لئے طرح طرح کے طریقے اختیار کرتی تھیں اب اسے قطعی بند کردو۔ اوّل تو تم گھر سے باہر مت نکلو لیکن اگر اتفاق سے کوئی ضرورت پڑ جائے تو نکل سکتی ہو مگر پوری عصمت مآبی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور اس کی شکل اس نے یہ بتائی کہ اپنے اوپر چادر ڈال لو تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ یہ عفیف اور پاکدامن عورتیں ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِن جَلَابِيبِهِنَّ ۚ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَن يُعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ (الاحزاب: ۵۹)

(اے نبی! اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور مسلمان عورتوں سے کہدو کہ اپنے اوپر اپنے چادر کی گھونگھٹ ڈال لیا کریں اس تدبیر سے یہ بات زیادہ متوقع ہے کہ وہ پہچان لی جائیں گی اور انھیں ستایا نہ جائے گا[۲])

---

[۱] تبرج کی مزید وضاحت کے لئے ملاحظہ ہو تفسیر طبری اور تفسیر ابن کثیر آیت وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ

[۲] واضح رہے کہ علماء لغت کے درمیان جلباب کے معنیٰ کی تعین میں اختلاف ہے۔ لیکن ذخیرۂ لغت کا تتبع کرنے سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہی ہے کہ جلباب سے کم و بیش وہی مراد ہے جسے ہم گھونگھٹ یا نقاب کے نام سے جانتے ہیں جس کی لمبائی اس قدر ہوتی ہے کہ وہ عورت کے تمام پوشیدہ اعضاء کو ڈھانک سکتا ہے۔ چنانچہ ابن کثیر نے عکرمہ کے حوالہ سے ازار جلباب کی جو تفسیر کی ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ ایسا کپڑا جو عورت کے سر سینہ اور دوسرے اعضاء کو ڈھانک سکے۔

ایک اور غلط عادت جو جاہلیت اولیٰ میں عام طور پر رائج تھی وہ ابن کثیرؒ کے الفاظ میں یہ ہے :

"رات کے وقت شہر کے غنڈے مختلف جگہوں پر چھپ بیٹھ جاتے تھے اور آنے جانے عورتوں کو چھیڑتے تھے لیکن جب کسی عورت کو گھونگھٹ اوڑھے ہوئے دیکھتے تو اس کو چھوڑ دیتے تھے اس سے مطلق تعرض نہیں تھے"

چنانچہ مذکورہ بالا آیت کے فوراً بعد یہ اتری اور اس میں انھیں متنبہ کیا گیا کہ اگر وہ باز نہیں آئیں گے تو ان کی خیر نہیں ہے ۔ فرمایا :

لَئِن لَّمْ يَنتَهِ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ وَالْمُرْجِفُونَ فِي الْمَدِينَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُونَكَ فِيهَا إِلَّا قَلِيلًا ۝ مَّلْعُونِينَ ۖ أَيْنَمَا ثُقِفُوا أُخِذُوا وَقُتِّلُوا تَقْتِيلًا (الاحزاب : ۶۰،۶۱)

(اگر منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں خرابی ہے اور وہ جو مدینہ میں ہیجان انگیز افواہیں پھیلانے والے ہیں اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے تو ہم ان کے خلاف کارروائی کرنے کے لئے تمہیں اٹھا کھڑا کریں گے پھر وہ اس شہر میں مشکل ہی سے تمہارے ساتھ رہ سکیں گے ان پر ہر طرف سے لعنت کی بوچھاڑ ہوگی، جہاں کہیں پائے جائیں گے پکڑے جائیں گے اور بری طرح مارے جائیں گے ۔)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے دونوں گروہوں کے جرم کی نوعیت یکساں بتائی ہے اور ان کے لئے سزا بھی ایک ہی طرح کی تجویز کی ہے بادی النظر میں تو عورتوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے والوں کا جرم سیاسی جوڑ توڑ کرنے والے مجرمین سے کہیں ہلکا نظر آتا ہے ۔ لیکن اسلام کی نظر میں فی الحقیقت دونوں طرح کے جرائم یکساں حیثیت رکھتے ہیں کیوں کہ پہلی قسم کے لوگ اگر حکومت کے ظاہری ڈھانچے کو نقصان پہونچاتے ہیں تو موخر الذکر افراد اس کے روحانی نظام کی بیخ کنی کر رہے ہوتے ہیں ۔

اس طرح اسلام پوری نوع انسانیت کو جاہلی رسوم وعادات کی پیروی سے باز رکھتا ہے اور انھیں شریعت کے ان قوانین کی پیروی کی دعوت دیتا ہے جو عورت کو شرافت وکرامت سے ہمکنار کرتا ہے، غنڈوں اور آوارہ مزاجوں کا ہاتھ پکڑتا ہے اور پوری انسانیت کے اندرون کی صفائی اور ان کے قلوب کی تطہیر کرتا ہے۔

۴۔ چوتھی صفت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کی تخلیق جن قوانین فطرت کو سامنے رکھ کر کی ہے دونوں اسے دستورِ زندگی بنالیں۔ نہ تو مرد اپنے فطری دائرہ کو پھلانگے اور نہ عورت اپنی حدود فطرت سے تجاوز کرے۔ مرد کے لئے نہ تو یہ جائز ہے کہ وہ اپنی فطرت کو مسخ کرے اور عورتوں سے تشبہ اختیار کرے اور نہ کسی عورت کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ قوانین فطری سے انحراف کرے اور مردوں سے تشبہ اختیار کرے۔

صحاح کی مستند ترین کتابوں میں ابن عباسؓ سے ایک حدیث ان الفاظ میں مروی ہے کہ:۔

"اللہ کے رسولؐ نے عورتوں سے تشبہ اختیار کرنے والے مردوں اور مردوں سے تشبہ اختیار کرنے والی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے"۔

دوسری حدیث ابوہریرہؓ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں۔

"اللہ کے رسولؐ نے عورتوں جیسا کپڑا پہننے والے مردوں پر اور مردوں جیسا کپڑا پہننے والی عورتوں پر لعنت بھیجی ہے"۔

جہاں تک مرد اور عورت کے تشبہ کا تعلق ہے تو اکثر لوگ اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کیوں کہ ان کے خیال میں جہاں اس سے آدمی کی شخصیت اور مروت داغدار ہوتی ہے وہیں یہ لباس حد درجہ ہیجان انگیز اور جنسی جذبات کو بھڑکانے والے بھی ہوتے ہیں۔ یہ اسباب ہیں جن کی بنا پر ہر شریف آدمی اس سے نفرت کرتا ہے لیکن اسلام کی نظر میں اس سے نفرت کرنے کی ایک اور وجہ بھی ہے اور وہ ہے مرد وعورت کی نوعیتوں میں اختلاف یہ حکمت اس آیت سے واضح ہوتی ہے۔ وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ۔ یہاں ہمیں یہ تو نہیں معلوم کہ اللہ تعالیٰ نے

ہر چیز کو جوڑے جوڑے کیوں بنائے ہ مگر ہم یہ ضرور جانتے ہیں کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی کوئی حکمت ضرور پوشیدہ ہے اور یہ کہ نر و مادہ کی تخلیق فطرت کائنات سے ہم آہنگ ہے نیز یہ کہ دونوں ایک دوسرے کے لئے باعث عزت و توقیر ہیں۔ اب جہاں تک مرد اور عورت کے باہمی تشبہ پر لوگوں کی نفرت کا معاملہ ہے تو اس کی وجہ صرف یہی نہیں ہے کہ اس سے آدمی کی شخصیت اور وقار مجروح ہوتا ہے۔ اسلام کی نظر میں اس سے نفرت کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ ایک طرح سے قوانین فطرت کے خلاف جنگ ہے جس سے حکمت الٰہی پامال ہوتی ہے۔ یاد رہے کہ انسانیت ایک عظیم قانون کا نام ہے بلکہ مطلقاً اسے ایک عظیم الشان قانون کہنا چاہیئے اب اگر وہی اپنے نظام فطرت سے انحراف کرتا ہے تو سمجھنا چاہیئے کہ اس کے دل و دماغ سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو چکی ہے اور اس کا وجود زندگی سے محروم ہو چکا ہے۔

اسلام مرد اور عورت دونوں کو ان کی اصل فطرت کی طرف لوٹاتا ہے اور انھیں دعوت دیتا ہے کہ وہ زندگی کا مطالعہ گہری نظر سے کریں اور ٹھٹھری ہوئی زندگی میں حرارت پیدا کرنے کے لئے اپنی ذمہ داریاں محسوس کریں۔

مرد اور عورت کے باہمی تشبہ اختیار کرنے پر اگر غور کیا جائے تو ایک اور برائی ابھر کر سامنے آئے گی اور وہ یہ کہ اس لعنت میں مبتلا ہونے والا نفسیاتی طور پر زندگی کی ان تمام ذمہ داریوں سے آزاد ہونا چاہتا ہے جو اس کی نوعیت کے اعتبار سے اس پر ڈالی گئی ہیں۔ اس میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں اور ذمہ داریوں سے فرار کا یہی جذبہ ہے جو قوانین فطرت میں خلل ڈال دیتا ہے اور ایک صالح معاشرہ کی ترقی میں بڑا انتشار پیدا کر دیتا ہے اور ظاہر ہے کہ اسلام ایسے تمام ذرائع کا سدباب کرتا ہے جو کسی بھی حیثیت سے معاشرہ کی ترقی میں خلل انداز ہوں۔

۵۔ اسلام عورت کا اصل مقام اس کے گھر کو قرار دیتا ہے کیوں کہ طبعاً اور فطرتاً اس کی سرشت

میں یہ چیز داخل کردی گئی ہے۔اس سے بغاوت دراصل اپنی فطرت سے بغاوت ہے اور جب تک انسان اپنی فطرت کے مطابق کام کرتا رہے گا تب تک معاشرہ تعمیر و ترقی کی راہ پر گامزن رہے گا۔اس کی فطرت کا یہ تقاضہ ہے کہ اس کی تمام سرگرمیاں گھر کی چہار دیواری کے اندر محدود رہیں اور اگر اس نے اپنی فطرت اصلی سے انحراف کیا تو اس کا انجام بہت ہولناک ہوگا۔یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کی بیویوں، بیٹیوں اور تمام مسلمان عورتوں کو مخاطب کرکے یہ تعلیم دی کہ وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ (اپنے گھروں میں وقار کے ساتھ بیٹھی رہو) اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے گھروں میں وقار اور سکینت کے ساتھ رہو۔یہی دراصل تمہاری فطرت ہے اور فطرت سے بغاوت تمہیں بہت مہنگی پڑے گی۔

البتہ جہاں تک گھروں میں ذوالارحام کے ساتھ رہنے کا تعلق ہے اس میں کوئی قباحت نہیں لیکن غیر مردوں کا سامنا بلا کسی ناگزیر ضرورت کے کرنا کسی بھی طرح مناسب نہیں ہے۔ناگزیر ضرورتوں کی کوئی حد بندی قرآن نے نہیں کی کیوں کہ دل اس کا بہترین جج ہے۔

اسی طرح اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے کہ عورت اپنے کسی معاشی، علمی یا دینی ضرورت کے تحت گھر سے باہر قدم نکالے ہم پیچھے حضرت سودہؓ کا وہ واقعہ نقل کر چکے ہیں جس میں آپؐ نے ضرورت کے تحت عورتوں کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت دی ہے۔مزید دلائل کے لئے ابن کثیر کی تفسیر ملاحظہ ہو جو انھوں نے وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ کی ضمن میں کی ہے لکھتے ہیں:۔

"(وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ) اس کا مفہوم یہ ہے کہ اپنے گھروں ہی میں رہو اور بغیر کسی خاص ضرورت کے گھر سے قدم مت نکالو، شرعی ضرورتوں میں نماز کے لئے مسجد میں آنا بھی شامل ہے۔"

پھر اگر کسی خاص مصلحت کے تحت مردوں کا سامنا ہو جائے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے البتہ غیر مردوں سے ملاقات میں ان تمام آداب و شرائط کا خیال رکھنا چاہیئے جن میں سے بعض کا تذکرہ ہم پیچھے کر چکے ہیں۔اور بعض کا تذکرہ ذیل میں کر رہے ہیں۔ازواج مطہرات اور بہت سی مسلمان

عورتوں کے بارے میں یہ بات معلوم ہے کہ مدینہ کے راستوں میں اور مناسک حج میں بعض صحابہ کرام سے ان کی مڈبھیڑ ہو جایا کرتی تھی کیوں کہ اس سلسلہ میں کوئی نص قاطع وارد نہیں ہوئی تھی مگر اس مڈبھیڑ میں دو چیزوں کا خاص خیال کیا جانا چاہیئے۔

(الف) یہ کہ ملاقات خلوت میں نہ ہو۔ اس میں گھر کے اندر اور باہر کی کوئی قید نہیں ہے مگر یہ ضروری ہے کہ اس کے ساتھ یا تو اس کا شوہر ہو یا ذوی الارحام میں سے کوئی ہو۔ اس سلسلہ میں ابن عباسؓ سے ایک روایت مروی ہے آپ نے فرمایا:

"جو شخص اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتا ہو وہ کسی عورت سے خلوت میں ہرگز نہ ملے الا آنکہ اس کے ساتھ ذوی الارحام میں سے کوئی ہو۔"

بخاری کی ایک روایت میں آپ نے فرمایا:

"کوئی کسی عورت سے تنہائی میں ہرگز نہ ملاقات نہ کرے سوا اس کے کہ اس کے ساتھ کوئی محرم ہو۔"[1]

احادیث کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے کہ شریعت مرد اور عورت پر اپنے عدم اعتماد کا اظہار کرتی ہے بلکہ اس کا مدعا صرف یہ ہے کہ وہ احتمال فتنہ کے تمام دروازوں کو بند کر دینا چاہتی ہے اسی لئے وہ اجنبی مرد کو اجنبی عورت سے خلوت میں ملنے سے روکتی ہے، نظر کے فتنوں سے روکتی ہے اور کسی کے گھر میں بلا اجازت اندر جانے کی اجازت نہیں دیتی۔ اس طرح کی اور بھی بہت سی پابندیاں ہیں جنھیں شریعت افراد پر لگاتی ہے اور اس کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوتا کہ وہ فتنہ کے تمام سرچشموں پر بند لگا دے۔

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اللہ کے رسول اجنبی مرد کو غیر عورت کے ساتھ تنہائی میں ملنے سے شدت

---

[1] واضح رہے کہ محرم شریعت کی اصطلاح ہے جس سے مراد عورت کے وہ اعزا ہوتے ہیں جن سے نکاح کرنا اس کے لئے حرام ہوتا ہے مثلاً باپ، بھائی اور بیٹا وغیرہ۔

سے روکتے ہیں ۔ آپ فرماتے ہیں ۔

" خبردار! عورتوں کے پاس تنہائی میں مت جایا کرو ۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے کوئی مرد کسی عورت سے خلوت میں نہیں ملتا مگر یہ کہ ان دونوں کے بیچ ایک شیطان ہوتا ہے "

لیکن اگر خلوت نہ ہو یا اگر خلوت ہو اور ذوی الارحام بھی ساتھ ہوں تو اس وقت کوئی حرج نہیں ہے ۔

(ب) دوسری شرط جس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے یہ ہے کہ عورت اظہار زینت اور نمائش بدن سے پرہیز کرے اور صرف اسی دائرے میں رہے جو شریعت نے اس کے لئے کھینچ دیا ہے ۔ وہ دائرہ کون سا ہے ؟ مندرجہ ذیل آیت اس کی صراحت کر رہی ہے :۔

وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا

اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں سوائے اس زینت کے جو خود ظاہر ہو جائے ۔

امام قرطبیؒ اسی آیت کی تفسیر میں رقمطراز ہیں :۔

" زینت کی دو قسمیں ہیں ایک فطری دوسری کسبی فطری زینت سے ہماری مراد عورت کا وہ حسن و جمال ہے جو اسے فطرت کی طرف سے ودلیعت کیا گیا ہے ۔ اور زینت کسبی سے مراد وہ سامان آرائش ہیں جن کے ذریعہ عورت اپنے فطری حسن کو سنوارتی ہے مثلاً کپڑے ، زیورات سرمہ اور خضاب وغیرہ[1]"

آیت مندرجہ بالا میں إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا کا مفہوم ہے کہ زینت کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو ظاہر ہوتی ہے دوسری جو مخفی ہوتی ہے ۔ اس کے بعد طبری نے زینت ظاہرہ کی وضاحت کرتے ہوئے علماء کے مختلف اقوال نقل کئے ہیں مثال کے طور پر قتادہ کے نزدیک زینت ظاہرہ سے مراد کنگن انگوٹھی اور سرمہ ہیں اور اس کے لئے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے استدلال کرتے

---

[1] حوالہ کے لئے ملاحظہ ہو جامع قرطبی ج ۱۲ ص ۲۹

ہیں جس میں آپ نے فرمایا:

"کسی عورت کے لئے جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتی ہو یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے ہاتھوں کو نصف سے اوپر کھولے۔"

اسی طرح حضرت عائشہ کے نزدیک اس زینت سے مراد کنگن اور انگوٹھی ہے۔ اور وہ اپنی تائید میں یہ حدیث پیش کرتی ہیں کہ ایک بار ان کی بھتیجی ان کے یہاں آئیں اور اسی وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی آگئے آپ نے انھیں دیکھ کر اپنا رخ پھیر لیا اس پر حضرت عائشہؓ نے کہا اے اللہ کے رسول یہ تو ہماری بھتیجی ہیں یہ سن کر آپ نے کہا کہ جب لڑکی بالغ ہو جائے تو اسے اپنا چہرہ اور ہتھیلی کے علاوہ کوئی چیز کھلی نہیں رکھنی چاہیئے۔

اس کے بعد طبری نے ایک اور قول نقل کیا ہے۔ اور دوسرے تمام اقوال کے مقابلہ میں یہی زیادہ صحیح اور مستند معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ زینت ظاہرہ سے مراد چہرے اور ہتھیلی کے ساتھ وہ زیورات بھی ہیں جو عام طور پر ان دونوں حصوں میں موجود ہوتے ہیں مثلاً سرمہ، انگوٹھی، کنگن اور خضاب وغیرہ۔

جیسا کہ ہم پیچھے کہہ چکے ہیں کہ یہی قول ہمارے نزدیک قابل ترجیح ہے۔ کیوں کہ نماز میں لوگوں کو ستر ڈھانپنے کی ہدایت کی گئی ہے اور عورت کو سارے جسم میں صرف چہرہ اور ہتھیلی کھلا رکھنے کی اجازت ہے ایک اور روایت کی رو سے یہ اجازت ہاتھ کی کہنی تک وسیع ہو جاتی ہے۔ اور اس پر تمام علماء کا اتفاق ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ چیزیں عورت کے ستر میں داخل نہیں ہیں اگر ایسا ہوتا تو انھیں نماز میں کھلا رکھنے کی ہرگز اجازت نہ دی جاتی۔ اب اسی کو سامنے رکھ کر اللہ تعالیٰ کے استثنائی حکم پر غور کیجیے صاف نظر آئے گا کہ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا سے یہی مراد لینا زیادہ قرین صواب ہے۔[1]

---

[1] طبری جلد ۱۸ صہ۹۳

قرطبی نے ابن عباسؓ، قتادہ اور مسعود بن مخرمہ کے حوالہ سے ایک اور قول نقل کیا ہے اور وہ یہ کہ زینت ظاہرہ سے مراد سرمہ، کنگن، نصف ہاتھ کا خضاب بالی انگوٹھی اور اسی طرح کے دوسرے زیورات ہیں۔ ان تمام بزرگوں کے نزدیک یہ چیزیں اظہار زینت کے منافی نہیں ہیں۔[1]

زینت کی دوسری قسم وہ ہے جسے ہم مخفی زینت کے نام سے جانتے ہیں اس میں ہنسلی، بازوبند پازیب سر کے زیور اور ہاتھ کے اوپری حصہ کے زیورات آتے ہیں ان کا اظہار جائز نہیں ہے اس کی صراحت مندرجہ ذیل آیت میں صاف صاف کردی گئی ہے۔

وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا لِبُعُولَتِهِنَّ أَوْ آبَائِهِنَّ أَوْ آبَاءِ بُعُولَتِهِنَّ أَوْ أَبْنَائِهِنَّ أَوْ أَبْنَاءِ بُعُولَتِهِنَّ أَوْ إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِي إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِي أَخَوَاتِهِنَّ أَوْ نِسَائِهِنَّ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُنَّ أَوِ التَّابِعِينَ غَيْرِ أُولِي الْإِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ أَوِ الطِّفْلِ الَّذِينَ لَمْ يَظْهَرُوا عَلَىٰ عَوْرَاتِ النِّسَاءِ ۖ وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ مِنْ زِينَتِهِنَّ (النور: ۳۱)

(اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں سوائے اس زینت کے جو خود ظاہر ہو جائے اور وہ اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے بکل مار لیا کریں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں مگر ان لوگوں کے سامنے شوہر، باپ خسر، بیٹے، سوتیلے بیٹے، بھائی، بھتیجے، بھانجے، اپنی عورتیں، اپنے غلام، وہ مرد خدمت گار جو عورتوں سے کچھ مطلب نہیں رکھتے یا وہ لڑکے جو ابھی عورتوں کی پردہ کی باتوں سے آگاہ نہیں ہوئے ہیں (نیز ان کو حکم دو کہ) وہ چلتے وقت اپنے پاؤں زمین پر اس طرح نہ ماریں کہ جو زینت انھوں نے

---

[1] قرطبی ج ۱۲ صہ ۲۲۲

چھپا رکھی ہے (آواز کے ذریعہ سے) اس کا اظہار ہو۔)

قرطبی نے زینت ظاہرہ اور زینت خفیہ کے احکام کو کتنے اچھے انداز میں بیان کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

"زینت ایک تو ظاہر ہوتی ہے اور ایک پوشیدہ زینت ظاہرہ کا دیکھنا محرم اور اجنبی سب کے لئے جائز ہے لیکن زینت خفیہ کو صرف وہی لوگ دیکھ سکتے ہیں جن کا نام اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ میں بیان فرمایا ہے"۔

یہ پردہ کے بعض احکام ہیں جنھیں قرآن اور سنت کی روشنی میں ہم نے اوپر بیان کر دیا ہے۔ اس کا اہتمام مرد اور عورت سب کے لئے ضروری ہے اور اسی پر عمل کر کے نفس کی پاکیزگی اور قلب کی طہارت حاصل کی جا سکتی ہے۔ کسی مصلحت کی بنا پر اس کا ترک کرنا قطعاً جائز نہیں ہے کیونکہ اس کے علاوہ جو کچھ ہے سب فتنہ ہے جس سے معاشرہ میں فساد اور گندگی پرورش پاتی ہے۔

ضمیمہ

پردہ داری کے مذکورہ احکامات پر اگر آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اسلامی پردہ محض ایک رسم اور قانون نہیں ہے بلکہ یہ خالص علمی اور عقلی چیز ہے۔ رسوم اور قانون کا معاملہ تو یہ ہوتا ہے کہ اس میں جمود ہوتا ہے یعنی جو چیز اس میں شامل کر دی ہے اسے کسی بھی حالت میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا اس کے برخلاف عقلی قوانین میں لچک ہوتی ہے اس کا تعلق آدمی کی بصیرت و بصارت سے ہوتا ہے۔ اس میں احوال کے لحاظ سے شدت و تخفیف کی گنجائش ہوتی ہے۔ موقع و محل کے اعتبار سے اس کے عام قواعد میں استثنائی صورتیں بھی رکھی جاتی ہیں۔ اس کے احکام کی پیروی اندھوں اور بہروں کی طرح نہیں بلکہ ایک عاقل اور ہوشمند کی طرح کی جاتی ہے کیوں کہ یہ عقلی قانون ہے اور اس کی پیروی کے

لئے قدم قدم پر فہم اور شعور کی ضرورت ہے۔

پیچھے ہم "پردہ" کے موضوع پر تفصیل سے کلام کر چکے ہیں۔ یہاں ہم اسی سے متعلق چند دیگر موضوعات پر کلام کریں گے۔ نکات بحث مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ گھر کا احترام۔

۲۔ عورت کی زینت و آرائش۔

۳۔ اختلاط مرد و زن۔

گھر کا احترام

اسلام اپنے پیروؤں کو گھروں کا احترام کرنا سکھاتا ہے اور اس کے لئے اس نے ایسے قوانین وضع کئے ہیں جو گھر کے مکینوں کے لئے زیادہ سے زیادہ راحت، آزادی اور حفاظت کا ذریعہ بن سکیں نیچے یہ قوانین درج کئے جاتے ہیں۔

۱۔ اسلامی معاشرہ کے کسی فرد کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ گھروں میں ہونے والے واقعات کی سن گن لے یا دروازے کے جھروکوں سے آنکھ اور کان لگائے۔ اسے اسلام ایک زبردست اخلاقی خرابی سے تعبیر کرتا ہے۔ حدیث نبوی اس کی شہادت ان الفاظ میں دیتی ہے:

"اگر کوئی شخص تمہاری اجازت کے بغیر تمہارے گھر میں جھانکے اور تم اس کی آنکھوں میں کنکریاں ڈالدو جس سے وہ اندھا ہو جائے تو تمہارے اوپر کوئی تاوان نہیں ہے۔" (بخاری، مسلم)

ایک آدمی حضورؐ کے گھر کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا اور دروازہ اس وقت کھلا ہوا تھا آپ نے فرمایا چلو الگ ہٹو آنکھوں سے اجازت نہیں لی جاتی۔ (ابوداؤد) اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تھا کہ جب آپ کسی کے گھر تشریف لے جاتے تو دروازے سے دائیں یا بائیں ہٹ کر کھڑے

ہوتے تھے اور تین بار السلام علیکم کہتے تھے (واضح رہے کہ اس وقت دروازوں پر پردے لگانے کا رواج نہیں تھا۔)

۲۔ تین اوقات ایسے ہیں جن میں گھر کے خادم اور خادمات کو بھی بلا اجازت اندر آنے کی اجازت نہیں ہے اور نہ صرف خدام بلکہ گھر کے بچوں کو بھی اندر جانے کے لئے اجازت لینا ضروری ہے اور یہ اجازت صرف اسی وقت دی جاسکتی ہے جب کہ اجازت دینے والا باپردہ اور باوقار ہو۔ تینوں اوقات درج ذیل ہیں۔

(الف) نماز فجر سے پہلے کیونکہ نماز فجر کے بعد پھر سونا مناسب نہیں ہے۔

(ب) ظہر کے وقت جب کہ آدمی اپنے کپڑے اتار کر آرام کرتا ہے۔

(ج) نماز عشاء کے بعد جب یہ معلوم ہو جائے کہ آدمی سونے کے لئے اپنے بستر پر جا چکا ہو۔

ان اوقات کی تصریح قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیت میں کی گئی ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ؕ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَمِنْ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ۚ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ ؕ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌۢ بَعْدَهُنَّ ؕ طَوّٰفُوْنَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (النور: ۵۸)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو لازم ہے کہ تمہارے لونڈی غلام اور تمہارے وہ بچے جو ابھی عقل کی حد کو نہیں پہونچے ہیں تین اوقات میں اجازت لے کر تمہارے پاس آیا کریں صبح کی نماز سے پہلے اور دوپہر کو جب کہ تم کپڑے اتار کر رکھ دیتے ہو اور عشاء کی نماز کے بعد یہ تین وقت تمہارے لئے

پردے کے وقت ہیں ان کے بعد وہ بلا اجازت آئیں تو نہ تم پر کوئی گناہ ہے نہ ان پر، تمہیں ایک دوسرے کے پاس بار بار آنا ہی ہوتا ہے اس طرح اللہ تمہارے لئے اپنے ارشادات کی توضیح کرتا ہے اور وہ علیم و خبیر ہے۔

۲۔ کسی کے گھر پر ملاقات یا اس سے بس ضرورت کی فرمائش کے لئے مناسب وقت کا انتخاب آدمی کے ذوق پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب شرع نے نابالغ بچے کے لئے تین اوقات میں گھر میں جانے کے لئے اجازت کی شرط لگا دی ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ اوقات ملاقات کے لئے مناسب نہیں ہیں اور کوئی بھی عقل مند شخص کسی کے گھر جانے کے لئے ان اوقات کا انتخاب ہرگز نہیں کرے گا۔ ان اوقات کے علاوہ بھی دوسرے کے گھر جانے کے لئے یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ جانے سے پہلے وہ اچھی طرح جان لے کہ کہیں وہ اس وقت جا کر دوسرے کو پریشان تو نہیں کرے گا اور یہ معلوم ہو جانے کے بعد وہ سلام کر کے اندر جائے۔ اس مقام پر "استیذان" اور "استئناس" کا فرق اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے استئذان کا دائرہ بہت محدود ہوتا ہے اس کا مفہوم صرف اجازت طلب کرنا ہے اس کے برخلاف استئناس کا تعلق عقل اور بصیرت سے ہوتا ہے جس میں آدمی کو یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ کون سا وقت کسی کے گھر جانے کے لئے مناسب ہے اور کون سا غیر مناسب۔

مثال کے طور پر آپ کا کوئی دوست دور دراز سے سفر کر کے آیا ہے اور اسے سفر کی تکان مٹانے کے لئے آرام کی ضرورت ہے تو بصیرت کا تقاضہ یہ ہے کہ اس وقت آپ اسے آرام کرنے دیں اور اس کے پاس ابھی مت جائیں اسی مناسب اور غیر مناسب وقت کی تعیین کو شریعت نے استئناس سے تعبیر کیا ہے۔

اس کو ایک اور مثال سے اس طرح سمجھئے کہ آپ کسی دوست سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں مگر وہ دوست اس وقت اپنے گھر والوں کے درمیان باتوں میں مصروف ہے اور ظاہر ہے کہ

گھر میں مرد بھی ہوں گے اور عورتیں بھی، یہ وقت بھی آپ کی ملاقات کے لئے نامناسب ہے:

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آپ سوچ سمجھ کر مناسب وقت کی تعیین کرتے ہیں اور ملاقات کے لئے اچانک آجاتے ہیں مگر یہاں آکر آپ دیکھتے ہیں کہ آپ کا دوست دوسرے لوگوں کے درمیان گھرا ہوا ہے اور کسی اہم کام میں مصروف ہے، اس وقت آپ کی بصیرت کا تقاضہ یہ ہے کہ آپ چپکے سے واپس لوٹ جائیں اور کسی کو آپ کی آمد کا احساس بھی نہ ہونے پائے۔

- مندرجہ ذیل آیت انہی معانی کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے:

یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُیُوتًا غَیْرَ بُیُوتِکُمْ حَتَّىٰ تَسْتَأْنِسُوا وَتُسَلِّمُوا عَلَىٰ أَهْلِهَا ذَٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُونَ ﴿٢٧﴾ فَإِن لَّمْ تَجِدُوا فِیهَا أَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوهَا حَتَّىٰ یُؤْذَنَ لَکُمْ وَإِن قِیلَ لَکُمُ ارْجِعُوا فَارْجِعُوا هُوَ أَزْکَىٰ لَکُمْ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِیمٌ (النور: ۲۷، ۲۸)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو جب تک کہ گھر والوں کی رضا نہ لے لو اور گھر والوں پر سلام نہ بھیج لو یہ طریقہ تمہارے لئے بہتر ہے توقع ہے کہ تم اس کا خیال رکھو گے پھر اگر وہاں کسی کو نہ پاؤ تو داخل نہ ہو جب تک کہ تم کو اجازت نہ دی جائے اور اگر تم سے کہا جائے کہ واپس چلے جاؤ تو واپس ہو جاؤ یہ تمہارے لئے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے خوب جانتا ہے۔)

یہ چند موٹے موٹے احکامات ہیں جنہیں آیت میں بیان کیا گیا ہے۔ بقیہ کو انسان کے ذوق اور مزاج پر چھوڑ دیا گیا ہے، لیکن اس بات کی تاکید کر دی گئی ہے کہ آدمی اپنی خواہشات اور جذبات کو کنٹرول میں رکھے اور کسی کے یہاں جانے سے پہلے اچھی طرح سوچ لے کہ اس کی آمد کہیں اس کے لئے باعث تکلیف تو نہیں ہوگی اگر اسے اس طرح کا کوئی اندیشہ ہو تو اس کا نہ جانا ہی بہتر ہے۔ قرآن

ہر مومن کو یہی تعلیم دیتا ہے وہ کہتا ہے: فَارْجِعُوا هُوَ اَزْکٰی لَکُم (واپس ہو جاؤ یہ تمہارے لئے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے)

جہاں تک استئذان کا تعلق ہے ہم پیچھے بتا چکے ہیں کہ استئناس کے مقابلہ میں اس کا دائرہ بہت محدود ہے اور یہ کم سے کم شرط ہے جو کسی کے گھر میں جانے کے لئے ضروری ہے چنانچہ گھر میں داخل ہونے سے پہلے شوہر بیوی سے اجازت طلب کرے گا اور ایسا کرنا اس کے لئے مستحب ہے۔

ابن کثیر لکھتے ہیں:

"افضل یہ ہے کہ گھر میں داخل ہونے سے پہلے شوہر بیوی کو باخبر کر دے، اچانک نہ جائے تاکہ وہ اسے کہیں ایسی حالت میں نہ ملے جس میں وہ اسے دیکھنا پسند نہیں کرتا ہے"۔

ماں اور بہنوں کے پاس بھی اجازت مانگ کر جانا چاہئیے خواہ وہ سب ایک ہی گھر میں رہتی ہوں اور یہ مستحب نہیں بلکہ واجب ہے۔ عبداللہ ابن مسعودؓ کا فتویٰ ہے کہ "ماں کے پاس جانے سے پہلے اجازت طلب کرنا ضروری ہے"۔ عطاء ابن ابی رباحؒ نے ابن عباسؓ سے دریافت فرمایا کہ ہماری سرپرستی میں کچھ یتیم بہنیں ہیں جو ہمارے ساتھ رہتی ہیں کیا ان کے پاس بھی جانے کے لئے اجازت طلب کرنا ضروری ہے۔؟ ابن عباسؓ نے جواب دیا "ہاں" ابن رباح نے پھر پوچھا تاکہ وہ انھیں رخصت دیدیں لیکن انھوں نے انکار کر دیا اور پوچھا کیا تم انھیں ننگا دیکھنا پسند کرو گے۔؟ ابو رباح نے کہا نہیں، ہرگز نہیں اس پر ابن عباسؓ نے کہا پھر تم اجازت لے کر جاؤ۔ ابو رباح نے پھر درخواست کی کہ ہمیں رخصت دیدی جائے مگر آپ نے فوراً ٹوک دیا اور پوچھا کیا خدا کی اطاعت تمہیں پسند ہے۔؟ ابو رباح نے کہا، ہاں اس پر انھوں نے کہا تب تم اجازت طلب کر کے ہی اندر جاؤ۔

ظاہر ہے کہ جب اتنا شدید حکم بیوی، ماں اور بہنوں کے لئے ہے تو غیروں کے لئے

اس کی شدت کس قدر بڑھی ہوئی ہوگی۔اس کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ استئذان کا طریقہ کیا ہے؟ اس سلسلہ میں نبی کریمؐ کی تعلیم یہ ہے کہ آدمی دروازے کے داہنے یا بائیں کھڑا ہو جائے اور سلام کر کے اندر آنے اجازت طلب کرے اگر کوئی جواب نہ ملے تو واپس لوٹ آئے۔

آج کل یہ طریقہ دیہاتوں میں تو اختیار کیا جاسکتا ہے جہاں دروازے دن بھر کھلے رہتے ہیں۔لیکن شہروں میں جہاں دروازے ہمہ وقت بند رہتے ہیں تو وہاں صرف سلام کرنے سے کام نہیں چلتا ہے۔ایسی جگہوں پر استئذان کا طریقہ یہ اختیار کرنا چاہیئے کہ تین مرتبہ دروازہ کھٹکھٹائے یا اگر کال بیل ہو تو تین مرتبہ کال بیل بجائے اگر تین مرتبہ میں اجازت مل جاتی ہے تب تو وہ اندر جائے ورنہ پھر لوٹ آئے۔

عورت کی زینت و آرائش

عورت کی زینت و آرائش پر اسلام نے کوئی پابندی نہیں عائد کی ہے۔اسے اس بات کی اجازت ہے کہ وہ اپنے شوہر کو پسند آنے والے لباس، خوشبو اور زیورات کا استعمال کرے۔لیکن اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ عورت کی انسانیت ہی اس کا حقیقی حسن ہے اور اس حسن کو جو چیز جلا بخشتی اور چار چاند لگاتی ہے وہ اس کی عقل مندی اور تہذیب و شائستگی ہے اور اس کی بنیاد اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا

(الاحزاب۔۳۴)

(یاد رکھو اللہ کی آیات اور حکمت کی ان باتوں کو جو تمہارے گھروں میں سنائی جاتی ہیں بے شک

اللہ لطیف اور باخبر ہے۔)

اور اس حکمت اور علم و معرفت کا تقاضہ ہے کہ اس کے اندر تہذیب و شائستگی ابھرے اور اس کی عقل میں وسعت پیدا ہو یہی دراصل عورت کا حقیقی حسن ہے جسے ہم حسن سیرت سے تعبیر کرتے ہیں کتنی بہترین بات کہی ہے اس سلسلہ میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی بہن نے۔ فرماتی ہیں:

"جس دل میں خدا کے خوف کا زیور ہو کوئی اور زیور اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ہر شخص کے پاس کوئی قابل امتیاز صفت ہوتی ہے میری امتیازی صفت سخاوت اور عطا ہے۔ بخدا بھوک کی حالت میں لذیذ کھانا کھانے اور ٹھنڈا پانی پینے سے بہتر میرے نزدیک صلہ رحمی اور ہمدردی و محبت ہے۔ بخدا میں نے آج تک کسی قیمتی سے قیمتی چیز پر حاسدانہ نظر نہیں ڈالی۔ مگر نیکی اور تقویٰ ہمارے لئے قابل رشک ہے۔ میری تمنا ہے کہ میں بھی صالحہ اور متقی بنوں مگر کیا یہ چیز محض تمنا سے حاصل ہو سکتی ہے"؟

یاد رہے یہ الفاظ اس خاتون کے ہیں جن کا تعلق شاہی گھرانے سے تھا اگر وہ زینت و آرائش کے لئے قیمتی سے قیمتی سامان طلب کرتیں تو اس کا حصول ان کے لئے کچھ مشکل نہ تھا۔ بہترین کپڑے اور قیمتی زیورات کے ڈھیر کے ڈھیر ان کے قدموں میں تھے لیکن ان چیزوں کے لئے ان کے دل میں کوئی قدر نہیں تھی زینت ظاہرہ سے ان کا دل کوسوں دور تھا۔ اور دل کا یہی حسن تھا جس کی بنا پر انھوں نے فرمایا کہ "جس دل میں خدا کے خوف کا زیور ہو کوئی اور زیور اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا"۔

اسی بنیاد کو سامنے رکھ کر اسلام نے عورت کے لئے زیب و زینت کو مباح کیا ہے ظاہر ہے کہ جب یہ بنیاد سامنے رہے گی تو اسکی تمام زیب و زینت حیا کی حد میں رہے گی اور وہ ظاہری حسن کے بجائے باطنی حسن پر زیادہ توجہ صرف کرے گی۔

لباس کی زینت

عورت کو اپنی حیثیت کے مطابق کپڑے پہننے چاہئیں۔ اگر اس کی مالی حالت لسے ریشم

پہننے کی اجازت دے تو ریشم بھی پہن سکتی ہے (واضح رہے کہ شریعت محمدیؐ میں ریشم اور سونا عورتوں کے لئے حلال کر دیا گیا ہے تفصیل پیچھے "بیوی کا نفقہ" کے سیاق میں گزر چکی ہے) اسی طرح دوسرے کپڑوں کا بھی معاملہ ہے البتہ کپڑوں کے انتخاب میں اسے اس بات کا خیال رکھنا چاہئیے کہ آدمی کا ظاہر اس کے اندرون کا پتہ دیتا ہے اس لئے کپڑے کے انتخاب میں اسی رنگ اور معیار کو ترجیح دینی چاہئیے جو شریعت کے مزاج سے ہم آہنگ ہو۔

اس کے برخلاف اگر وہ اپنی حیثیت سے اونچے کپڑوں کا انتخاب کرے یا اسی طرح وہ ایسا رنگ پسند کرے جو اس کی دین سے بے رغبتی کی طرف غماز ہو اور اسکی پردہ پوشی کی ضرورت کو پورا نہ کر رہا ہو اور ایسا چست ہو کہ جسم کے خطوط نمایاں ہونے لگیں تو یہ چیز شرعی جواز یا عدم جواز سے قطع نظر ان کے عقل کا نقص اور اخلاقی گراوٹ کا پتہ دیتی ہے خواہ یہ چیز اس کی اعلیٰ سوسائٹی میں کتنی ہی مقبول کیوں نہ ہو۔

عورت کو سونے کے زیورات استعمال کرنے کی بھی اجازت ہے چنانچہ حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ نجاشی نے آنحضرتؐ کی خدمت میں چند زیورات ہدیہ کئے جس میں ایک سونے کی انگوٹھی بھی تھی جس کا نگینہ حبش کا تھا آپ نے اسے قبول کر لیا اور اپنی نواسی حضرت امامہ بنتِ زینبؓ کو بلایا اور محبت سے ان کی انگلی میں یہ پہنا دیا۔

سونے کے علاوہ چاندی، یاقوت، زمرد اور الماس کے استعمال کی بھی اجازت عورت کو حاصل ہے کیوں کہ ان کی حرمت کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے کوئی نص قاطع نہیں اتاری ہے۔ البتہ اس کی حلت پر امام ابن حزمؒ نے خلق خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا سے استدلال کیا ہے۔

ان کے علاوہ موتیوں اور ہیرے جواہرات کے استعمال کی بھی اجازت ہے جس کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے:

وَمِن كُلٍّ تَأْكُلُونَ لَحْمًا طَرِيًّا وَتَسْتَخْرِجُونَ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا (فاطر: ۱۲)

(دونوں (دریاؤں) سے تم تر و تازہ گوشت حاصل کرتے ہو اور پہننے کے لئے زینت کا سامان نکالتے ہو۔)

اور ظاہر ہے کہ ان نکالی جانے والی چیزوں میں ہیرے اور موتی بھی شامل ہیں، جیسا کہ آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ:

يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ (الرحمٰن: ۲۲)

(ان سمندروں سے موتی اور مونگے نکلتے ہیں)

خوشبو کا استعمال

عورت ہر طرح کی خوشبو استعمال کر سکتی ہے البتہ شوہر کی عدم موجودگی میں اسے اس کا استعمال ترک کر دینا چاہیئے۔ لیکن اگر شوہر موجود ہے تو خوشبو کا استعمال نہ صرف جائز بلکہ مستحسن ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت عثمان ابن مظعونؓ کی بیوی ابتدا میں خوشبو اور خضاب کا استعمال کرتی تھیں مگر بعد میں انھوں نے اسے ترک کر دیا ایک دن وہ اسی حالت میں حضرت عائشہؓ کے پاس گئیں حضرت عائشہؓ ان کو اس حالت میں دیکھ کر سخت متعجب ہوئیں اور ان کے ترک استعمال کا سبب دریافت کیا کیوں کہ ابھی ان کے شوہر موجود تھے انھوں نے یہ سوال سن کر کہا ام المومنین عثمان تو ترک دنیا کی طرف مائل ہیں انھیں دنیا سے اور اپنے بال بچوں سے اب کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی۔ حضرت عائشہؓ یہ سن کر اللہ کے رسولؐ کے پاس پہونچیں اور صورت حال سے باخبر کیا۔ چنانچہ اس کے بعد جب آپؐ کی ملاقات حضرت عثمان سے ہوئی تو آپ نے ان سے کہا "عثمان تم تو مومن موحد ہو نا!" انھوں نے کہا اللہ کے رسول اس میں کیا شک ہے۔ آپ نے یہ سن کر کہا اچھا تو اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ توجہ اور دلچسپی دکھاؤ۔

امام شوکانیؒ نے اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: "حضرت عائشہؓ کا ان کے

خوشبو اور خضاب ترک کر دینے پر متعجب ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ شوہر والیوں کے لئے اس کا استعمال مستحب اور مستحسن ہے"۔

زیب و زینت کے طریقے

زیب و زینت کے دو طریقے معروف ہیں:۔

۱۔ مصنوعی تدابیر کے ذریعہ مثلاً اعضاء میں زخم لگا کر یا دانتوں کو گھسا کر ان کے درمیان خلا پیدا کر کے یہ ایک طرح سے تغیر بخلق اللہ ہے جو جائز نہیں ہے۔

۲۔ فطری تدابیر کے ذریعہ مثلاً سرمہ، خضاب اور دوسرے جدید پوڈروں کے استعمال کے ذریعہ۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔

مصنوعی طریقے

زیب و زینت کے مصنوعی طریقے مثلاً دانتوں کی آرائش کے لئے ان کو گھسا کر ان کے درمیان خلا پیدا کرنا یا انھیں چھوٹا کروانا یا دوسرے اعضاء کو زخمی کر کے حسن پیدا کرنا۔ یہ سب حرام ہیں اور ان کی حرمت نص قاطع سے ثابت ہے۔ اور ہر صاحب بصیرت آدمی اس کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوگا کہ یہ نہایت سطحی اور گھٹیا قسم کی حرکتیں ہیں جو زندگی کے اعلیٰ مقاصد سے کسی طرح میل نہیں کھاتی ہیں۔

یقیناً اسلام عورتوں کو زینت و آرائش سے نہیں روکتا۔ پیچھے ہم اس کی تفصیلات پر کافی روشنی ڈال چکے ہیں جو ثابت کرتی ہیں کہ زیب و زینت کو اسلام نہ صرف پسند کرتا ہے بلکہ اس کی ترغیب بھی دیتا ہے۔ اور یہی چیز اسلام کی فطرت سے ہم آہنگ بھی ہے۔ لیکن اس کے لئے اس حد تک آگے بڑھ جانا جو تغیر بخلق اللہ کی حدود تک پہونچ رہی ہے کسی طرح مناسب نہیں ہے۔

اس کی حیثیت زندگی کے اعلیٰ مقاصد اور نفس کی تعمیر و ترقی میں ایک سنگ گراں کی ہے جسے راستے سے ہٹانا ناگزیر ہے۔

انسان کے جسم میں اگر کوئی عضو زائد ہے جو اس کے لئے روحانی اور جسمانی تکلیف کا باعث ہے۔ وہ جس مجلس میں پہنچتا ہے لوگوں کی نظریں اس کی طرف اٹھ جاتی ہیں اور وہ خفیف ہو جاتا ہے تو ایسی حالت میں اگر کوئی بطور علاج اسے کٹوانا چاہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ اس کی موجودگی سے اس کی زندگی کے تلخ ہو جانے کا اندیشہ ہے اس لئے اگر وہ اسے کٹوا کر اپنی پریشانی ختم کرنا چاہتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ دین اسے اس کی اجازت نہ دے جب کہ دین آسانی ہی کا نام ہے۔ لیکن زینت کے لئے اپنے اعضاء کو مجروح کرنا مثال کے طور پر دانتوں کو چھوٹا کر کے ان کے درمیان خلا پیدا کرنا سخت عقلی اور نفسیاتی کمزوری ہے جس کی اجازت اسلام کسی بھی حال میں نہیں دیتا۔

چنانچہ نیل الاوطار میں اس مسئلہ کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے:۔

"فلج کے معنی دو دانتوں یا چار دانتوں کے درمیان خلا پیدا کروانا جیسے بوڑھیاں اور ادھیڑ عمر کی عورتیں اپنی عمر کو کم دکھانے اور دانتوں کو حسین بنانے کے لئے کرتی ہیں کیونکہ اس طرح کا خلا چھوٹی بچیوں کے دانتوں کے درمیان ہوتا ہے لیکن جب عورت بڑی ہو جاتی ہے اور اس کے دانت بڑھ جاتے ہیں تو وہ یہ طریقہ اختیار کرتی ہے۔ امام نووی کے نزدیک یہ ایک حرام فعل ہے۔ خواہ اسے واقعی حسن کی ضرورت ہو اور اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لئے ام البنینؓ (مراد ہیں حضرت عمر بن عبدالعزیز کی بہن) کے اسوہ سے استدلال کرے جنھیں اپنے بعد ایک وارث کی ضرورت تھی اور اسی ضرورت کے پیش نظر انھوں نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا مگر فی الحقیقت وہ اس بات سے ناواقف تھیں۔

فطری طریقے

زینت کے فطری طریقوں سے ہماری مراد وہ طریقے ہیں جو سرمہ اور خضاب اور دوسرے سامان

آرائش کے ذریعہ سے اختیار کئے جاتے ہیں۔ ان کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اگرچہ یہ بھی تغیر خلق اللہ سے تعلق رکھتا ہے مگر فی الحقیقت یہ تغیرِ خلق اللہ سے نہیں کیونکہ یہ چیزیں عارضی ہوتی ہیں اور جلد ہی یا کچھ دیر بعد مٹ جاتی ہیں اور چہرہ اپنی اصل حالت پر آجاتا ہے۔ صاحب نیل الاوطار اس مسئلہ کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

"کہا جاتا ہے کہ حرمت صرف ان اشیاء کے استعمال میں ہے جو مستقل باقی رہتی ہیں لیکن اگر مستقل باقی رہنے والی نہ ہوں مثلاً سرمہ اور خضاب وغیرہ تو امام مالک اور دوسرے علماء کے نزدیک اس کے استعمال کی اجازت ہے۔"

عورت کی زینت صرف شوہر کے لئے ہونی چاہیئے

اوپر جن زینتوں کے استعمال کی اجازت دی گئی ہے وہ محض اپنے شوہر کو خوش کرنے اور اس کے دل میں اپنے لئے محبت کے جذبات پیدا کرنے کی خاطر ہیں۔ عورت کی تزئین و آرائش کا مقصد صرف یہی ہے اور یہی ہونا چاہیئے۔ اس کے برعکس اگر کوئی عورت دوسرے مردوں سے خراج تحسین وصول کرنے یا ان کی نظر میں کھب جانے کی غرض سے تزئین و آرائش کرتی ہے تو اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا کیونکہ یہ چیز فتنہ کا سبب اور گناہ کا ذریعہ ہے اور اللہ تعالیٰ عفیف اور پاک دامن عورتوں کو پسند کرتا ہے۔ ہم پیچھے اس کی بھی تفصیل بیان کر چکے ہیں کہ کن زینتوں کا اظہار غیروں کے سامنے جائز ہے اور کن زینتوں کا اظہار ناجائز۔

اختلاط

دورِ حاضر کے مسائل میں مرد اور عورت کے آزادانہ میل جول کا مسئلہ نہایت اہمیت اختیار کر چکا

ہے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ عورت اگر عفیف اور پاک دامن رہنا چاہتی ہے تو اس کا نفس اس اختلاط کو ہرگز گوارہ نہیں کر سکتا کیونکہ جس چیز کو ہم آزادانہ اختلاط سے تعبیر کرتے ہیں وہ نظروں کے ملاپ، آمنے سامنے ہونے اور بحث وگفتگو کرنے کے سوا اور کیا ہے۔؟ ذیل میں ہم اس مسئلہ کی تفصیلات پر بحث کرنا چاہتے ہیں۔

گھر کا اختلاط

(الف) کوئی عورت اپنے شوہر کے گھر میں بلا اس کی اجازت کسی کو اندر آنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔ نہ کسی غیر کے استقبال کے لئے اس کے سامنے جا سکتی ہے۔ ہاں اگر واقعی کوئی سخت ضرورت ہو تو اسے اس کی اجازت ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ خلوت نہ ہو اور اس کا شوہر اس سے واقف ہو یا آنے والا ان لوگوں میں سے ہو جو اس گھر میں بے تکلفی کے ساتھ آتے جاتے ہوں جیسا کہ دیہاتوں میں ہوتا ہے۔

(ب) بیوی اور شوہر کے اعزہ کو چاہیئے کہ اس کے پاس زیادہ مت آئیں جائیں اور اگر آئیں تو بلا ضرورت زیادہ دیر تک بیٹھنے سے پرہیز کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے آپ نے فرمایا:۔

"سنو! مرد عورتوں کے پاس جانے سے پرہیز کریں۔ صحابہ نے عرض کیا اللہ کے رسول! دیور کے بارے میں کیا ارشاد فرماتے ہیں آپ نے ارشاد فرمایا" دیور تو موت ہے۔"

اس بیان سے نبی کریمؐ کا منشا یہ ہے کہ دیور کا بیوی کے پاس آنا جانا اپنے جلو میں بہت سے خطرات سمیٹے ہوئے ہے کیونکہ شوہر اور بیوی کے یہ اعزہ گھر میں مستقل آتے جاتے رہتے ہیں اب اگر ان کے ساتھ میل جول بڑھایا جائے تو اس کا انجام بہت ہولناک ہو سکتا ہے۔ چنانچہ کبھی کبھی تو موت اور قتل پر منتج ہوتی ہے۔

مندرجہ بالا حکم سے ظاہر ہے کہ جب بھائیوں اور بھتیجوں کے آنے جانے کو شریعت اس قدر سخت نظر سے دیکھتی ہے تو دوست احباب۔ تو بہر حال آجا نہیں سکتے۔

باہر کا اختلاط

ہم پیچھے بتا چکے ہیں کہ عورت کا فطری جائے قیام اس کا گھر ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس کے باہر نکلنے کے کچھ قوانین و ضوابط ہوں تاکہ فساد کا اندیشہ ختم ہو جائے۔ ظاہر ہے اسے گھر سے باہر نکلنے کی تو روکا نہیں جاسکتا کیونکہ حاجات اور ضروریات ہر شخص کے ساتھ خواہ مرد ہو یا عورت۔ لگی ہوئی ہیں اس لئے سرے سے گھر سے باہر نکلنے پر پابندی عائد کرنا کسی طرح مناسب نہیں تھا چنانچہ اسی کے پیش نظر عورت کو اس بات کی دی گئی کہ وہ اپنے والدین، بہن بھائی اور دیگر اعزہ واقارب سے ملاقات کے لئے گھر سے باہر نکل سکتی ہے۔

وہ نماز کے لئے مسجد بھی جاسکتی ہے۔ گرچہ گھر میں نماز پڑھنا افضل ہے۔ علاج معالجہ، حصول علم، تہذیب و شائستگی سیکھنے نیز دینی علوم میں مہارت حاصل کرنے کے لئے بھی وہ گھر سے باہر آجا سکتی ہے البتہ ایسی جگہوں پر جانے سے گریز کرے جہاں آوارہ مزاج اور غنڈے رہتے ہوں۔

پھر وہ اپنی ضروریات کی تکمیل کے لئے کھیتوں اور بازاروں میں بھی جاسکتی ہے اسی طرح دوسرے مقامات پر جانے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے بشرطیکہ کوئی واقعی ضرورت درپیش ہو۔ چنانچہ عہد نبوی میں صحابہؓ کرام کی عورتوں کو اس کی اجازت تھی اور وہ ایسا کرتی بھی تھیں۔

تھیٹرز اور سینما ہاؤس

تھیٹرز، سینما یا کسی دوسری دلچسپ تفریح کو بھی دیکھنے کی اجازت ہے۔ اس مقام پر یہ بات واضح

طور سے سمجھ لینی چاہئے کہ یہ چیزیں بجائے خود بری نہیں ہیں بلکہ ان کا استعمال برا ہو رہا ہے آج کل ان پروگراموں میں ایسے ہیجان انگیز اور حیا سوز مناظر دکھائے جاتے ہیں جو پورے معاشرے میں اخلاقی انارکی اور جنسی بے راہ روی کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کر رہے ہیں ظاہر ہے کہ یہ چیزیں سوسائٹی کے اخلاق وعادات کو تہہ و بالا کر رہی ہیں اس لئے ان کے دیکھنے کا جواز کیسے نکل سکتا ہے۔ البتہ اگر ایسے سینما ہاؤس ہوں جن میں دلچسپ تفریحات۔ فطری مناظر اور اخلاق وکردار کو سنوارنے والی چیزیں دکھائی جائیں تو وہاں جانے میں کوئی حرج نہیں ہے اور اس سے تنفر کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے کیونکہ اسلام انسان کے ذوق جمال کو کچلتا نہیں ہے بلکہ انھیں بڑھاوا دیتا ہے چنانچہ حدیث شریف میں آپؐ کا یہ واقعہ کافی معروف ہے کہ آپؐ نے حضرت عائشہؓ کو حبشیوں کا کھیل دکھایا تھا۔

تفریح گاہیں اور پارک

ابھی تک ہماری نظر سے کسی کا کوئی قول یا تحریر ایسی نہیں گذری ہے جو عورتوں کو تفریح گاہوں، پارکوں اور کھلی جگہوں پر آنے جانے سے روکتی ہو۔ البتہ یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ عہد نبوی میں عورتیں شہر سے باہر جایا کرتی تھیں چنانچہ حضرت اسماء بنت ابوبکرؓ فرماتی ہیں کہ "میں اپنے شوہر زبیرؓ کے کھیت سے اپنے سر پر بوجھ لاد کر مدینہ پہونچایا کرتی تھی" جس کی مسافت مورخین کے اندازہ کے مطابق دو تہائی فرسنگ[1] علماءؔ نے اسی سے استدلال کرتے ہوئے مختصر سفر میں عورت کو بلا محرم سفر کرنے کی اجازت ہے۔

آج بھی ہمارے زمانے میں دیہاتی عورتیں اپنے گھروں سے کھیتوں میں جاتی ہیں اور اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے اور میں تو کہتا ہوں کہ شہر اور دیہات میں کوئی فرق نہیں ہے سوائے اس کے کہ شہروں

---

[1] حوالہ کے لئے ملاحظہ ہو طبقات ابن سعد اور اصابہ ابن حجر

میں عورتوں کو چھیڑنے اور پریشان کرنے والے زیادہ ہوتے ہیں اس لئے ایسی حالت میں عورتوں کا گھر سے باہر نکلنا مناسب نہیں ہے۔ ان حالات کو نظر میں رکھتے ہوئے شہر کی انتظامیہ کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ معاشرے کو ایسے مفسد عناصر سے پاک کریں اور اس سلسلہ میں وہی رویہ اختیار کریں جس کی ہدایت اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے نبی کو دی تھی۔ اور وہ یہ کہ:

لَئِنْ لَّمْ یَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِی الْمَدِیْنَةِ لَنُغْرِیَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا یُجَاوِرُوْنَكَ فِیْهَاۤ اِلَّا قَلِیْلًا (الاحزاب: ۶۰)

اگر منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں خرابی ہے اور وہ جو مدینہ میں ہیجان انگیز افواہیں پھیلانے والے ہیں ایسی حرکتوں سے باز نہ آئے تو ہم ان کے خلاف کارروائی کرنے کے لئے تمہیں اٹھا کر کھڑا کریں گے پھر وہ اس شہر میں مشکل ہی سے تمہارے ساتھ رہ سکیں گے۔

عوامی سواریاں

آج کل بڑے بڑے شہروں میں عوامی سواریوں کی کمی کی وجہ سے بڑی مشکلات پیدا ہوگئی ہیں جس سے عورتیں تو عورتیں خود مرد بھی پریشان ہیں۔ اس صورتِ حال میں اگر عورت پیدل چل کر اپنی منزل کو پہنچ سکتی ہو تو پیدل چلے ورنہ پھر ٹیکسی کرائے پر لے کر سفر کرے لیکن اگر اس کے اخراجات اس کے متحمل نہ ہو سکیں تو بدرجہ مجبوری وہ عوامی سواریوں ہی میں سفر کر سکتی ہے کیوں کہ زیادہ بھیڑ ہونے کے سبب غنڈوں کے چھیڑ چھاڑ کا اندیشہ کم ہو جاتا ہے۔ بہت پرانے زمانے سے علماء کا یہی خیال رہا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے جس کے سبب مناسک حج میں جہاں مردوں اور عورتوں کا اختلاط ہو جاتا ہے علماء نے اس مسئلے میں خاموشی اختیار کی ہے۔ یہی معاملہ طواف کعبہ کا بھی ہے کیوں کہ مردوں اور عورتوں کی کثرت کی وجہ سے کسی کے دل میں کوئی فاسد خیال نہیں آنے پاتا۔

فصل ہفتم

تحدید نسل

(فصل ثالث کا تتمہ)

تحدید نسل

تمہید

یہ ایک حقیقت ہے کہ نوع انسان کی افزائش اور بقا کا دار و مدار تناسل پر ہے۔ اور نکاح کے ذریعہ اسلام اسی مقصد کو حاصل کرنا چاہتا ہے چنانچہ علماء تفسیر قرآن مجید کی اس آیت فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ یہاں اِبْتِغَاءُ مَا كَتَبَ اللّٰهُ کو مباشرت کا مقصد بتایا گیا ہے اور اس سے مراد ابتغاء نسل ہے ابتغاء لذت نہیں۔

پھر یہ بھی مسلّم ہے کہ اسلام نہ تو کسی ایک طائفے یا فرقے کا مذہب ہے اور نہ ہی یہ کسی مخصوص امت کا دین ہے بلکہ پوری انسانیت کا دین ہے جو بلا تخصیص تمام انسانوں کو خدا کی بندگی کی دعوت دیتا ہے تاکہ خدا کا حکم ہر جگہ بلند و برتر ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایسے لوگوں کو پسند کرتا ہے جو اس کے مقصد کو سمجھتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو اس کی طرف بلانے کے لئے جد و جہد کرتے ہیں اس کی تائید و تصدیق میں سب سے آگے رہتے ہیں کیوں کہ انھیں معلوم ہوتا ہے کہ انسانیت کو فلاح و سعادت سے ہمکنار کرنے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی دین نہیں ہے کیونکہ اس کا مقصد روئے زمین سے فتنہ و فساد اور جہالت و خواہش پرستی کو ختم کر کے ایک خدا کا کلمہ بلند کرنا ہے اور انسانوں کو دوسرے سیاسی و معاشی خداؤں کی غلامی سے نکال کر ایک خدا کی غلامی میں لانا ہے۔

اور ظاہر ہے کہ تناسل نوع انسانی کی افزائش کا ایک اہم سبب ہے اس لئے قرآن کریم اور احادیث کے متعدد نصوص اسکی حوصلہ افزائی اور تعریف کے سلسلہ میں وارد ہوئے ہیں۔

اسلام تحدید نسل کی اجازت دیتا ہے

متعدد احادیث کا مطالعہ کرنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اسلام مخصوص مواقع پر منع حمل اور تحدید نسل کی اجازت دیتا ہے۔ ہم ذیل میں ان احادیث کا تذکرہ کر رہے ہیں جو اس سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں:

(الف) سب سے پہلی حدیث جسے اس مسئلہ میں بنیادی اہمیت حاصل ہے، حضرت جابرؓ سے مروی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"ہم رسول اللہؐ کے زمانے میں عزل کیا کرتے تھے اور قرآن نازل ہو رہا تھا۔" مسلم کی روایت میں کچھ الفاظ بدلے ہوئے ہیں اور وہ یہ ہیں:

"ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عزل کیا کرتے تھے۔ پھر آپ کو جب اس کی خبر پہونچی تو آپ نے ہم لوگوں کو روکا نہیں۔"

اور یہ عزل جس کا تذکرہ حضرت جابرؓ فرما رہے ہیں قدیم زمانے میں منع حمل کا معروف طریقہ تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ مباشرت ہونے کے بعد جب انزال کا وقت آتا تھا تو شوہر الگ ہو جاتا تھا اور منی دوسری جگہ خارج ہوتی تھی۔ اور اس طرح وہ نطفے کو رحم میں جانے سے روکتے تھے جس کا مقصد منع حمل ہوتا تھا۔

اور یہ جو فرمایا کہ "ہم عزل کرتے تھے اور قرآن نازل ہو رہا تھا۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر درحقیقت یہ کوئی خلاف شرع بات ہوتی تو یہ کیسے ممکن تھا کہ اللہ تعالیٰ اس غلط بات پر مسلمانوں کو متنبہ نہ کرتا جب کہ دوسری بہت سی غلط مروجات کو اللہ تعالیٰ نے بدل دیا تھا اور اس کا تذکرہ بھی قرآن میں موجود ہو۔

(ب) دوسری حدیث جسے امام احمد اور امام مسلم نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے وہ یہ ہے:
ایک آدمی نے نبی کریمؐ کی خدمت میں آکر عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ، ہمارے پاس ایک ہی لونڈی ہے جو گھر کا کام کاج کرتی ہے، ہمارے کھجور کے درختوں کی سینچائی کرتی ہے اور میں اس سے اپنی جنسی حاجت بھی پوری کرتا ہوں لیکن میں چاہتا ہوں کہ وہ حاملہ نہ ہو بتائیے میں کیا کروں۔ آپ نے جواب دیا اگر چاہو تو عزل کر لو مگر ہوگا وہی جو اس کی تقدیر میں ہے۔

منقولہ احادیث سے یہ صراحت ہوتی ہے کہ منع حمل کا یہ طریقہ۔ عزل۔ عہد نبوی میں معروف تھا لوگ اس کو اختیار کرتے تھے۔ اس کا علم آنحضرتؐ کو بھی تھا اور اس وقت وحی بھی نازل ہو رہی تھی لیکن اس کے باوجود نہ تو آپ نے انھیں ایسا کرنے سے روکا اور نہ وحی الٰہی نے انھیں ایسا کرنے سے باز رہنے کا حکم دیا۔ اور یہی چیز اس کے جواز کی دلیل ہے۔

اس کے علی الرغم کچھ ایسی حدیثیں بھی منقول ہیں جو پہلی دونوں حدیثوں سے متعارض ہیں اور اور یہی وجہ ہے کہ علماء اسلام نے اس کے جواز اور عدم جواز میں اختلاف کیا ہے۔

امام غزالیؒ نے ائمہ کے اختلاف کو نہایت اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے ساتھ ہی ان ائمہ کی رایوں کو پسند کیا ہے جو اس کے جواز کے قائل ہیں اور نہایت ٹھوس اور مضبوط دلائل سے اس کی توثیق بھی کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ

"اس مسئلہ کے جواز اور عدم جواز کے سلسلہ میں علماء کے چار مسالک ہیں بعض لوگوں نے اسے مطلق جائز بتایا ہے اور بعض لوگوں نے اسے مطلق حرام کر رکھا ہے۔ کسی نے اسے عورت کی مرضی پر موقوف کر دیا ہے اور کسی نے اس کی اجازت صرف لونڈی تک محدود کر دی ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ یہ جائز ہے۔

تحدید نسل کے اسباب

ا۔ شخصی مفاد

پیچھے والی حدیث جس میں ایک آدمی نے آکر اپنی مشکلات بیان کی تھیں، اس میں ہم پاتے ہیں کہ آپؐ نے اس کی مشکلات کا حل یہ تجویز کیا تھا کہ "تم اگر چاہو تو عزل کر لیا کرو"۔ یہ مشکلات جیسا کہ حدیث سے ظاہر ہوتا ہے معاشرتی، بدنی اور اقتصادی تین طرح کی تھیں۔ کیوں کہ جو لونڈی اپنے مالک کے گھر کی دیکھ ریکھ کرتی ہے اس کے باغات کو سینچتی ہے، اس کو جنسی تسکین پہونچاتی ہے اگر وہ حاملہ ہو جائے تو لازماً وہ کمزور ہو جائے گی اور اس کے اثرات اس کے تمام کاموں پر مرتب ہوں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ بالکل ہی بیکار ہو جائے۔ اس لئے اس کا حمل بہت سے نقصانات کا باعث ہوگا اور اگر اس کے مالک کو مطلق مباشرت ہی سے روک دیا جائے تو یہ اور بھی مشکل ہو جائے گا کیوں کہ اس سے فتنہ کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ اسلام خواہ مخواہ افراد کے اوپر ایسا بوجھ نہیں ڈالتا ہے جو فتنے کا باعث ہو چنانچہ اسی بوجھ کو مٹانے کے لئے آپ نے عزل کی اجازت مرحمت فرمائی۔

منع حمل کا ایک اقتصادی فائدہ یہ ہے کہ اس سے معاشی بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے اور اولاد کی کثرت کی وجہ سے تعلیمی اور تربیتی نظام میں جو نقص رہ جاتا ہے اس کے اندیشے ختم ہو جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف اگر اولاد کی کثرت ہو تو وہ جسمانی طور پر کمزور ہوتے ہیں اور طرح طرح کے ذہنی اور نفسیاتی مرض میں مبتلا رہتے ہیں جو ان کی اجتماعی صلاحیتوں پر بری طرح اثر انداز ہوتی ہے۔

ایک اور روایت اسی سلسلہ کی ملاحظہ فرمائیں:۔

مسند احمد اور مسلم میں بواسطہ حضرت اسامہ ابن زیدؓ مروی ہے کہ ایک آدمی نے حضور اکرمؐ

کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول میں اپنی بیوی سے عزل کرتا ہوں آپ نے پوچھا کیوں کرتے ہو؟ اس نے جواب دیا مجھے اس کے بچوں کے سلسلہ میں خوف محسوس ہوتا ہے۔ آپ نے کہا کہ اگر یہ نقصان پہنچانے والی چیز ہوتی تو روم اور ایران کے لوگوں کو ضرور نقصان پہونچاتی[1]

علامہ شوکانیؒ اسی حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"وہ اسباب جن کی بنا پر عزل کیا جا سکتا ہے ان میں ایک یہ ہے کہ اولاد کی کثرت کو روکا جائے تاکہ کم بچوں کی مناسب تعلیم و تربیت کا انتظام کیا جا سکے"۔

امام غزالیؒ ان اسباب کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں جن کی بنا پر منع حمل کا طریقہ اختیار کرنا جائز ہوتا ہے کہ:۔

تیسرا سبب اولاد کی کثرت ہے جو نہایت عظیم الشان کا سبب بنتا ہے۔ کیوں کہ زیادہ لوگوں کے لئے اگر کمانا ہو تو نہایت مشقت برداشت کرنی پڑتی ہے اور کبھی کبھی غلط ذریعہ آمدنی اختیار کرنے کے لئے مجبور ہونا پڑتا ہے[2]۔ اگر اس طرح کی پریشانی لاحق ہونے کا اندیشہ ہو تو عزل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

ہم پیچھے "تعدد ازدواج" کی فصل میں اس بات کی وضاحت کر آئے ہیں کہ قرآن کریم نے ایک ہی بیوی رکھنے کی جو ترغیب دی ہے اس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ مطالبات کی کثرت اور نفقہ کی وسعت سے بچا جائے نیز ایسی حالت میں معیشت کی کمی کے سبب جو پریشانی لاحق ہونے کا

---

[1] اس فرمان کا مطلب یہ ہے کہ عزل کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے کیوں کہ اگر کوئی قباحت ہوتی تو اس کے اثرات روم اور ایران کے لوگوں پر ضرور مرتب ہوتے کیونکہ وہ ایسا کرتے ہیں۔ اس لئے تم بھی عزل کر سکتے ہو۔

[2] قارئین اس مسئلہ کی وضاحت کے لئے امام غزالی کی کتاب احیاء العلوم الدین ملاحظہ فرمائیں۔

اندیشہ ہے اس کو ختم کیا جائے۔ آیت کریمہ جس کے ضمن میں یہ بات کہی گئی ہے یہ ہے:۔

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ذٰلِكَ اَدْنٰى اَلَّا تَعُوْلُوْا (النساء: ۳)

امام شافعیؒ ذٰلِكَ اَدْنٰى اَلَّا تَعُوْلُوْا کی تفسیر لا تکثر واعیالکم سے کرتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے تاکہ تمہارے یہاں بچوں کی کثرت نہ ہو جائے امام فخر الدین رازی اس کی تفسیر الا تفتقروا سے کرتے ہیں کیونکہ یہ لفظ عائل سے بنا ہے جس کے معنی فقیر کے ہوتے ہیں مطلب یہ ہے کہ جب آدمی کے عیال کم ہوں گے تو اس کا خرچ بھی کم ہوگا اور جب خرچ کم ہوگا تو اس کی محتاجی بھی ختم ہو جائیگی۔ علامہ زمخشریؒ امام شافعی کی الا تکثر واعیالکم والی بات لے کر اس پر یوں حاشیہ آرائی کرتے ہیں کہ یہ لفظ عال یعول سے ماخوذ ہے جس کے معنی پرورش کرنے کے ہیں اور جب آدمی زیادہ بال بچوں والا ہوگا تو لازماً اسے ان کی کفالت کی ذمہ داری بھی لینی ہوگی اس لئے اتنے بچوں کی پرورش کے لئے ہو سکتا ہے کہ وہ حدود الٰہی کا احترام نہ کر سکے اور حرام کمائی کمانے کے لئے مجبور ہونا پڑے۔

اسلام انھیں امور کا لحاظ کر کے فرد کو ایک شادی کی ترغیب دیتا ہے تاکہ بچے کم پیدا ہوں اور محتاجی کی لعنت سے وہ بچ جائے اس کے برخلاف اگر آدمی زیادہ بچوں والا ہوتا ہے تو اسے سخت معاشی اور معاشرتی الجھنوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسی حقیقت کو رسول اللہ صلعم نے دوسرے الفاظ میں یوں بیان کیا ہے:۔

"اولاد کی قلت ایک طرح کی خوشحالی ہے اور ان کی کثرت ایک طرح کی محتاجی ہے۔"

منع حمل کا معاشرتی فائدہ ماہرین نے یہ بتایا ہے کہ ہر عورت کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے شوہر کو خوبصورت لگے، اس کے سامنے بنی ٹھنی رہے اس کے تمام اعضاء حسین ہوں اس کا جسم بھرا ابھرا ہو تاکہ وہ اس کی دائمی محبت حاصل کر سکے اور اس کی ازدواجی زندگی خوشگوار ہو سکے

لیکن جب حمل و رضاعت کی کثرت ہو جائے گی تو ظاہر ہے کہ اس کا جسم کمزور ہو جائے گا اس کے اعضاء ڈھیلے پڑ جائیں گے اور پھر اس کے شوہر کے لئے اس میں وہ کشش اور دلچسپی نہیں رہ جائے گی جس کی وہ متلاشی ہے۔

اسی نکتہ کو امام غزالی نے اپنی کتاب احیاء العلوم میں پیش کیا ہے۔ وہ دراصل ان اسباب کا جائزہ لے رہے ہیں جن سے منع حمل کا طریقہ اختیار کرنا جائز ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں:

دوسرا سبب یہ ہے کہ اس طرح عورت کا حسن و جمال اور اس کی تندرستی برقرار رہتی ہے۔ اور اسے اس کا خوف نہیں رہتا کہ کہیں اس کا شوہر اسے طلاق نہ دے دے۔ اگر اس پر منع حمل کا طریقہ اختیار کیا جائے تو یہ ممنوع نہیں ہے۔

ہم اوپر جن احادیث اور اقوال ائمہ کا تذکرہ کر آئے ہیں ان کی روشنی میں یہ بات بے خوف وخطر کہی جا سکتی ہے کہ اسلام افراد کو منع حمل کے وسائل اختیار کرنے سے ہرگز نہیں روکتا بلکہ انھیں اس کی رعایت دیتا ہے کہ اگر اس کے اختیار کرنے سے انھیں کوئی جسمانی، معاشرتی یا اقتصادی فائدہ پہونچتا ہے تو اس سے وہ ہرگز گریز نہ کریں۔ اگر کسی حاملہ کی صحت کا خطرہ ہے اور اس حد تک ہے کہ اس کے اثرات دوسرے کاموں پر بھی پڑنے کا اندیشہ ہے تو اسے منع حمل کا طریقہ اختیار کر لینا چاہیئے۔ اور اس کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں ایک شخص نے آکر اپنی لونڈی کا مسئلہ پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر وہ حاملہ ہو جائے گی تو اسے یہ خطرات لاحق ہونے کے اندیشے ہیں۔ اس پر آپ نے اسے عزل کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ اسی طرح اگر منع حمل کا مقصد کثرت اولاد سے بچنا ہو تاکہ وہ کم بچوں کی تعلیم و تربیت اور غذا اور رہائش کا انتظام اچھی طرح کر سکے تو اس کے لئے بھی یہ طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ اجتماعی مفاد

امتوں کا معاملہ بھی افراد ہی کی طرح ہوتا ہے۔ بلکہ زیادہ صحیح معنوں میں افراد ہی امت اور معاشرہ ہوتے ہیں جن مشکلات و مسائل سے افراد فرداً فرداً نبرد آزما ہوتے ہیں انھیں سے امتوں کو بھی سابقہ پیش آتا ہے اس لئے افراد کے مسائل کا جو حل درست ہوتا ہے وہی حل امتوں کے لئے بھی درست ہوتا ہے بلکہ زیادہ مناسب یہ ہے کہ اس حل کو بڑے پیمانے پر اختیار کیا جائے کیوں کہ افراد کا دائرہ کار تو محدود ہوتا ہے اور وہ محض امت کی ایک اکائی کی حیثیت رکھتے ہیں اس لئے ان کا تھوڑا بہت نقصان تو گوارہ کیا جا سکتا ہے۔ مگر امت کی حیثیت ایک مجموعہ کی ہوتی ہے جس میں مختلف افراد کے درمیان اپنی خواہشات کی تکمیل کا ایک مقابلہ سا چلتا ہے اور ہر قوی اپنے سے ضعیف کو دبانا چاہتا ہے ظاہر ہے یہ چیز کسی بھی معاشرہ کے لئے خطرہ کی ایک سنگین علامت ہے جو ہمہ آن ملک کی سیاسی، معاشی اور انسانی اجتماعیت کو پارہ پارہ کر سکتی ہے۔ اسی لئے ارباب اقتدار کے لئے ضروری ہے کہ وہ ملک کی داخلی اور خارجی تمام مشکلات کو سمجھیں اور ان سے عہدہ برآ ہونے کی تدابیر سوچیں اور ملک کو سیاسی، معاشی اور اجتماعی حیثیت سے ترقی یافتہ بنانے کے لئے منصوبہ بند پلاننگ کریں تاکہ ملک صحیح معنوں میں ان خطرات کا مقابلہ کر سکے اور پوری امت ترقی کے راستہ کی طرف گامزن ہو سکے۔

چنانچہ اگر افراد کو مخصوص حالات میں اپنی مشقت اور پریشانیوں کو رفع کرنے کے لئے تحدید نسل اور منع حمل کے طریقے اختیار کرنے کا حق ہے تو امرائے وقت کو چاہئے کہ ملک کے سیاسی اقتصادی اور اجتماعی مفاد کا خیال رکھتے ہوئے اگر تحدید نسل کی ضرورت محسوس ہو تو اس کے لئے انھیں سہولیات فراہم کریں اور افراد کو اس بات کی ترغیب دیں کہ وہ منع حمل کے طریقے اختیار

کریں۔ لیکن اس سلسلہ میں اس کا خیال رکھنا چاہئیے کہ وہ اسلامی حد اعتدال سے تجاوز نہ کریں۔

اس مسئلہ کی مزید وضاحت کے لئے وہ خطبہ نقل کر رہے ہیں جسے عمرو بن عاص رض نے اس وقت دیا تھا جب وہ مصر کے گورنر تھے۔ وہ جمعہ کے دن تمام مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں[1]

"اے لوگوں چار چیزوں سے بچو کیونکہ یہ چیزیں آرام کے بعد تکلیف، وسعت و کشادگی کے بعد تنگی اور عزت کے بعد ذلت دیتی ہیں۔ بچو اہل و عیال کی کثرت سے، مال کے ضیاع سے اور حالت کی پستی سے ....."

یہاں یہ بتانا شائد غیر ضروری نہ ہو کہ حضرت عمرو بن العاص رض کی حیثیت دو پہلوؤں سے نہایت اہم ہے۔ ایک تو اس حیثیت سے کہ وہ نہایت صائب الرائے، دانش مند اور دور اندیش قائد ہیں جو معاشرے کی ضروریات اور مطالبات نیز سیاست کے داؤں پیچ سے اچھی طرح آگاہ ہیں اور دوسری حیثیت اس پہلو سے ہے کہ آپ ایک امام اور فقیہ بھی ہیں آپ نے رسول اللہ صلعم کے ساتھ رہ کر پوری بصیرت کے ساتھ دینی علوم سے آگاہی حاصل کی ہے اس لئے آپ کا تفقہ صحیح معنوں میں روح اسلام سے ہم آہنگ اور آپ کا انداز فکر اسلامی انداز فکر کے عین مطابق ہے۔ یہ خطبہ جیسا کہ معلوم ہے کہ یہ ایک اجتماعی خطبہ ہے جسے آپ نے صحابہ کرام رض کی ایک معتد بہ تعداد کے اندر دیا تھا اور یہ صحابہ بھی آپ ہی کی طرح آنحضرت صلعم کی خدمت میں رہ چکے تھے اور طویل زمانے تک آپ کے ساتھ رہ کر استفادہ کیا تھا۔ لیکن ان میں سے کسی نے اس کو قبول کرنے سے انکار نہیں کیا بلکہ اس کی تائید کی اگر اس میں انکار اور تردید کی ذرا سی بھی گنجائش ہوتی تو حضرت عمر بن الخطاب رض تو ضرور اس کو رد کر دیتے کیوں کہ اس وقت وہی خلیفۃ المسلمین اور دین کے امین تھے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں سے کسی نے بھی اس کی تردید نہیں کی اور حالات و ظروف کا لحاظ کرتے ہوئے اسے قبول کر لیا۔

فی زمانہ مسلم حکمرانوں کے لئے حضرت عمرو بن العاص رضؓ کا یہ خطبہ ایک نمونہ ہے جس پر عمل کرکے وہ امت مسلمہ کے بہت سے مسائل اور مشکلات کو حل کر سکتے ہیں جس میں یہ آج کل گھری ہوئی ہے یہاں ہم نے اس کو اسی غرض سے پیش کیا ہے تاکہ اس سے ان کی اجنبیت ختم ہو جائے اور وہ اس پر اسلامی انداز میں عمل کر سکیں۔

۴۔ تنظیم نسل اور مقدرات الٰہی

(الف) اوپر کی تفصیلات سے قطعی طور پر یہ نہ سمجھنا چاہئیے کہ تحدید نسل کا مقصود بالکلیہ منع حمل ہے۔ بلکہ اس کا مقصود فرد اور جماعت کی مصلحتوں کا پاس ولحاظ اور ان کی قوت وطاقت کی حفاظت نیز ان میں معاشی بیچارگی اور فقر وفاقہ سے نجات دلانا ہے: اور اگر ہم اسے عمرو بن العاص رضؓ کے الفاظ میں کہیں تو اس کا مقصد افراد کو راحت و آرام رزق کی وسعت وکشادگی اور عزت وتوقیر کے بلند مقام پر فائز کرنا ہے۔

(ب) بعض لوگوں کا خیال ہے کہ منع حمل کا مقصود دوسرے لفظوں میں قتل نفس ہے جو صحیح نہیں ہے۔ امام غزالیؒ نے اس کی تردید کی ہے۔ ان کے نزدیک اس کی حیثیت کسی طرح اسقاط اور قتل نفس کی طرح نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں ان کے قول کا خلاصہ یہ ہے کہ اسقاط اور قتل نفس کا سوال تو اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کسی زندگی کا وجود فعلاً ہو لیکن جہاں تک عزل کا تعلق ہے تو اس کا تعلق کسی وجود سے ہرگز نہیں ہے کیوں کہ تنہا مرد یا تنہا عورت کی منی سے کسی جاندار کا وجود ممکن نہیں اس کا سوال تو اس وقت پیدا ہوتا ہے جب مرد اور عورت دونوں کے پانی کا ملاپ ہو اور ان کا رحم میں استقرار ہو جہاں زندگی کا بیج پرورش پاتا ہے اگر اسے ساقط کر دیا جائے تو لازماً یہ ایک گناہ ہے اور اگر لوتھڑا بننے کے بعد اسقاط کرایا جائے تو یہ سخت ترین گناہ ہے۔ اور اگر ماں کی رحم

سے نکلنے کے بعد اسے قتل کیا جائے تو یہ گناہ کی آخری سرحد ہے۔ اس طرح گویا امام موصوف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ تنہا مرد کی مادہ منویہ سے کسی جنین کی تخلیق نہیں ہو سکتی اور نہ ہی تنہا مادہ کے بیضے سے یہ ممکن ہے جنین کا وجود تو اس وقت خیال کیا جائے گا جب دونوں کا ملاپ رحم میں ایک ساتھ ہو اگر اس ملاپ سے پہلے ہی انھیں ختم کر دیا جائے تو کسی طرح اسے قتل نفس کے خانہ میں نہیں شمار کیا جا سکتا۔ امام موصوف کی رائے بالکل واضح ہے اور اس میں حق کو پوری راستی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور بعض لوگوں کے اس خیال کی بھرپور تردید ہے جو اس فعل کو قتل کے مشابہ سمجھتے ہیں۔

(ج) بعض لوگوں کا خیال ہے کہ منع حمل کا طریقہ مقدرات الٰہی سے متعارض ہے۔ جب کہ رسول اللہؐ اس طرح کے گمان کو باطل قرار دے چکے ہیں چنانچہ لونڈی والی حدیث جسے ہم پیچھے نقل کر چکے ہیں اس میں آپؐ نے فرمایا تھا کہ:۔

اگر چاہو تو تم اس سے عزل کرو مگر ہوگا وہی جسے اللہ تعالیٰ نے مقدر کر دیا ہے۔

رسول اللہؐ کے اس قول کا مفہوم یہ ہے کہ مرد کا پانی تخلیق و تکوین کا مصدر نہیں ہے اس کی حیثیت سوائے ایک شبیہ ظاہری کے اور کچھ نہیں ہے۔ تخلیق کا اصل منبع خدا کی ذات ہے وہ اگر چاہے تو بلا سبب اور بلا کسی واسطے کے تخلیق کر سکتا ہے چنانچہ تاریخ میں اس کی مثال بھی موجود ہے کہ اس نے حضرت عیسیٰؑ کو بغیر باپ کے پیدا کیا تھا۔ چنانچہ ہمارا ایمان ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نہ چاہے تو دونوں چاہے جتنی مباشرت کریں اور چاہے جتنا اسباب ان کے لئے فراہم ہو جائے کسی جنین کی تخلیق ممکن نہیں ہے۔ اس کے برخلاف اگر اس کی مرضی ہو تو چاہے جتنا عزل کرو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا اور بچہ پیدا ہو کر رہے گا۔ اور یہی ہوا بھی کیوں کہ وہ آدمی جس نے اپنی مشکلات بتا کر عزل کی اجازت مانگی تھی ایک مدت کے بعد لوٹ کر آیا اور کہنے لگا اللہ کے رسول لونڈی تو عزل کے باوجود حاملہ ہو گئی یہ سن کر رسول اللہؐ نے کہا کہ میں تم سے پہلے ہی کہہ چکا تھا کہ تم عزل کرو

لیکن ہوگا وہی جسے اللہ نے تمہاری تقدیر میں لکھ دیا ہوگا۔ پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ عزل کی اجازت کس نے مرحمت فرمائی ؟ اللہ کے رسول نے تو کیا خدا کا رسول کسی ایسی بات کی اجازت دے گا جو حکم خداوندی کے خلاف ہو۔؟

(د) پیچھے ہم بتا چکے ہیں کہ قدیم زمانہ میں منع حمل کا معروف طریقہ عزل تھا۔ اور اب دور جدید کی نئی اکتشافات و ایجادات نے اس کے اور بھی بہت طریقے نکالے ہیں جس میں گولیوں اور دوسری چیزوں کے ذریعہ منع حمل کیا جاتا ہے۔ اس لئے ان ادویات و وسائل کو استعمال کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ اور خصوصاً اس وقت جب کہ ڈاکٹروں کا خود یہ مشورہ ہے کہ جسمانی اور نفسیاتی اعتبار سے ان ادویات کا استعمال عزل کرنے سے بہتر ہے۔

باب چہارم

عورت کے حقوق و فرائض

اس باب کے تحت ہم تین عناوین پر گفتگو کریں گے

۱۔ عورت کی میراث

۲۔ عورت کی تعلیم

۳۔ عورت کی ملازمت

عورت کی میراث

تمہید

پیچھے ہم اشارہ کرچکے ہیں کہ زمانۂ قدیم میں عورت کی وراثت کا کوئی تصور بھی نہیں تھا اور ہر وہ چیز جسکی خرید و فروخت ہوتی تھی اس پر اس کی وراثت اور ملکیت تسلیم نہیں کی جاتی تھی۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ گیارہویں صدی عیسوی تک بیوی کی خرید و فروخت بھی ہوتی تھی گویا اسلام کی آمد کے چھ سو سال بعد تک یہ گھناؤنی حرکت جاری تھی۔

۱۵۶۷ء میں گویا اسلام کی آمد کے ایک ہزار سال بعد اسکاٹلینڈ کی پارلیمنٹ نے ایک قرار داد پاس کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند مخصوص چیزوں پر اس کی حق ملکیت تسلیم کی جانے لگی۔ اسی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اسلام نے عورت کو جو حق بہت پہلے دے دیا تھا اس کا بعض حصہ بھی وہ ایک ہزار سال بعد بڑی رد و کد کے بعد دے سکے۔

اور یہ بات تو شائد سب کو معلوم ہو کہ اہل عرب عورت کو وراثت کا اہل نہیں سمجھتے تھے۔ کیوں کہ یہ ایک کمزور مخلوق تھی جو گھوڑے کی پیٹھ پر سوار نہیں ہو سکتی تھی، دشمن سے جنگ نہیں کرسکتی تھی، مال غنیمت نہیں سمیٹ سکتی تھی اور انھیں وجوہ کی بنا پر وہ حق وراثت سے بالکلیہ محروم تھی۔ حق وراثت صرف لڑکوں کے لئے خاص تھا جو جنگ کے میدان میں گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہوکر دشمن سے لوہا لیتے تھے، چنانچہ وراثت کا سب سے پہلا حق دار بڑا بیٹا ہوتا تھا اور پھر ترتیب کے ساتھ یہ وراثت اولاد ذکور میں منتقل ہوتی تھی۔ لیکن چھوٹے بچے جو جنگوں میں حصہ نہ لے سکتے تھے اس وراثت کے حق دار نہ ہوتے تھے حتیٰ کہ اگر کسی باپ نے مرتے وقت صرف لڑکیاں ہی چھوڑی ہوں تو یہ وراثت تمام کی تمام چچاؤں

کی طرف منتقل ہوجاتی تھی۔

بیٹی کو وراثت کا سب سے پہلا حق اسلام نے عطا کیا ہے

زمانہ جاہلیت میں اہل عرب کے یہاں لڑکیوں کی وراثت کا جو قاعدہ تھا اسے مجملاً ہم اوپر بیان کرچکے ہیں ظہور اسلام کے بعد عورت کو صحیح معنوں میں اس کا حق ملا اور جاہلیت کے تمام آثار کو یکلخت مٹادیا گیا۔

چنانچہ غزوہ احد کے موقع پر حضرت سعد بن الربیعؓ کی بیوی آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ سعد جنگ احد میں شہید ہوگئے اور اپنے پیچھے انھوں نے دو نوجوان لڑکیاں چھوڑیں ہیں ان کی شہادت کے بعد ان کے چچا نے ساری جائداد لے لی ہے اب ان کی شادی کا مسئلہ ہے جو بغیر مال کے ممکن نہیں۔ آپ نے یہ سن کر فرمایا کہ خدا کے فیصلہ کا انتظار کرو اور اس کے بعد یہ آیت میراث نازل ہوئی۔

يُوصِيكُمُ اللهُ فِيٓ أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ فَإِن كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ وَإِن كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ إِن كَانَ لَهُ وَلَدٌ فَإِن لَّمْ يَكُن لَّهُ وَلَدٌ وَوَرِثَهُ أَبَوَاهُ فَلِأُمِّهِ الثُّلُثُ فَإِن كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ مِن بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَآ أَوْ دَيْنٍ آبَآؤُكُمْ وَأَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا فَرِيضَةً مِّنَ اللهِ إِنَّ اللهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝ وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِن لَّمْ يَكُن لَّهُنَّ وَلَدٌ

فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ
يُّوْصِيْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۚ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ
وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ
وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۚ وَ اِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ
امْرَاَةٌ وَّلَهٗٓ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَاِنْ
كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ
يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ
حَلِيْمٌ (النساء ۱۱، ۱۲)

(تمہاری اولاد کے بارے میں اللہ تمہیں ہدایت کرتا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے اگر (میت کے وارث) دو سے زائد لڑکیاں ہوں تو انھیں ترکے کا دو تہائی دیا جائے اور اگر ایک ہی لڑکی وارث ہو تو آدھا ترکہ اس کا ہے اگر میت صاحب اولاد ہو تو اس کے والدین میں سے ہر ایک کو ترکہ کا چھٹا حصہ ملنا چاہیے اور اگر وہ صاحب اولاد نہ ہو اور والدین ہی اس کے وارث ہوں تو ماں کو تیسرا حصہ دیا جائے اور اگر میت کے بھائی بہن بھی ہوں تو ماں چھٹے حصہ کی حقدار ہوگی (یہ سب حصے اس وقت نکالے جائیں گے) جب کہ وصیت جو میت نے کی ہو پوری کر دی جائے اور قرض جو اس پر ہو ادا کر دیا جائے تم نہیں جانتے کہ تمہارے ماں باپ اور تمہاری اولاد میں سے کون بلحاظ نفع تم سے قریب تر ہے یہ حصے اللہ نے مقرر کر دیئے ہیں اور اللہ یقیناً سب حقیقتوں سے واقف اور ساری مصلحتوں کا جاننے والا ہے۔

اور تمہاری بیویوں نے جو کچھ چھوڑا ہو اس کا آدھا حصہ تمہیں ملے گا اگر وہ بے اولاد ہوں ورنہ اولاد ہونے کی صورت میں ترکہ کا ایک چوتھائی حصہ تمہارا ہے جب کہ وصیت جو

انھوں نے کی ہو پوری کر دی جائے اور قرض جو اُن پر ہو ادا کر دیا جائے اور وہ تمہارے ترکہ میں سے ایک چوتھائی کی حقدار ہونگی اگر تم بے اولاد ہو ورنہ صاحب اولاد ہونے کی صورت میں ان کا حصہ آٹھواں ہوگا۔ بعد اس کے کہ جو وصیت تم نے کی ہو پوری کر دی جائے اور جو قرض تم نے چھوڑا ہو ادا کر دیا جائے۔

اور اگر مرد یا عورت (جس کی میراث تقسیم طلب ہے) بے اولاد ہو اور اس کے ماں باپ بھی زندہ نہیوں، مگر اس کا ایک بھائی یا ایک بہن موجود ہو تو بھائی اور بہن ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا اور اگر بھائی بہن ایک سے زیادہ ہوں تو کل ترکہ کے ایک تہائی میں وہ سب شریک ہوں گے جب کہ وصیت جو کی گئی ہو پوری کر دی جائے اور قرض جو میت نے چھوڑا ہو ادا کر دیا جائے بشرطیکہ وہ ضرر رساں نہ ہو یہ حکم ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ دانا، بینا اور نرم خو ہے جب یہ آیات نازل ہوئیں تو آپ نے دونوں لڑکیوں کے چچا کو بلا بھیجا اور ان سے کہا کہ سعد کی دونوں بیٹیوں کو دو تہائی اور ماں کو آٹھواں حصہ دے کر جو باقی بچے وہ تمہارا ہے۔ اور یہ بیٹیوں میں وراثت جاری کرنے کی پہلی مثال تھی جو اسلام نے قائم کی۔

اس سلسلہ میں جن ذہنی پریشانیوں سے رسول عربیؐ کو گذرنا پڑا ہوگا اس کا اندازہ ہر انصاف پسند شخص لگا سکتا ہے۔ کیوں کہ برسوں اور صدیوں کے جمے جمائے خیالات و معتقدات کو بدل دینا کوئی آسان کام نہیں تھا لیکن آپ حکم الٰہی کی تعمیل میں مسلسل لگے رہے اور ماحول سے جہاد کرتے رہے اور اس طرح آپ نے اس صنفِ ضعیف کو اس کا حق دلا کر چھوڑا جسے صدیوں سے ہر گھر اور ہر مقام پر کچلا اور دبایا جا رہا تھا۔

اور یہ پریشانی صرف رسول عربیؐ کو ہی نہیں ہوئی بلکہ پورا معاشرہ اس نئے حکم کو سن کر متعجب ہوا اور انھیں یہ حکم شاق گذرنے لگا وہ آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے کہ "اب بیوی کو چوتھا اور

اور آٹھواں حصّہ دیا جائے گا اور لڑکی کو نصف اسی طرح چھوٹے بچے کو بھی ترکہ میں حصہ ملا کرے گا جب کہ نہ تو یہ جنگ کرتے ہیں اور نہ مال غنیمت لوٹتے ہیں۔"

پھر کچھ سوچ کر خود ہی کہنے لگے کہ اچھا اب اس معاملہ میں خاموشی اختیار کر لو کیوں کہ جیسے جیسے وقت گذرتا جائے گا آپ یا تو اسے بھول جائیں گے یا اس حکم کو ہی تبدیل فرمادیں گے۔

لیکن رسول اللہ ؐ نے ان کے خیالات کے برعکس نہ تو اسے بھلایا اور نہ ہی اس میں کوئی ترمیم کی اور برابر اس پر عمل کرتے رہے اور لوگوں سے کرواتے رہے۔ یہ چیز انقلاب کی اس گہرائی اور گیرائی کا پتہ دیتی ہے جو پورے عربی معاشرہ میں رچ بس گئی تھی۔ حالات بدلتے رہے مگر وہ نظام نہیں بدلا جس کی بنیاد اللہ تعالیٰ کے حکم سے رسول اللہ ؐ نے ڈالی تھی۔ کیوں کہ یہ ایک حکیم و علیم کا نظام تھا کسی کھلنڈرے کا کھیل نہیں۔

ترکہ میں عورت کی وراثت سے متعلق بعض وضاحتیں

ترکہ میں عورت کی وراثت کی بنیاد درج ذیل آیت کریمہ ہے

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا۔ (النساء: ۷)

(مردوں کے لئے اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور قریبی رشتہ داروں نے چھوڑا ہو خواہ تھوڑا ہو یا بہت یہ حصہ (اللہ کی طرف سے) مقرر ہے۔

لیکن واضح رہے کہ عورت کا حصہ وراثتوں میں بدلتا رہتا ہے اور اس کا اعتبار متوفی سے اس کے قرب اور بعد کی بنیاد پر ہوتا ہے اور اسی طرح مختلف قرابت داروں کے ساتھ اس کی حیثیت بھی مختلف ہو جاتی ہے۔ جس کی وضاحت ہم ذیل میں کر رہے ہیں۔

۱۔ (الف) ترکہ میں بہن کو بھائی کا آدھا حصہ ملے گا اور اس کی بنیاد یہ آیت کریمہ ہے:

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ

(تمہاری اولاد کے بارے میں اللہ تمہیں وصیت کرتا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے)

(ب) لیکن وارثین میں کوئی بھائی نہ ہو اور لڑکی تنہا ہو تو اسے پورے ترکہ کا نصف ملے گا۔ اور اس کی بنیاد اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے:

وَإِن كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۚ

اگر لڑکی تنہا ہو تو اس کو ترکہ کا نصف حصہ ملے گا۔

(ج) اور اگر لڑکیاں ایک سے زیادہ ہوں تو انھیں پورے ترکہ کا دو تہائی حصہ ملے گا اور اس کی دلیل یہ آیت ہے:

فَإِن كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۖ

اگر لڑکیاں دو سے زیادہ ہوں تو انھیں پورے ترکہ کا دو تہائی حصہ ملے گا۔

۲۔ ماں کی وراثت کے متعلق قرآن کریم کا بیان اس طرح ہے:

وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ إِن كَانَ لَهُ وَلَدٌ

اگر میت صاحب اولاد ہو تو اس کے والدین کو اس کے ترکہ میں سے چھٹا حصہ ملے گا

(ب) فَإِن لَّمْ يَكُن لَّهُ وَلَدٌ وَوَرِثَهُ أَبَوَاهُ فَلِأُمِّهِ الثُّلُثُ

لیکن اگر اولاد نہ ہو تو ماں کو کل جائداد کا ایک تہائی حصہ ملے گا۔

مطلب یہ ہے کہ اولاد کی عدم موجودگی میں ماں کو پوری جائداد کا ایک تہائی اور باپ کو دو تہائی حصہ ملے گا۔

(ج) فَإِن كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ

مطلب یہ ہے کہ اگر میت صاحب اولاد نہ ہو لیکن بھائی موجود ہوں تو ماں کا حصہ ایک تہائی سے گھٹ کر چھٹا حصہ ہو جاتا ہے۔

۳۔ بیوی کی وراثت کے متعلق قرآن کریم کا ارشاد یہ ہے

وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَمْ يَكُنْ لَكُمْ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ

اور وہ تمہارے ترکہ میں سے ایک چوتھائی کی حقدار ہونگی اگر تم بے اولاد ہو ورنہ صاحب اولاد ہونے کی صورت میں ان کا حصہ آٹھواں ہوگا بعد اس کے کہ جو وصیت تم نے کی ہو پوری کر دی جائے اور جو قرض تم نے چھوڑا ہو ادا کر دیا جائے۔

لڑکی کا حصہ لڑکے کا آدھا ہی کیوں؟

بادی النظر میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسلام نے لڑکی کو لڑکے کا نصف حصہ دے کر اس پر ظلم کیا ہے۔ لیکن یہ ایک ناقص مطالعہ ہے جس کی سطحیت بس تھوڑی سی غور و فکر کے بعد واضح ہو جاتی ہے۔ صاف بات یہ ہے کہ مرد گھر کا قوام بنایا گیا ہے اس کے کندھے پر اہل و عیال کی پرورش کا بوجھ ڈالا گیا ہے لیکن عورت کو اس سے بری الذمہ کر دیا گیا ہے پھر اسے عورت کا مہر بھی دینا ہوتا ہے اور منگنی کے موقع پر کچھ ہدایا اور تحائف بھی لڑکی کے گھر بھجوانے پڑتے ہیں اور آج کل تو خاص طور سے اس کی رسم سی چل پڑی ہے یہ تو لڑکے کے دینے کا معاملہ ہوا اس کے برخلاف اس کی بہن کو مہر بھی ملتا ہے ہدایا اور تحائف بھی اسی کے حصہ میں آتے ہیں۔

پھر شادی کے بعد بیوی کا نفقہ بھی شوہر کے ذمہ ہو جاتا ہے۔ روٹی کپڑا اور مکان کی ذمہ داری

بھی اسی کی ہوتی ہے اس کے برعکس بہن کو کچھ نہیں دینا پڑتا بلکہ اوپر سے اسے ملتا ہی ہے۔ اولاد کی پیدائش کے بعد بھی مزید ذمہ داری شوہر کے اوپر ہی آتی ہے ان کے کھانے کپڑے کا بھی بندوبست اسی کو کرنا پڑتا ہے جب کہ بیوی ان تمام چیزوں سے قطعی بری الذمہ ہوتی ہے۔

اس پہلو کو اگر سامنے رکھ کر دیکھا جائے کہ مرد کے کندھے پر گھر کا سارا بوجھ ہوتا ہے اس پر مشقتوں اور محنتوں کی ساری ذمہ داریاں ہوتی ہیں تو اس کا دوگنا حصہ کچھ زیادہ محسوس نہیں ہوگا جب کہ لڑکی کو نصف حصہ کے ساتھ مہر کی نفقہ کی بھی پوری سہولت ہوتی ہے، ہدایا اور تحائف بھی اسی کے حصہ میں آتے ہیں۔ اسے دیکھتے ہوئے کیا کوئی انصاف پسند شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ اسلام نے لڑکی کو نصف حصہ دے کر کوئی ظلم کیا ہے؟ ظلم تو اس وقت ہوتا جب دونوں کا حصہ برابر ہوتا کیوں کہ مرد کے کندھے پر طرح طرح کی ذمہ داریاں رکھی گئی ہیں اور عورت کو ان ذمہ داریوں سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔

اس پر ایک اعتراض یہ اٹھایا جاتا ہے کہ دور جدید میں جب کہ عورت بھی مرد کے شانہ بشانہ کام کرتی ہے، اس کی ذمہ داریوں میں برابر کا حصہ بٹاتی ہے بال بچوں کے خرچ اور گھر کے دوسرے اخراجات کو برداشت کرنے میں اس کا تعاون کرتی ہے تو کیا اب بھی اس کو وہی نصف حصہ ملنا چاہیئے؟ زمانہ کی قدریں تبدیل ہو گئی ہیں اور اس کے ساتھ ہی ضروری ہے کہ یہ قانون بھی تبدیل ہو اور مرد اور عورت کی وراثت میں کامل مساوات ہو۔

یہ اعتراض بظاہر تو بہت معقول معلوم ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ اس کے ظاہر سے دھوکہ کھا گئے اور "کامل مساوات" کے اس پر فریب نعرہ میں آ گئے اور اللہ تعالیٰ کے اس کو انھوں نے پس پشت ڈال دیا جس میں اس نے کہا تھا کہ:

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ (النساء - ۳۴)

مرد عورت پر قوام ہیں اس بنا پر کہ اللہ نے ان میں سے ہر ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے

اور اس بنا پر کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں)

ان کا خیال تھا کہ زندگی کے تمام شعبوں میں عورتوں نے کام کرنا شروع کر دیا ہے اور اس طرح وہ اپنی ضروریات کی تکمیل میں مرد کی محتاج نہیں رہ گئی ہیں بلکہ اب تو وہ اس پوزیشن میں ہیں کہ مرد کا تعاون کر سکیں اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ مرد اب بھی قوام رہیں۔ آیت کریمہ کا تعلق جس دور سے تھا وہ چونکہ اب ختم ہو چکا ہے اس لئے لازمی طور سے اب اس کا حکم بھی ختم ہو جانا چاہئے۔

یہ تھا اس کا ظاہری پہلو۔ لیکن کیا فی الحقیقت اس اعتراض میں کوئی جان ہے۔ آیئے اس پر بھی غور کریں۔ معترضین نے یہ تو دیکھ لیا کہ عورت بھی مرد کے شانہ بشانہ کام کرتی ہے لیکن وہ ان آفات و مصائب کو نہیں دیکھ سکے جو اس بنا پر پوری سوسائٹی میں نازل ہو گئے اور جس کی بنا پر عورت زندگی کی اعلیٰ روحانی قدروں سے محروم ہو گئی۔ قوانین فطرت سے انحراف کے نتیجہ میں اس کا وہ تقدس جاتا رہا جو اسے ماں اور بیوی کی شکل میں حاصل تھا وہ عزت و توقیر جو ایک مدت کے بعد اسلام نے عطا کیا تھا اس سے چھین لیا گیا۔ ظاہر ہے کہ اس صورت حال کو اسلام باقی رکھنا ہی نہیں چاہتا تو اس کے وجود سے اس کا حکم کیسے ختم ہو سکتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ آیت کریمہ اَلرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَآءِ ...... جملہ خبریہ نہیں ہے جو مندرج عبارت کے خبریہ مفہوم پر دلالت کرے۔ یہ آیت تو دراصل اس اجتماعی قانون کی وضاحت کے لئے اتری ہے جو کسی خاندان کی تاسیس اور اس کی بقا کے لئے ناگزیر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خاندانی نظام کے بقا و استحکام کا بنیادی اصول یہ ہے کہ مرد گھر کا سربراہ اور کرتا دھرتا ہو۔ وہی گھر کے متعلق تمام ضروری فرائض کا ذمہ دار ہو اور گھر کے تمام معاملات کے سلسلہ میں اسی کی طرف رجوع کیا جائے۔ یہ ہے اس آیت کا ظاہری پہلو۔

اور اس کا باطنی پہلو یہ ہے کہ یہ آیت کریمہ اس نفسیاتی قانون کی وضاحت کے لئے نازل ہوئی

فصل دوم

عورتوں کی تعلیم

تمہید

اولاد کے پاس اگر کوئی جائداد نہ ہو تو ان کے اخراجات کی ساری ذمہ داری باپ پر عائد ہوتی ہے اور یہ ذمہ داری کھانے اور کپڑے کے ساتھ اس بات کی بھی ہوتی ہے کہ وہ ان کی بہتر تربیت کرے تاکہ زندگی کے میدان میں جب وہ اتریں تو اپنے فرائض کو بحسن وخوبی انجام دے سکیں۔ اگر کوئی باپ اپنے اس فرض میں کوتاہی کرتا ہے تو حدیث نبوی کے الفاظ میں وہ بہت بڑے گناہ کا کام کرتا ہے۔ فرمایا

کفیٰ بالمرء اثماً ان یضیع من یقوت دفی روایۃٍ من یعول

(ابوداؤد، نسائی، حاکم)

آدمی کے گنہگار ہونے کے لئے یہی بات کافی ہے کہ جنھیں وہ کھلاتا ہے انھیں ضائع کردے اور ایک روایت کے الفاظ ہیں "جن کی وہ پرورش کرتا ہے"۔

اسلام نے اہل وعیال کے نفقہ کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ اسے اللہ کے راستہ میں انفاق سے بھی افضل قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

"سب سے بہتر دینار جسے آدمی خرچ کرتا ہے وہ دینار ہے جسے وہ اپنے اہل وعیال پر خرچ کرتا ہے اور وہ دینار ہے جسے وہ اپنے گھوڑے پر راہِ خدا میں جہاد کرنے کے لئے خرچ کرتا ہے اور وہ دینار ہے جسے وہ اپنے ساتھیوں پر اللہ کے راستہ میں خرچ کرتا ہے۔ (مسلم، ترمذی)

ابو قلابہ اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ چونکہ حدیث میں سب سے پہلے اہل وعیال پر خرچ کرنے کے بارے میں آیا ہے اس لئے جو اپنے چھوٹے بچوں پر خرچ کرتے ہیں اللہ ان کے کاروبار میں برکت دیگا اور انھیں مفلسی وغربت سے بے نیاز کردے گا۔

اس کی فضیلت کے سلسلہ میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت سی حدیثیں مروی ہیں

اس لئے اس پر کلام کرنا تحصیل حاصل ہے کیوں کہ ہر شخص اپنی اولاد پر خرچ کرتا ہے اور اس کا باعث اس کا جذبۂ محبت اور شفقت ہوتا ہے اور اس سلسلہ میں جتنی پریشانیاں آتی ہیں وہ اسے نہایت خوشی سے برداشت کرتا ہے کیوں کہ اس کا تعلق آدمی کے دل اور جذبات سے ہوتا ہے۔ یہ دل کی پکار اور نفس کی آواز ہی ہے جس پر وہ ہر وقت لبیک کہنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ دنیا میں ایسے لوگ شاذ و نادر ہی ہوں گے جو اس پکار پر کان نہ دھرتے ہوں، چونکہ ایسے لوگ آٹے میں نمک کے برابر ہوتے ہیں اس لئے ان کی بات ہی خارج از بحث ہے۔

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ آدمی خواہ تنگ دست ہو یا خوش حال ہر حال میں اپنی حیثیت کے مطابق اپنے بال بچوں کی پرورش کرتا ہے۔

۱۔ بیٹی اور بیٹا دونوں برابر ہیں

اسلام نے جس ماحول میں اپنی آنکھیں کھولیں وہ جاہلی ماحول تھا۔ جاہلیت کے اثرات سارے ماحول میں رچے بسے ہوئے تھے حتیٰ کہ مسلمانوں میں بھی کچھ لوگ ایسے تھے جو اس کے اثرات سے کسی نہ کسی حد تک متاثر تھے۔ لڑکیوں کی پیدائش کو وہ اپنے لئے پریشانی کا باعث سمجھتے تھے۔ ان کی نظر میں لڑکی بالکل بے وقعت اور بے حیثیت تھی اس کے مقابلہ میں لڑکا ہر لحاظ سے اس کے لئے قابل ترجیح تھا۔ آپ خود سوچئے کہ جو قوم اس قدر گر گئی ہو کہ اس کے کچھ افراد اپنی لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیتے ہوں لڑکیوں کی پیدائش پر ان کا کیا حال ہوتا رہا ہوگا۔ قرآن نے اس حالت کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی ہے

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ
يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ
يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ (نحل ۵۸-۵۹)

اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی پیدا ہونے کی خبر دی جاتی ہے تو اس کے چہرے پر کلونس چھا جاتی ہے اور وہ زہر کا سا گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے اس خبر سے جو شرم کا داغ اس کو لگ گیا ہے اس کے باعث لوگوں سے منہ چھپاتا پھرتا ہے اور سوچتا ہے کہ آیا ذلت کے ساتھ بیٹی کو لئے رہے یا مٹی میں دبا دوں کتنا برا فیصلہ یہ لوگ کرتے ہیں۔

اسلام نے آکر ایسے تمام جمے جمائے خیالات و معتقدات کی دھجیاں بکھیر دیں، لوگوں کے قلوب واذہان کو پاک کیا، گھر میں عورت کی حیثیت متعین کی، زندگی کی دوڑ میں اسے شریک کیا، باپ کے اوپر اس کے حقوق عائد کئے اس کی تعلیم و تربیت کو باعث اجر و ثواب بتایا چنانچہ اللہ کے رسول فرماتے ہیں:۔

"جنھیں اللہ تعالیٰ نے کچھ لڑکیاں عطا کی ہوں اور وہ ان کے ساتھ بہتر سلوک کرے تو وہ اس کے لئے جہنم سے ڈھال بن جائیں گی۔" (بخاری)

یہ "بہتر سلوک" جس کی طرف حدیث نبوی اشارہ کر رہی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی تربیت کی جائے، انھیں سلیقے سکھائے جائیں اور زندگی کے سرد و گرم حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے انھیں تیار کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام چیزیں بغیر علم کے حاصل نہیں ہو سکتیں۔ یہ علم ہی ہے جو آدمی کو مہذب بناتا ہے اور اسے فکری بالیدگی عطا کرتا ہے۔

ایک دوسری حدیث میں آپؐ نے فرمایا:۔

جس کے پاس تین بہنیں یا تین بیٹیاں ہوں، یا دو بہنیں اور دو بیٹیاں ہوں پھر وہ ان کے ساتھ بہتر برتاؤ کرتا ہے اور ان کے سلسلے میں اللہ سے ڈرتا ہے — اور دوسری روایت کے الفاظ ہیں کہ "وہ انھیں ادب سکھاتا ہے، ان کے ساتھ نیک سلوک کرتا ہے، ان کی شادی کراتا ہے تو اس کے لئے جنت ہے۔ (ابوداؤد)

اسلام نے صرف اس پر بس نہیں کیا کہ اس کے غصب شدہ حقوق اسے دلائے بلکہ اسے

لڑکے کے برابر کر دیا۔ اور ایک وجہ بھی اس سے نیچے رکھنا گوارا نہ کیا اور ایسے باپ سے جس نے دونوں کے ساتھ یکساں سلوک کیا بڑے اجر کا وعدہ کیا۔ فرمایا "جس کے یہاں لڑکیاں ہوں اور اس نے انھیں در گور نہ کیا، ان کی تذلیل و تحقیر نہ کی اپنے بیٹوں کو ان پر ترجیح نہ دی تو اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل کرے گا۔" (ابوداؤد)

اسے نظر میں رکھئے اور پھر ماضی کا جائزہ لیجئے۔ کیا زندگی کا کوئی گوشہ ایسا ہے جس میں لڑکوں اور لڑکیوں کو یکساں حقوق حاصل رہے ہوں نان و نفقہ اور تعلیم و تربیت کے یہ حقوق ہیں جنھیں اسلام نے عورت کو عطا کیا ہے اس کے باوجود اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ عورت کے حقوق مرد سے کم ہیں تو اس کا مزاج جاہلی اور اسلامی تعلیمات کے بالکل برعکس ہے۔

۲۔ تعلیم فرض ہے

اسلام میں علم کا حصول ہر مسلمان کے لئے فرض قرار دیا گیا ہے۔ ابن ماجہ میں صحیح سند کے ساتھ یہ حدیث مروی ہے کہ:۔

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ [۱]

علم کا حصول ہر مسلمان پر فرض ہے

---

[۱] ابن ماجہ۔ اس حدیث کے بارے میں عراقی نے تخریج الاحیاء میں لکھا ہے کہ بعض ائمہ نے اس کے سلسلہ سند کو صحیح قرار دیا ہے اصطلاح میں صحیح حدیث اس کو کہتے ہیں جس میں مندرجہ ذیل شرائط پائی جائیں (۱) سند متصل ہو یعنی بیچ کا کوئی راوی ساقط نہ ہو (۲) راوی عادل اور سیرت و کردار کے لحاظ سے قابل لحاظ ہوں (۳) حافظہ درست ہو اور صاحب فراست ہو۔ (۴) روایت شاذ نہ ہو (۵) معلل یعنی کسی قسم کی خرابی بھی نہ ہو۔

اور "ہر مسلمان" کا اطلاق علمائے اسلام کے نزدیک متفقہ طور پر مرد اور عورت دونوں پر ہوتا ہے اور تعلیم کا مطلب یہ ہے کہ انھیں اس طرح تیار کیا جائے کہ وہ زندگی کی بنیادی قدروں کو سمجھ سکیں۔ اس موقع پر ایک بار پھر ابو قلابہ کے قول کو تازہ کر لیجئے فرمایا "اس شخص سے بڑا اجر اور کس کا ہو سکتا ہے جو اپنے چھوٹے بچوں پر اس نیت سے خرچ کرے تاکہ اللہ تعالیٰ انھیں پاکیزہ زندگی عطا کرے، اس کے ذریعہ انھیں نفع پہونچائے اور انھیں بے نیاز کر دے"۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بچہ کی تربیت اس حیثیت سے کہ اللہ اس کے ذریعہ انھیں نفع پہونچائے اور زندگی کے مسائل سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت پیدا کرے بڑے ثواب کا کام ہے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ جہاں اولاد کے اور دوسرے حقوق ہیں وہیں باپ کے اوپر اولاد کا سب سے بڑا حق یہ ہے کہ وہ ان کی بہتر تعلیم و تربیت کا انتظام کرے۔ لیکن اگر کسی وجہ سے باپ اپنا یہ حق ادا کرنے سے قاصر ہو تو یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسے بچوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرے کیوں کہ تحصیل علم انسان کا بنیادی فریضہ ہے جس کے بغیر انسان کی زندگی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اور یہی وجہ ہے کہ اسلام کے نزدیک معاشرہ کی بنیادی ضرورت کھانا، کپڑا اور مکان نہیں ہے بلکہ اسکی اصل ضرورت۔ جو ان سب سے مقدم ہے۔ یہ ہے کہ معاشرہ کو مہذب بنایا جائے اور اس کی روحانی اور عقلی بنیادوں کو درست کیا جائے کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اصل اہمیت سلامت قلب اور استقامت عقل کو حاصل ہے اور جہاں تک جسمانی اور بدنی ضروریات کا تعلق ہے تو ان کی تکمیل بھی محض اس لئے ضروری ہے تاکہ انسانی زندگی کے اس عظیم الشان مقصد کو حاصل کیا جاسکے جس کے لئے انسان کی تخلیق کی گئی ہے۔ اور یہ منصہ اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک انسان کے دل و دماغ کی تربیت نہ کی جائے۔ اس لئے اگر حکومتی پیمانہ پر افراد امت کے درمیان صحیح اور نفع بخش تعلیم و تربیت کا بندوبست نہیں کیا جاتا ہے تو گویا معاشرہ کی سب سے اہم ضرورت سے چشم پوشی کی جاتی ہے

اور مقاصد کو چھوڑ کر صرف وسائل پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اور اسلام اس طرح کی کسی حکومت کا قائل نہیں ہے جس کا کام صرف قوانین بنانا اور ٹیکس لینا ہو۔ اس کے برخلاف اسلامی حکومت کی سب سے پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ لوگوں کے عقائد و عبادات کی طرف سے غفلت نہ برتے، ان کے معاملات کو باحسن طریق حل کرے اور دنیا سے ان کے تعلقات میں حسن پیدا کرے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا تھا کہ مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اور اسلامی حکومت میں خلیفہ رسول کا نائب ہوتا ہے اس طرح گویا وہ امت کا معلم جو انھیں علم و حکمت سے روشناس کراتا ہے۔ ان کی بہترین تربیت کرتا ہے اور ان کی معاش و معاد کو درست کرتا ہے۔ اور اگر وہ ان تمام معاملات سے دلچسپی نہیں لیتا تو وہ رسول اللہؐ کے مقصد بعثت سے ناواقف ہے۔

عورت کا دائرہ تعلیم

اسلام نے عورت کے ساتھ جو احسان عظیم کیا ہے وہ سب تسلیم، لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم عورت کو کس چیز کی تعلیم دیں۔؟ اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز جس میں کوئی اختلاف نہیں ہے یہ ہے کہ تعلیم کا مقصد آدمی کو مہذب، باسلیقہ نیک خو اور بہتر سیرت و کردار کا مالک بنانا ہے۔ اور اس کی ایسی تربیت کرنا ہے جو اس کی نظر کو وسیع کرے اور زندگی کے جملہ معاملات میں اس کی بہترین رہنمائی کرے اور اس میں صرف عورتوں کی تخصیص نہیں ہے بلکہ اس میں مرد بھی شامل ہیں۔

اسلام نے مرد اور عورت دونوں کو دین کی امانت سونپی ہے اور یہ امانت زندگی کی سب سے اہم امانت ہے بلکہ زیادہ صحیح لفظوں میں یہی زندگی کی اساس اور بنیاد بھی ہے۔ اور اس امانت کے فرض سے سبکدوش ہونے کے لئے مرد اور عورت دونوں پر مختلف قسم کی ذمہ داریاں ڈالی گئی ہیں اور ان ذمہ داریوں کا تعلق جیسا کہ ہم پیچھے بتا چکے ہیں کہ انسان کے عقائد و عبادات نیز اخلاق و اعمال سب سے

ہے اس لئے جب تک وہ خدا اور بندوں کے تعلق کی نوعیت اور احکام وعبادات کو نہ سمجھے اصول و عقائد کو نہ جانے، حق و باطل کے فلسفہ، معاشرے میں زندگی گزارنے کے قوانین موٹی موٹی اخلاقی قدروں، زندگی کے مقاصد اور اس کے مبادیات سے آگہی نہ حاصل کرے اور یہ نہ سمجھے کہ دراصل وہ علم ہی ہے جس سے کائنات کے اسرار و رموز کھلتے ہیں اور ظلم و جہالت کی تاریکی سے آدمی نجات پاتا ہے تو وہ بڑا کوتاہ اندیش ہوگا اور اس کے نتیجہ میں اسے ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ (تحریم - ۶)

اے اہل ایمان اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو جہنم کی آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔

اس آیت میں تمام اہل ایمان کو خطاب کیا گیا ہے جس میں مومنین اور مومنات سب شامل ہیں اور ظاہر ہے کہ جب آدمی خدا اور بندوں کے حقوق سے آگہی نہیں حاصل کرے گا تو وہ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو جہنم کی آگ سے کیوں کر بچا سکے گا۔ اس لئے آدمی کے اوپر خود اپنی جانب سے اور اپنے اہل وعیال اور پورے معاشرہ کی جانب سے سب سے پہلا حق یہ عائد ہوتا ہے کہ وہ علم حاصل کرے اور انھیں جہنم کی آگ سے بچانے کی تدبیر کرے۔

اسی طرح زوجین کے تعلقات کو مضبوط اور مستحکم بنانے کے لئے قرآن نے یہ قاعدہ مقرر کر دیا ہے۔ فرمایا وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ "عورت پر جیسے فرائض ہیں ویسے ہی اس کے حقوق بھی ہیں"۔ یہ حقوق و واجبات عورت کو حاصل ہیں اسی طرح مرد کو بھی کچھ حقوق حاصل ہیں اور ان حقوق و واجبات کو جانے بغیر کیسے ممکن ہے کہ دونوں کی ازدواجی زندگی پرسکون اور خوشگوار ہو سکے گی؟ پھر قانون قوامیت اَلرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ اور قانون سکن لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا

ازدواجی زندگی کے بعض اہم اجتماعی اور نفسیاتی گرہوں کو کھولتے ہیں اور چونکہ زوجین کے درمیان فکری اور وجدانی تعلقات کو استوار کرانے میں ان کا بڑا گہرا ہاتھ ہوتا ہے اس لئے یہ بھی علم و معرفت کا ایک دروازہ ہے اس سے انسان کی فکر میں وسعت اور دل میں گرمی پیدا ہوتی ہے اور اسی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے مردوں اور عورتوں کے حقوق کا تحفظ بھی کر دیا ہے۔ جناب رسول اللہؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ عورت اپنے شوہر کے گھر کی ذمہ دار ہے اور اس سے اس کی ذمہ داری کی بابت دریافت کیا جائے گا۔[1] اس ذمہ داری کے مختلف پہلو ہو سکتے ہیں مثلاً اقتصادی پہلو، جسمانی پہلو، معاشرتی پہلو، تربیتی اور انتظامی پہلو۔ ان تمام پہلوؤں کو تھوڑی دیر کے لئے نظر انداز کرتے ہوئے ہم گھر کے اخراجات کے بارے میں بحث کرتے ہیں کیوں کہ یہ موضوع دراصل آج کا سب سے اہم موضوع ہے اور ہر گھر کے ساتھ یہ مسئلہ لگا ہوا ہے چنانچہ ہم ایک آئیڈیل بیوی اسے تصور کرتے ہیں جو معمولی ماہانہ آمدنی میں اپنے گھر کا خرچ نکال لے حالانکہ یہ نہایت گھسا پٹا اصول ہے کیوں کہ گھریلو زندگی کو خوشگوار بنانے اور خاندانی تعلقات میں سکون پیدا کرنے کے لئے خوشحال زندگی کی بڑی اہمیت ہے بلکہ کہنا چاہئے کہ خاندانی نظام کو مطمئن اور پرسکون بنانے میں اس کا پہلا درجہ ہے اس لئے معاش کے معاملہ میں عورت کو کبھی تنگ نہیں کرنا چاہئے اور اسے ضرورت سے کچھ زیادہ ہی دینا چاہئے تاکہ وہ اپنی ذمہ داری کو بحسن و خوبی نبھا سکے۔

ایک اور سوال یہ ہے کہ وہ بچے کی نگرانی کس طرح کرے؟ واضح رہے کہ یہاں نگرانی سے ہماری مراد بچے کی غذا، لباس اور کھانے پینے نیز سونے اور جاگنے کی نگرانی نہیں ہے بلکہ نگرانی سے ہماری مراد اس کی ذہنی اور اخلاقی نگرانی ہے۔ کیوں کہ بچے کی مثال ایک زندہ مشین کی ہوتی ہے جسے اپنے بھلے برے کی قطعاً تمیز نہیں ہوتی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس انداز میں اس کی تربیت کی جائے جو اسے ذہنی،

---

[1] اسے روایت کیا ہے امام احمد، بخاری، مسلم، ابوداؤد اور ترمذی نے۔

فکری اور اخلاقی اعتبار سے مہذب اور باسلیقہ بنا سکے؟

بلاشبہ اس وقت عورت کی اہمیت و حیثیت بہت بڑھ جاتی ہے جب وہ اس پوزیشن میں ہوتی ہے کہ ایک انسان کی تربیت کرے اسے روحانی اخلاقی اور دینی قدروں سے آشنا کرائے اور اس کا تقاضا ہے کہ وہ دین کا ہمہ جہتی علم حاصل کرے۔ فلسفہ، علم النفس، اخلاق و ادب اور معاشرتی علوم کا مطالعہ کرے اور یہ مطالعہ محض اس لئے نہ ہو کہ اس کے ذریعہ وہ معلومات میں اضافہ کرے بلکہ اس لئے ہو تاکہ وہ اس کے ذریعہ اپنی تربیت کر سکے نیز اپنی فکری اور وجدانی قوتوں کو ان کا پابند کر سکے۔ اور سب سے پہلے خود وہ اس کا نمونہ بن جائے جس جہت پر وہ اپنے بچہ کی تربیت کرنا چاہتی ہے۔ اس مقام پر ہم آئیڈیل ماں کی صفات کا تذکرہ کر کے اس بحث کو طول نہیں دیں گے کیوں کہ اس سلسلہ میں پیچھے ہم جو بحث کر چکے ہیں وہی کافی ہے لیکن "گھر کی محافظ" کی حیثیت میں اس کی ذمہ داری کی بابت کچھ ضرور عرض کریں گے کیوں کہ اسلام نے اس کو جو یہ ذمہ داری سونپی ہے اس کا تقاضہ ہے کہ وہ اس کے حسب حال علم و تہذیب سے آشنا ہو اور معاشرہ کا یہ فرض ہے کہ وہ اسے اس راہ میں آسانیاں بہم پہونچائے اور اس سلسلہ میں اس کے جو حقوق ہیں اس کی وضاحت تو ہو چکی ہے اس لئے مزید کسی بحث کی ضرورت نہیں ہے۔

پھر ایک ذمہ دار عورت کی فکری اور نفسیاتی زندگی بھی اس کے اثرات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی کیوں کہ ذمہ داری کا احساس "احساسِ ذات" کے مرادف ہے جس سے اپنے فرائض کو انجام دینے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور یہیں سے اس کی اہمیت و حیثیت دوبالا ہو جاتی ہے کیوں کہ یہ احساس ذہن انسان کی ہمہ جہتی تربیت کرتا ہے، وہ نفس کو متحرک اور چاق و چوبند رکھتا ہے اور عقل کو مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر سوچنے کے لئے آمادہ کرتا ہے۔ اور یہ چیز انسان کی تربیت کے لئے ایک مضبوط سہارا اور اس کی شخصیت کو مکمل کرنے کے لئے مضبوط بنیاد ثابت ہوتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ فطرت نے مرد اور عورت کے درمیان فرق کر دیا ہے اور اس سے اس کا منشا

یہ ہے کہ زندگی کے معاملات میں مرد اور عورت کو الگ الگ خصوصیتیں عطا کرے چنانچہ دونوں کی جسمانی ساخت میں جو فرق ہے وہ اسی حکمت کو ملحوظ کر کے رکھا گیا ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ دونوں راستوں میں کون سا راستہ معاشرہ کے لئے زیادہ فائدہ مند اور فطرت انسانی سے ہم آہنگ ہے؟ کیا اسے وہ تعلیم دی جائے جس کے ذریعہ وہ اپنے تخلیقی مقصد کو بروئے کار لا سکے یا اسے ایسی تعلیم سے آراستہ کیا جائے جسے سیکھ کر وہ اپنے مقصد تخلیق سے انحراف کرے؟

واضح رہے کہ ہم اس کے منکر نہیں ہیں کہ عورت کی عقل مرد کی طرح نہیں ہے۔ ہمیں اس سے بھی انکار نہیں ہے کہ جن علوم وفنون کو مرد سیکھ سکتا ہے عورت بھی اس میں مہارت حاصل کر سکتی ہے۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ فطرت نے دائرہ کار کی جو تقسیم کر دی ہے اس لحاظ سے کون سا علم کس کے لئے زیادہ موزوں ہے اور فطرت نے مرد اور عورت کی جسمانی ساخت میں جو اختلاف رکھا ہے اس اعتبار سے ان کے علوم ومعارف کی تقسیم بھی ناگزیر ہے یا نہیں؟

عورت کی تخلیق کا منشا یہ ہے کہ وہ ایک آئیڈیل ماں اور بہترین بیوی ہو اور یہی فطرت ہے جس پر اللہ نے اس کی تخلیق کی ہے ظاہر ہے اللہ کا ہر کام سرتاپا خیر ہی ہوتا ہے اس لئے اگر ہم اسے ایسی تعلیم دیں جو اس کی اصل فطرت سے انحراف کا موجب ہو اور اس کی ایسی تربیت کریں جو قانون زوجیت اور امومت کے منافی ہو تو چاہے وہ سب کچھ بن جائے مگر فی الحقیقت وہ ایک آئیڈیل ماں اور بیوی نہیں بن سکتی جو اس کے لئے ناگزیر ہے۔

آج عورت علم زراعت سیکھ رہی ہے سائنس و ٹکنالوجی میں مہارت حاصل کر رہی اور طب و جراحت کے میدان میں بھی مردوں کے دوش بدوش ہے۔ لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ اس نے یہ سب سیکھ کر بحیثیت عورت کون سی ترقی کی ہے؟ ہاں اگر کچھ ہوا ہے تو یہ کہ وہ اپنے فطری دائرہ سے نکل گئی ہے

اور صحیح معنوں میں اب وہ ایک عورت نہیں بلکہ مرد بن گئی ہے۔

ہم یہ دعویٰ نہیں کرتے ہیں کہ اس تعلیم نے عورت کی حمل و ولادت کی صلاحیت ختم کردی ہے کیوں کہ عورت ہونا مجرد اعضاء جسمانی کے اختلاف کا نام نہیں ہے بلکہ فی الواقع یہ ایک روحانی قانون اور فطری صلاحیت کا نام ہے جس کے ذریعہ مرد اور عورت کی "انسانیت" ایک دوسرے سے جدا ہوتی ہے ایک کا مزاج دوسرے کے مزاج سے مختلف ہوتا ہے۔ اور یہ سب اس لئے ہے تاکہ وہ کارگہ حیات میں اپنے مفوضہ فرائض و واجبات کو بحسن و خوبی نباہ سکے۔ یہی وہ خاص بات ہے جس کو عورت کی تعلیم و تربیت میں ملحوظ رکھنا چاہیے اگر ان کا لحاظ نہ کیا گیا تو اس کی صلاحیتیں کمزور ہو جائیں گی بلکہ ٹوٹ جائیں گی۔

عورت بلاشبہ عورت ہے وہ یا تو کسی کی بیوی ہوگی یا ماں۔ کیوں کہ یہی اس کی فطرت ہے اور وہ ترقی کرکے چاہے جس منزل پر پہونچ جائے وہ اپنی اس فطرت سے ابا نہیں کرسکتی۔ اور لوگوں کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ اسے اس کے فطری دائرہ میں رہنے دیں اگر انھوں نے اسے اس کے دائرہ سے باہر نکالا اور اس کے فطری ضوابط کو پامال کیا تو یہیں سے معاشرہ میں فساد و بگاڑ کے نئے نئے سوتے پھوٹنے شروع ہو جائیں گے۔ اس لئے اگر ہم چاہتے ہیں کہ عورت صحیح معنوں میں ایک باکردار بیوی اور آئیڈیل ماں بنے تو ہمیں اس کی فطرت کا خیال رکھنا ہوگا اور اسی میں معاشرہ کی ہر طرح کی بھلائی ہے۔

لیکن اگر حالات و ظروف اس کا تقاضہ کریں کہ لڑکیوں کو ڈاکٹر اور معلمہ بنایا جائے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں کیوں کہ ہم تو خود اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ عورت کا علاج خود عورت ہی کرے اور عورت کو خود عورت ہی تعلیم دے البتہ جہاں تک دوسرے علوم کا تعلق ہے مثلاً کیمیاوی علوم انجینئرنگ۔ زراعت اور فلکیات وغیرہ تو یہ سب زائد چیزیں ہیں اور ان کی تعلیم لڑکیوں کو بس ضرورت ہی تک دینی چاہیے۔

ایسی بات نہیں ہے کہ اسلام میں لڑکیوں کے لئے ان علوم کی تحصیل حرام ہے لیکن مصلحت کا تقاضا ہے کہ انھیں ایسی چیزوں کی تعلیم دی جائے جو ان کے لئے نفع بخش ہوں اور شرعی مصلحتیں بھی قانون

اسلامی کا ایک جزء ہیں کسی چیز کی حلت و حرمت پر یہ بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔ چنانچہ جب گہرائی کے ساتھ ان مقاصد پر نظر ڈالیں گے جن کے پیش نظر عورت کی تخلیق کی گئی ہے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اس کے فوائد کیا ہیں اس کے برخلاف اگر ہم اپنے اچھے اور برے کا معیار یورپ کو بنالیں گے اور وہ اپنے کو جس سانچے میں ڈھالے گا ہم بھی اسی میں ڈھل جائیں گے تو یہ چیز ہمارے لئے نہایت نقصان دہ اور مضرت رساں ثابت ہوگی۔

فصل سوم

عورت کی ملازمت

پہلا باب

عورتوں کی ملازمت کی وجہ سے مغرب میں طرح طرح کی معاشی اور معاشرتی پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ مثال کے طور پر اقوام متحدہ کی تنظیم آج تک مرد اور عورت کی تنخواہوں میں عملی طور پر مساوات قائم کرنے سے قاصر ہے۔ خود وہاں کے ماہرین اس مساوات کے حق میں نہیں ہیں اور منطقی نتیجہ کے اعتبار سے اسے سخت نقصان کا موجب سمجھتے ہیں۔ عمرانیات، قانون اور نفسیات کے ماہرین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ عورت اسی کام کے لئے موزوں ہے جو اس کی فطرت اور مزاج سے ہم آہنگ ہو۔ فطرت کی اس تقسیم عمل کو ملحوظ نہ رکھنے ہی کا نتیجہ ہے کہ آج کا معاشرہ پستی و انحطاط کی آخری انتہا کو پہونچ گیا ہے اور اخلاقی قدروں کی پامالی ہو رہی ہے۔

اب ہم اہل عرب بلکہ عالم اسلام نے بھی اس کا عملی تجربہ شروع کر دیا ہے اور وہ وقت دور نہیں جب ہمیں بھی اس طرح کے مسائل سے سابقہ پیش آئے گا جن میں آج کل مغرب الجھا ہوا ہے۔ چنانچہ ہم پردہ اور بے پردگی کی بحث کو نظر انداز کرتے ہوئے عورتوں کی ملازمت کے مسئلہ پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں نیز یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس کے وجوہ کیا ہیں اور مغرب میں اس کے نتائج کیا رونما ہوئے ہیں۔

اس مسئلہ کا سب سے بنیادی پہلو یہ ہے کہ ہم حامیان آزادی نسواں سے یہ دریافت کریں کہ آج وہ کون سا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے جس کی وجہ سے وہ عورت کی ملازمت کے قائل ہو گئے ہیں، جب کہ اس سے پہلے ایسا نہ تھا؟ وہ کیوں چیخ رہے ہیں کہ عورت گھر کو چھوڑ کر کمانے کے لئے باہر نکلے؟

اس کے جواب میں جو کچھ کہا جاتا ہے وہ مختصراً ذیل کی سطروں میں یہ ہے:۔

۱۔ عورت کی ملازمت اس کے ذہن و فکر میں وسعت پیدا کرتی ہے اس کی شخصیت کو

سنوارتی اور نکھارتی ہے نیز اسے طویل صبر آزما تنہائی سے بچاتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ گھر کی چہار دیواری میں گھٹ گھٹ کر مر جاتی۔

۲۔ کسی قوم کی ترقی کا راز یہ ہے کہ اس میں کام کرنے والے ہاتھ زیادہ ہوں اور عورت چونکہ ہمارے معاشرہ کا نصف حصہ ہے اس لئے اگر ہم اسے اپنے ساتھ زندگی کی دوڑ میں شریک نہ کریں تو صحیح معنوں میں ہم ترقی نہیں کر سکتے۔

۳۔ تیسرا فائدہ یہ ہے کہ وہ اس کے ذریعہ اپنے کفالت کرنے والے کی مدد کر سکتی ہے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سرے سے اس کا کوئی کفیل ہی نہیں ہوتا تو وہ اپنی کفالت خود کرتی ہے۔ ایسا بھی ممکن ہے کہ شوہر وفات پا جائے اور ایسے بچے چھوڑ جائے جن کی ذمہ داری بھی اس کے سر ہو اس صورت میں بھی ضروری ہے کہ وہ اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ بھرنے کے لئے باہر نکلے اور کمائے۔ پھر وہ ایک "انسان" بھی تو ہے جس کی اپنی کچھ ضروریات بھی ہوتی ہیں اور ان کا تقاضا ہے کہ اس کے پاس مستقل آمدنی ہو تاکہ وہ اپنی ضروریات خود پوری کر سکے اور کسی کے اوپر بوجھ نہ بنے اور اس کی عزت نفس کا بھی تقاضا ہے کہ وہ باہر نکلے اور اپنی روزی آپ کمائے۔

اب آیئے ان دلائل کا تحلیل و تجزیہ کرتے ہوئے یہ پتہ لگائیں کہ ان میں وزن کتنا ہے، کھرا کتنا ہے اور کھوٹ کس قدر۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ان کا تجزیہ کرتے ہوئے نہ تو عصبیت برتیں گے اور نہ ہی ہوائے نفس سے کام لیں گے۔ ہمارے دلائل ایک طرف قرآن و حدیث سے آراستہ ہوں گے تو دوسری طرف عقل و فطرت سے بھی ہم آہنگ ہوں گے۔

شخصیت کا ارتقاء

جہاں تک اس کا تعلق ہے کہ باہر نکلنے سے عورت کے ذہن میں وسعت و کشادگی پیدا ہوتی

ہے تو یہ صحیح ہے اور اس میں کسی کو بھی اختلاف نہیں ہو سکتا ہم خود بھی اس کے قائل ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ ذہنی اور فکری طور پر زیادہ سے زیادہ ترقی کرے۔

لیکن جن لوگوں نے اسے پیش کیا ہے ان کا بنائے استدلال دراصل عورتوں کی وہ جہالت ہے جو ماضی کی نسلوں میں تھی اور جن کے اثرات آج بھی ہمارے درمیان موجود ہیں، حالانکہ اس کا سبب دراصل ان کی دینی اور دنیاوی علوم سے بے پرواہی اور تہذیب و شائستگی نیز ادب و تمیز سے ناآشنائی تھی جس کی وجہ سے وہ روشن خیال، باذوق اور سلیقہ مند نہ بن سکیں زندگی کی قدروں سے ناواقف اور اس کے حقوق سے ناآشنا رہیں اور گھر کے داخلی و خارجی امور میں کوئی استعداد پیدا نہ کر سکیں نتیجہ کے طور پر اس جہالت نے ان کی زندگی کے دائرہ کو تنگ کر دیا اور وہ اس حد تک گر گئیں کہ اپنی اہمیت و حیثیت تک بھول گئیں اور انھیں اس کے سوا کچھ یاد نہ رہا کہ وہ صرف گھر بلو کام کاج کرنے اور بچہ جننے کے لئے بنائی گئی ہیں۔ ان کا بلند و بالا مقصد ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا نتیجۃً ان کی ذہنیت روز بروز پست سے پست تر اور تاریک سے تاریک تر ہوتی چلی گئی۔

ہم پیچھے وضاحت سے بتا چکے ہیں کہ جنسی زوجیت کے ماوراء ایک اور زوجیت ہوتی ہے جسے ہم روحانیت کا نام دیتے ہیں اور اس کا ثمرہ سکون، مودت اور محبت ہے اسی طرح مادریت کے پس پردہ ایک اور مادریت ہوتی ہے جو حمل، ولادت اور رضاعت سے ماوراء صرف روحانی ہوتی ہے اور اسی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ لڑکے کو روحانی زندگی عطا کرتا ہے جس سے والدین کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوتا ہے اور اس کے بعد وہ صحیح معنوں میں زندگی کی نعمت سے آشنا ہوتے ہیں، یہی روحانیت ہے جس کی وجہ سے لڑکا اپنے والدین کے احکام کی اطاعت کرتا ہے اور ان کی خدمت کر کے خوشی حاصل کرتا ہے اور یہی وہ کڑی ہے جس کی وجہ سے معاشرہ میں افراد کے مابین تعلقات کی رسی مضبوط، مستحکم اور پائیدار ہوتی ہے۔ ہم پیچھے یہ بھی بتا چکے ہیں کہ قوانین زوجیت و امومت کے فوائد اسی وقت حاصل

ہو سکیں گے جب ان کی شرائط پوری کی جائیں گی[1]

ہم پیچھے یہ بھی ثابت کر چکے ہیں کہ اس کی غایت وجود انسانیت کی تکمیل اور اعلیٰ روحانی اقدار سے متصف ہونا ہے۔ وہ معاشرہ کی اجتماعی اور سیاسی حالات کی نگراں اور حکومت و سیاست کی محافظ بھی ہے۔

ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ علم کا حصول عورت کے لئے محض ایک "حق" ہی نہیں بلکہ یہ اس کا فرض ہے جس کا ذمہ دار اس کے اہل خاندان کے علاوہ پورہ معاشرہ ہے۔ اور اس کے اوپر وہ علم سیکھنا ضروری ہے جو اس کے ذہن میں وسعت پیدا کرے عقل کو روشنی بخشے، ضمیر کو بیدار کرے، زندگی کے عام معاملات میں مہذب اور شائستہ بنائے زوجیت اور مادریت کے روحانی اور اجتماعی مقاصد سے روشناس کرائے اور معاشرہ کا فرض ہے کہ وہ اس کے لئے حالات کو ساز گار کرے تاکہ حسی اور نفسیاتی طور پر قوانین زوجیت و امومت کو کام کرنے کے لئے میدان فراہم ہو سکے اپنی انسانیت کی تکمیل کر سکے اور زندگی کی جولانگاہ میں وہ اپنے ان مقاصد کو روبعمل لاسکے جس کے لئے اس کی تخلیق کی گئی ہے۔

اور ان تمام چیزوں کے لئے ہم نے ان تمام بنیادی خطوط کی نشاندہی کی ہے جنھیں اسلام عورت کی زندگی میں لاگو دیکھنا چاہتا ہے۔ اور ہمیں یقین ہے کہ اگر اسلامی معاشرہ کو ہلاکت و تباہی اور پسماندگی کے ان عوامل سے بچا لیا جائے جس کا سابقہ اسے ماضی میں کرنا پڑتا ہے اور اسے یہ موقع بہم پہونچایا جائے کہ وہ اسلامی خطوط پر اپنی عورتوں کی تربیت کر سکے تو آج بھی مسلمان عورت دنیا کی دوسری عورتوں سے ممتاز ہو سکتی ہے ان کے لئے اسوہ اور آئیڈیل بن سکتی ہے اپنی تہذیب و شائستگی اور علوِ منزلت کا لوہا منوا سکتی ہے اور گھر کے داخلی و خارجی امور کی نگرانی میں ضرب المثل بن سکتی ہے۔ چنانچہ میں مشورہ

---

[1] ان شرائط کی پوری تفصیل زوجیت اور امومت کے عنوان کے تحت پیچھے گذر چکی ہے۔ اس کو پڑھ کرنے سرے سے پھر اس بحث کو ملاحظہ کرلیں تو بہتر ہوگا۔

دیتا ہوں کہ اگر سچ مچ ہم عورت کی شخصیت کو سنوارنا چاہتے ہیں اس کے ذہن میں وسعت پیدا کرنا چاہتے ہیں اسے خواب غفلت سے بیدار کرنا چاہتے ہیں اور زندگی کی دوڑ میں اسے شریک کرنا چاہتے ہیں تو ہم اسلام کے ان زندۂ جاوید اصولوں پر عمل کریں جن کا تذکرہ ابھی ہم کر چکے ہیں ہمیں یقین ہے کہ ان پر عمل کر کے ہم ان خوابوں کی سچی تعبیر حاصل کر سکتے ہیں جنھیں ہمارے مصلحین ایک مدت سے دیکھ رہے ہیں۔

ہاں یقیناً اس میں یہ شامل نہیں ہے کہ وہ کارخانوں، بنکوں اور دوسری جگہوں کا چکر کاٹے لیکن فی الحقیقت بیماری کا یہی علاج ہے اور ظاہر ہے کہ جب ہمیں ایسا نسخہ ہاتھ آگیا ہے جو اسے اس کی طبعی حالت میں رکھتے ہوئے ہی ٹھیک کر دے تو ہم اسے ہی کیوں نہ آزمائیں جب کہ دوسرے طریقۂ علاج میں ہمیں اس کو اس کے طبعی دائرے سے باہر نکالنا پڑتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب میں اسلام ہی وہ مذہب ہے جو عورت کے اوپر فرض کرتا ہے کہ علم و ثقافت کے زیور سے آراستہ ہو اور دوسرے مذاہب اس صفت سے بالکل خالی ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ میری اس بات سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔

اسلامی معاشرہ میں عورت کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ معاشرہ کو درست کرے تحریر و تقریر کے ذریعہ حکومت کی اصلاح کرے اور جو تنظیمیں اس مقصد کے لئے سرگرم عمل ہوں ان میں شامل ہو۔ ان تمام چیزوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی جسمانی صلاحیت اور اپنے اوقات کو ایسے قیمتی مشاغل کے سیکھنے میں صرف کرے جو اسے بہترین زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھائیں، زندگی کی اہمیت و حیثیت سے اسے روشناس کرائیں اس کے ذہن میں وسعت پیدا کریں اس کی شخصیت کو سنواریں اور ایک مثالی اور باکردار عورت بننے میں اس کی مدد کریں۔ مندرجہ بالا مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے ان صلاحیتوں کا پیدا کرنا بہت ضروری ہے اس کے برعکس ہم کسی کو یہ کہتے ہوئے نہیں پاتے ہیں کہ — ان مقاصد کے حصول کے لئے اسے کارخانوں میں جا کر لوہا کوٹنا چاہئے، دوکانوں میں جا کر سامانوں کی پیکنگ

کرنی چاہیئے، بھڑکیلے لباس پہن کر نمائش گاہوں اور تھیٹروں کو آباد کرنا چاہیئے۔ کیا ان مقاصد کے حصول کے لئے یہ کام کسی طرح ممد و معاون ہو سکتے ہیں؟ کیا ہم اس سے یہی سب کام لے کر اسے روشن خیال اور وسیع الذہن بنائیں گے؟

صحیح بات یہ ہے کہ عورت اپنے شوہر کے گھر کی نگراں، اس کی جائداد کی محافظ، اس کے معاملات کی پاسبان اور زوجیت و مادریت کے فطری مقاصد کو سچے دل اور خلوص نیت کے ساتھ روبعمل لانے کے لئے اس کی ساتھی، مونس اور غمخوار ہے۔ اس کا سارا وقت، ذہن و دماغ کی ساری صلاحیتیں اسی کے لئے وقف ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہماری اس بات میں کسی کو اختلاف ہو اور وہ یہ سمجھے کہ یہ رائے صرف میری ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ خود امریکہ ہی کی ایک جدید خاتون کا اقتباس نقل کردوں ظاہر ہے کہ وہ گھر کی بھیدی ہے اور اس کی بات واقعات و تجربات پر مبنی ہوگی۔ ہم اس پر "عورت دشمن" یا "رجعت پسندی" کا الزام نہیں لگا سکتے۔

مشہور مصنفہ فیلس ماکجلی اپنے ایک مقالہ "عورت۔ گھر کی ملکہ" کے زیر عنوان ایک سوال کا جواب دیتی ہے۔ سوال تھا۔ "کیا ہم عورتوں کو اپنی آزادی کے نقطۂ عروج پر پہونچنے کے بعد وہاں سے لوٹ آنا چاہیئے اور اگر ہم اپنے گھروں کو واپس چلی جائیں تو کیا یہ اپنی جنس کے ساتھ ناانصافی نہ ہوگی"؟ وہ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھتی ہے۔

میں اس مسئلہ میں ایک مضبوط رائے رکھتی ہوں اور میں اصرار کرتی ہوں کہ عورت کا یہ حق ہے وہ گھر میں گھر کی ملکہ بن کر رہے۔ میں اس کی اہمیت اور حیثیت کا اندازہ لگا سکتی ہوں جو عورت انسان کی فلاح و بہبود کے لئے انجام دیتی ہے اور میں اسے انسان کی زندگی اور اس کی ترقی کے لئے بالکل کافی سمجھتی ہوں[۱]۔

---

[۱] مجلہ المختار ۱۵ مارچ ۱۹۶۰ء

اس مصنفہ کی یہ گفتگو اس کی نسوانیت کا پتہ دیتی ہے۔ اس کی گفتگو ملاحظہ ہو "کیا ہم اپنی جنس سے خیانت کریں گی"، پھر اس کا یہ کہنا کہ "میں اس کی اہمیت کا اندازہ لگا سکتی ہوں جو عورت النسانی بہبود کے لئے کام کرتی ہے" اور یہ گفتگو کوئی اور نہیں بلکہ مغربی اور امریکی عورت کر رہی ہے۔ امریکہ! جہاں عورت کا کام کرنا ایک جیتی جاگتی حقیقت ہے۔ اس لئے اس کی یہ بات یقیناً تجربہ سے بھرپور ہوگی اور اس اعتبار سے، اس کی یہ تائید کافی وزن دار ہے کہ "انسان کی زندگی اور اس کی حقیقی ترقی کے لئے عورت کا گھر کی ملکہ ہونا ضروری ہے۔"

اب اس کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ اس مسئلہ میں مزید کسی قیل وقال کی گنجائش نہیں۔ کیونکہ ہمارا یقین ہے کہ معاشرہ کو ترقی دینے اور اس کو فلاح وکامرانی سے ہمکنار کرنے کے لئے ضروری ہے کہ عورت اصلاحی اور سیاسی میدانوں میں کام کرنے مگر انھیں خطوط پر جن کا تذکرہ ہم نے پیچھے کیا ہے اور یہ چیز عورت کی شخصی اور ذہنی ارتقاء کے لئے نہایت اہمیت کی حامل ہے۔

قوم کی ترقی

جہاں تک اس کا تعلق ہے کہ قوم کی ترقی کا دارومدار کام کرنے والوں کی کثرت پر ہے اور عورت معاشرہ کا نصف حصہ ہے اس لئے اگر اسے زندگی کی دوڑ میں شریک نہ کیا جائے تو صحیح معنوں میں ترقی نہیں ہوسکتی۔ تو میرا خیال ہے کہ یہ بھی صحیح ہے۔ لیکن یاد رہے قوموں کی ترقی کے دو پہلو ہیں ایک اس کی روحانی ترقی جس میں اس کے عقائد، اخلاق، اقدار اور اعلیٰ کردار زیر بحث آتے ہیں، اور دوسری ترقی اس کی جسمانی ترقی ہے جس میں اس کی سیاست، معیشت اور عسکری قوت سے بحث کی جاتی ہے۔ اور جو قوم ان دونوں ہی میں آگے ہو وہی فی الواقع ترقی یافتہ کہلائے جانے کی مستحق ہے۔ میری مراد اس قوم سے ہے جس کے افراد شجاع اور دلیر ہوں جس کے مقاصد نیک ہوں اور جو قوموں پر حکومت کرنے کی قدرت اور صلاحیت رکھتی

ہو یہی وہ اوصاف ہیں جو کسی قوم کی ترقی کے لئے ضروری ہیں اور ہمارا یقین ہے کہ اسلام ان دونوں پہلوؤں کے لحاظ سے کامل اور مکمل ہے وہ اگر ایک طرف اس بات کا حکم دیتا ہے کہ فَاتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسْتَطَعْتُمْ یعنی اپنی حد تک اللہ سے ڈرتے رہو۔ تو دوسری طرف وہ انھیں اپنی عسکری قوت کو بڑھانے کا حکم دیتا ہے وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ" اور تم لوگ جہاں تک تمہارا بس چلے زیادہ سے زیادہ طاقت تیار رکھو" مطلب یہ ہے کہ تمہارے پاس سامان جنگ اور ایک مستقل فوج ہر وقت تیار رہنی چاہئے تاکہ بوقت ضرورت فوراً جنگی کارروائی کر سکو۔

اور اس کام کو اپنی فطری صلاحیتوں کے اعتبار سے مرد اور عورت دونوں کو انجام دینا ہے۔ اسلام ان دونوں کو اجتماعی، سیاسی اور اصلاحی میدانوں میں برابر کی ذمہ داری سونپتا ہے اور انھیں اپنی اپنی ذمہ داریوں کا جوابدہ ٹھہراتا ہے بس فرق صرف اس قدر ہے کہ وہ ان ذمہ داریوں کو اپنے فطری دائرہ میں رہ کر انجام دینے کا حکم دیتا ہے اور یہی عقل و فطرت کا تقاضا بھی ہے۔ مرد کی فطری ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے اہل وعیال کے لئے روزی کمائے اور عورت کی فطری ذمہ داری یہ ہے کہ وہ گھر کی نگرانی اور حفاظت کرے یہ کام ظاہر ہے کہ نہایت سخت اور دشوار ہے اور نتیجہ کے اعتبار سے مقدس ترین ہے اس کے علاوہ ایک عورت پر کچھ قدرتی ذمہ داریاں بھی ہیں مثلاً قدرت نے اس کے اوپر حمل، وضع حمل، رضاعت اور تربیت کی ذمہ داریاں بھی عائد کی ہیں شوہر کی نگہداشت اس کی خدمت اور اس کو مودّت و محبت کے جذبات سے ہمکنار کرنا بھی اسی کی ذمہ داری ہے۔ مادریت کے روحانی اور اجتماعی فوائد بھی اسی کی ذات سے وابستہ ہیں۔ یہ ذمہ داریاں نہایت عظیم الشان ہیں اور ان کا تقاضا ہے کہ وہ اپنی تمام تر صلاحیتیں ان ذمہ داریوں کو انجام دینے میں صرف کرے۔

یہ دو طرح کی ذمہ داریاں ہیں جنھیں قدرت نے ان کے فطری مذاق کا لحاظ کرتے ہوئے ان پر عائد کی ہیں اور ان ذمہ داریوں کی ٹھیک ادائیگی میں ہی معاشرہ کی اقتصادی اور روحانی ترقی

کا راز پنہاں ہے ۔ اگر یہ دونوں اپنی ذمہ داریوں کو بحسن و خوبی انجام دیں ۔ لیکن اگر یہ دونوں یا ان میں سے کوئی ایک اپنی ذمہ داریوں سے انحراف اور روگردانی کرتا ہے تو معاشرہ ہرگز ترقی نہیں کر سکتا اور کوئی قوم صحیح معنوں میں ترقی یافتہ نہیں کہی جا سکتی کیوں کہ معاشرہ کا نصف حصہ یا پورا معاشرہ جہالت ۔ حماقت اباحیت پسندی کے سیلاب میں غرق ہو چکا ہوتا ہے ۔

"قوموں کی ترقی اور کام کرنے والوں کی کثرت" دوسرے اعتراض کا مرکزی خیال ہے اور اس کا دفعیہ ہم نہایت ایجاز کے ساتھ اوپر کی سطروں میں کر چکے ہیں لیکن ان کا خیال ہے کہ اسلامی معاشرہ میں عورت جو معاشرہ کا نصف حصہ ہوتی ہے ۔ ایک عضو معطل کے مانند ہوتی ہے اور خاندان کی تاسیس و تعمیر میں وہ کوئی رول ادا نہیں کر سکتی ۔ پھر ان کا یہ بھی خیال ہے کہ کوئی عورت اس وقت تک "کام کرنے والی" نہیں کہی جا سکتی جب تک وہ کارخانوں، کچہریوں اور بنکوں کی خاک نہ چھانے اور وہ کام نہ کرے جس سے وہ خارج میں کچھ کما سکے ۔

ممکن ہے کسی کی نظر میں یہ پہلو زیادہ خوشنما معلوم ہو اور وہ اس معاملے میں مغرب کی تقلید ہی کرنا چاہتا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایسا نہ بھی ہو ۔ لیکن اس بات سے کسی کو مجال انکار نہیں ہو سکتا کہ عورت کی اصل جہالت یہ ہے کہ وہ زندگی کے مقصد اپنی حقیقت اور اپنی ذمہ داری سے ناواقف ہو اور اس کی اصل نادانی یہ ہے کہ اسے یہ نہ معلوم ہو کہ اپنے گھر اور اپنے ماحول کو کیسے سنوارا جا سکتا ہے اپنے شوہر سے نباہ اور تعلق کی صحیح صورت کیا ہوتی ہے ۔ ہم میں سے بعض لوگوں کا یہ خیال بھی ہے کہ گھر میں رہنے والی عورت بالکل بے حیثیت ہوتی ہے یہ آزادیٔ نسواں کے علمبردار ہیں جن کے نزدیک عورت کے گھر میں رہنے سے اس کی شخصیت پر بہت غلط اثرات مرتب ہوتے ہیں البتہ اگر وہ گھر سے باہر نکل کر کام کرے تو وہ افراد اور معاشرہ کے لئے نہایت اہم خدمات انجام دے سکتی ہے ۔ جب ہم اس نقطہ پر بحث کرتے ہیں تو ہمارے سامنے درج ذیل نتائج آتے ہیں ۔

اوّل ۔ عورت جب تعلیم حاصل کرے گی اور ادب و تہذیب کے اس زیور سے آراستہ ہوگی جسے اسلام نے اس کے اوپر فرض کیا ہے اپنی حقیقت اپنی حیثیت اور اپنی ذمہ داریوں سے جب وہ اچھی طرح آشنا ہوگی اور انھیں بحسن و خوبی انجام بھی دے گی اور اپنے معاشرتی فرائض اچھی طرح نباہے گی تو وہ بیکار نہیں ہو سکتی ۔ ہم پیچھے بتا چکے ہیں کہ معاشرہ کے ترقی یافتہ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ مادی اور روحانی دونوں اعتبار سے ترقی یافتہ ہو جس میں مرد کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ دولت کمائے اور اپنے اہل و عیال کے لئے رزق فراہم کرے اور یہیں سے دونوں کی ذمہ داریوں میں فطری طور پر امتیاز پیدا ہو جاتا ہے اور امت کو مادی اور روحانی طور پر ترقی یافتہ بنانے کے لئے کاموں کی یہ تقسیم ناگزیر بھی ہے اور یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ جو اپنے فطری حدود کے اندر رہ کر کام کرے گا وہ کبھی بے کار نہیں رہ سکتا ۔ مزید یہ کہ جب ہم عورت کی ذمہ داریوں پر نظر ڈالتے ہیں تو مرد کے مقابلے میں اس کا کام مشکل نظر آتا ہے پھر اس کے کاموں میں تقدس کی جو جھلک ہوتی ہے مرد کا کام اس قدر مقدس نظر نہیں آتا۔

دوم :۔ اور اگر اس اعتراض کا منشا یہ ہے کہ خاندان کی تعمیر میں عورت کی حیثیت، محبت رحمت اور روحانی سکون پیدا کرنے میں اسکی اہمیت اور بچہ کی اس ڈھنگ سے تربیت کہ وہ خدا اور بندوں کا صحیح صحیح حق پہچان سکے اور اپنے والدین کا اطاعت گزار بن سکے اگر ان کی نظر میں ان کاموں کی کوئی حیثیت نہیں اور ان کاموں کا انجام دینے والا چنداں اہمیت کا حامل نہیں تو یہ ان کی عقل کا فتور ہے انھیں چاہئیے کہ وہ خود آگے بڑھ کر ان کاموں کو انجام دینے کی کوشش کریں پھر انھیں معلوم ہو جائیگا کہ جس کام کو وہ قطعاً اہمیت کا مستحق نہیں سمجھتے وہ کس قدر اہمیت کا حامل ہے ۔ ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ وہ کبھی ہم پر بلکہ پوری انسانیت پر ایسا دن نہ لائے جب آپسی محبت اور رحمت کے جذبات ختم ہو جائیں، خدا کی بندگی اٹھ جائے اور بیٹوں کے دلوں سے والدین کی اطاعت اور شکر گزاری کے جذبات ختم ہو جائیں کیونکہ یہ وہ روحانی نعمتیں ہیں جن کا بدل دنیا کا بڑے سے

بڑا مادی فائدہ نہیں ہو سکتا۔

یہ بات ہم نے ان کی اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے کہی ہے کہ عورت باہر کے کام کرنے کی استطاعت رکھتی ہے اور بیرون خانہ اور اندرون خانہ دونوں جگہوں کی ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی ادا کر سکتی ہے۔ گویا ان کے نزدیک عورت دو طرح کی ذمہ داریوں کو ایک ساتھ نباہ سکتی ہے۔ ایک تو باہر کا کام جسے مرد کرتا ہے دوسرا وہ کام جسے اس کے علاوہ کوئی اور نہیں کر سکتا میری مراد حمل، وضع حمل، رضاعت اور بچہ کی روحانی اور جسمانی تربیت سے ہے۔ کام کی اس طرز تقسیم میں عورت کے ساتھ جو ظالمانہ رویہ اختیار کیا گیا ہے فی الحال ہم اس سے قطع نظر کرتے ہیں اور دو دوسرے مسئلوں سے بحث کرتے ہیں۔

اول۔ معترضین خود یہ کہتے ہیں کہ "عورت کے لئے اندرون خانہ اور بیرون خانہ دونوں جگہوں کا کام کامل ہم آہنگی سے کرنا ممکن ہے"۔ اس طرح گویا وہ خود اس کا اعتراف کرتے ہیں اندرون خانہ بھی وہ کام کرتی ہے بیکار نہیں رہتی اس طرح وہ اسے بیکار رہنے کا جو طعنہ دیتے ہیں خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔

دوم :۔ اندرون خانہ اور بیرون خانہ کی ذمہ داریوں کو ہم آہنگی کے ساتھ نباہنا ایک ایسا دعویٰ ہے جس پر حقیقت کی دنیا میں عمل کرنا ناممکن ہے۔ اسے ایک مثال کے ذریعہ اس طرح سمجھئے کہ عورت کی ایک ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے شوہر کو سکون پہونچائے جس کا تقاضا ہے کہ اس کے اندر ہمہ آن مودت ومحبت کے لطیف احساسات پائے جائیں جو شوہر کے لئے باعث سکون قلب ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ سب چیزیں ہیں جن کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں کیا جا سکتا مثلاً اس سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ظہر تک تو سکون پہونچاؤ اس کے بعد جو تمہارا جی چاہے کرو جہاں چاہو وہاں جاؤ۔ اسی طرح بچے کو اس اس سے محفوظ نہیں رکھا جا سکتا کہ وہ نوکروں کے درمیان رہتے ہوئے ان کے ظلم سے بچا رہے اس کے اندر فکری بلندی پیدا ہو اور وہ زندگی کی اعلیٰ قدروں اور اس کے مقاصد سے واقف ہو سکے

اس سے یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ تو اپنی ماں کے آنے تک انتظار کر۔ یہ تو ایک نہایت بے تکی بات ہو گی۔

اس کے باوجود ہم بربنائے بحث اس کو تسلیم کئے لیتے ہیں کہ وہ اپنے اوقات کو دونوں کاموں کے لئے تقسیم کرے۔ لیکن اس کا نتیجہ کیا ہو گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ اپنے محدود وقت میں اپنی محدود طاقت کے ساتھ جو کام کرے گی وہ لامحالہ مرد سے کم ہو گا اور نقائص سے پُر ہو گا اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ ہم آہنگی ممکن ہی نہیں ہے کیوں کہ اس سے جہاں روحانی قدریں پامال ہونگی وہیں اس سے کوئی مادّی فائدہ بھی نہیں حاصل ہو سکے گا۔

پھر مادّی نقصانات تو برداشت کئے جا سکتے ہیں لیکن اس روحانیت کا کیا ہو گا جو اس کے نتیجہ میں ختم ہو جائے گی کیا کوئی بڑے سے بڑا مادی فائدہ بھی اس کی جگہ لے سکے گا۔ پیچھے جو ہم نے امریکہ کی مصنفہ کے مقالہ کا ایک اقتباس پیش کیا تھا اسی میں آگے وہ مزید کہتی ہیں " اگر ہم سے ظالمانہ طور پر یہ کہا جائے کہ ہم گھر کو چھوڑ دیں اور باہر جا کر کام کریں تو یہ انتہائی لغو اور بے تکی بات ہو گی کیوں کہ کوئی کام بھی اتنی اہمیت کا مستحق نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے خاندانی نظام کا شیرازہ بکھر جائے "۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں کاموں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کا دعویٰ سراسر لغو اور باطل ہے اور اس طرح ان کا یہ دوسرا اعتراض بھی ختم ہو جاتا ہے۔

پھر جب ہم باریک بینی کے ساتھ مرد اور عورت کے کاموں کا جائزہ اس حیثیت سے لیتے ہیں کہ حکومت اور معاشرہ کی ترقی کے لئے کن کی اہمیت زیادہ ہے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ عورت کا کام بڑی اہمیت کا حامل ہے اس کے برعکس مرد کے کام کی اہمیت سے اگرچہ انکار نہیں کیا جا سکتا مگر اسے وہ اہمیت نہیں دی جا سکتی جو عورت کے کاموں کو حاصل ہے۔ عورت اگر مرد کے ساتھ مل کر اس کی کمائی کی حفاظت نہ کرے اس کے بچوں کی تربیت نہ کرے تو اس کے سارے کئے دھرے پر پانی پھر جائے

سوچئے زندگی کے معاملات میں کس کے کاموں کی زیادہ اہمیت ہے؟ کون معاشرہ اور حکومت کی ترقی کے لئے نسبتاً زیادہ کارآمد اور مفید ہے۔ وہ جو بچوں کو شریف اور بااخلاق بناتی اور نسل انسانی کی حفاظت کرتی ہے یا وہ جو صرف پوست کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پھر اس زاویۂ نظر سے بھی غور کیجئے کہ دونوں میں سے کون زندگی کے لئے زیادہ مفید اور کارآمد ہے اور کس کا مقصد ارفع واعلیٰ ہے؟ کس کی زندگی عضو معطل کی حیثیت رکھتی ہے اور کس کی زندگی ہمیشہ سرگرم عمل رہتی ہے؟ حقائق تک پہونچنے کا یہی سیدھا راستہ ہے اور عورت کی اہمیت کا اندازہ لگانے کا واحد ذریعہ بھی یہی ہے۔ جہاں تک اس کا تعلق ہے کہ مرد کا کام ہی سب کچھ ہے اور عورت کا کچھ بھی نہیں تو یہ ایک سطحی فیصلہ ہے جس میں ذرہ برابر بھی وزن نہیں ہے۔ مشہور مفکر برنارڈ شانے اپنے منفرد اور اچھوتے اسلوب میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:۔

"عورت کو جو ذمہ داری سونپی گئی ہے اس سے کوئی قوم مستغنی نہیں ہو سکتی اور نہ ہی اس کا بدل پیش کر سکتی ہے وہ نو مہینے تک حمل کی صعوبتیں برداشت کرتی ہے، پھر اسے جنتی ہے اور اس کی تربیت کرتی ہے اور اسی کی وجہ سے گھر کے انتظام و انصرام میں اپنی ساری قوتیں اور صلاحیتیں لگا دیتی ہے۔ اور اس خدمت پر وہ اس سے کسی معاوضہ کی طلب گار نہیں ہوتی اسی بنا پر احمق اور جاہل قسم کے لوگ اس کے ان کاموں کو "کام" بھی نہیں مانتے اور جب کام کرنے" کا ذکر آتا ہے تو تذکرہ مردوں کا ہوتا ہے حالانکہ مرد کی ساری جانفشانی روزی کمانے کے گرد گھومتی ہے اور اس کی ساری سعی وجہد کا محور تنہا ایک لقمۂ عیش کا حصول ہوتا ہے۔ کچھ لوگ عورتوں کو بھی اسی کام پر لگانا چاہتے ہیں مگر یہ ان کی جہالت وحماقت ہے کیوں کہ یہ عورتوں کا میدان ہے ہی نہیں۔ اس کا اصل میدان تو اس کا گھر ہے اور ازل ہی سے اس کے لئے یہ کام مقدر کر دیا گیا ہے کیوں کہ سوسائٹی کو زندہ رکھنے اور اسے فروغ دینے کے لئے ناگزیر بھی تھا۔ سیکڑوں مرد معمولی کاموں میں اپنی زندگیاں ختم کر دیتے ہیں اور اس کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ اس کے

ذریعہ وہ اپنی عورتوں کی کفالت کرتے ہیں اور اس کے علاوہ ان کے پاس کوئی چارہ نہیں۔ اس کے باوجود وہ مغرور رہوتے ہیں اور حقیقت تک پہونچنے کی کوشش نہیں کرتے ہیں[1]

برنارڈشا کا یہ قول نہایت ٹھوس حقیقت ہے اس کی سچائی سے کسی بھی انصاف پسند کو انکار نہیں ہوسکتا اور ہمارا خیال ہے کہ ان تفصیلات سے ان لوگوں کے فریب کا پردہ اچھی طرح چاک ہوگیا ہوگا جو یہ کہتے ہیں کہ معاشرہ اور حکومت کی ترقی کے لئے عورت کا گھر سے باہر نکل کر کام کرنا ضروری ہے۔

اپنی کفالت آپ

عورتوں کے باہر نکلنے اور اپنی روزی آپ کمانے کے حامیوں کی تیسری دلیل یہ ہے کہ اس کے ذریعہ وہ اپنی کفالت آپ کرسکتی ہے اور دوسروں کے اوپر بوجھ نہیں بنتی۔ پھر جب اس کا کوئی کفیل نہیں ہوتا تو وہ اس کے ذریعہ اپنا پیٹ پالتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا شوہر وفات پاچکا ہو اور اپنے پیچھے ننھے منے بچے چھوڑ جائے جو خود کما نہ سکتے ہوں تو ان کا اور اپنا پیٹ بھرنے کا سب سے باعزت طریقہ یہ ہے کہ وہ ملازمت کرے اور پھر وہ ایک انسان بھی تو ہے جس کی اپنی بھی کچھ ضروریات ہوتی ہیں اور اس کی عزتِ نفس یہ تقاضا کرتی ہے کہ وہ کسی دوسرے کے اوپر بوجھ نہ بنے بلکہ ان ضروریات کی تکمیل خود کرے۔

اس دلیل کا ہم دو پہلوؤں سے جائزہ لیں گے۔

اوّل: اس کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ آیا یہ دلیل ہمارے حالات سے مطابقت رکھتی ہے اور اس کے سہارے عورت گھر سے باہر ملازمت کے لئے نکل سکتی ہے؟ اس پہلو سے جب ہم اس کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے حالات خواہ ان کا تعلق دیہاتی اور پسماندہ

---

[1] مجلہ الہلال، ۱۰ مارچ ۱۹۶۵ء

علاقوں سے ہو یا ماڈرن اور مہذب شہروں سے، دورِ جدید سے ہو یا دورِ قدیم سے کوئی عورت خواہ وہ بیوی ہو یا بیٹی ہو یا ماں وہ اپنے شوہر، باپ یا بیٹے کے زیرِ کفالت رہنے میں کراہیت نہیں محسوس کرتی اس کے برعکس پورا انسانی معاشرہ۔ خواہ اس کا تعلق ماضی سے ہو یا حال سے۔ شاہد ہے کہ عورتیں ان کی نگرانی میں رہنا اپنے لئے باعث عزت و فخر خیال کرتی ہیں اور اگر خدانخواستہ کبھی انھیں ان کی حفاظت سے محروم ہو کر باہر کام کرنے کے لئے نکلنا پڑتا ہے تو وہ اس کو اپنے لئے ایک عظیم مصیبت خیال کرتی ہیں۔

ہم یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مغربی معاشرہ میں عورت کا بلا ملازمت کے رہنا اس کی توہین ہے اور اسے اس کی کرامت اور عزت نفس کے منافی سمجھا جاتا ہے مگر یہ صرف مغرب کا معاملہ ہے عربی اور اسلامی تصورات اس کے بالکل برعکس ہیں ہمارے لئے باعث عزت یہ ہے کہ لڑکی اپنے باپ کی حفاظت میں رہنے اور ان کے یہاں ایک مخصوص عمر تک پہنچنے کے بعد لڑکی کا اپنے باپ کے زیرِ کفالت رہنا اس کی توہین سمجھا جاتا ہے۔ ان دونوں طرح کے حالات کا ہم موازنہ کرنا نہیں چاہتے ہیں کہ ان کے لئے کون قابل ستائش اور عصمت وعفت کی حفاظت کے لئے موزوں ہے اور کون نہیں اور نہ ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس عریانیت اور اباحیت پسندی کے نتیجہ میں ہمارے معاشرہ میں کیسی کیسی برائیاں امنڈ آئی ہیں کیوں کہ یہ ایک الگ موضوع ہے جس پر اظہار خیال کے لئے یہ جگہ نامناسب ہے بہرحال ہماری گذشتہ سطروں سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو گئی ہوگی کہ یہ دعوی کرنا کہ باہر نکل کر عورت کے لئے ملازمت کرنے میں اس کی عزت ہے یہ درست نہیں کیوں کہ یہ ہمارے موجودہ حالات، ماضی کے روایات اور عرف عام کے بالکل خلاف ہے۔

دوم: اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہم دوسروں کے حالات سے سبق لیں اس زاویۂ نظر سے جب ہم کسی ایسے معاشرہ کا جائزہ لیتے ہیں جس میں مادیت پسندی اور زر پرستی رچ بس گئی ہو تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں باپ اور بیٹی کے درمیان بھی فیاضی اور رحم دلی کے رشتے ختم ہو جاتے ہیں خودغرضی

اور نفس پرستی کا دور دورہ ہو جاتا ہے رحمی رشتوں کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی ہر شخص اپنی خواہشات کا غلام بن جاتا ہے۔ ذیل میں ہم اسی کے بعض گوشوں کی طرف اشارہ کریں گے لیکن اس سے ہمارا مقصد مباحثہ اور مناظرہ ہرگز نہیں ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ جس معاشرہ میں عورت کی شرافت کا معیار یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے شوہر اور باپ کی کفالت میں نہ رہے بلکہ اپنی روزی آپ کمائے تو ایسے معاشرہ میں جب تک عورت اپنے وظیفۂ طبعی سے انحراف نہ کرے حمل، ولادت، رضاعت اور گھر کے کاموں کو نہ چھوڑے تب تک وہ اپنی روزی آپ نہیں کما سکتی۔ چنانچہ اسی وجہ سے عورتوں کی ملازمت کا حامی گروہ گھر کے کاموں کو بیکار اور بے حیثیت خیال کرتا ہے۔ لیکن ہم پیچھے بتا چکے ہیں کہ یہ ایک سطحی مطالعہ ہے جس میں حقائق سے چشم پوشی کی گئی ہے۔ چنانچہ ہم نے کہا تھا کہ

"جب ہم باریک بینی کے ساتھ مرد اور عورت کے کاموں کا جائزہ اس حیثیت سے لیتے ہیں کہ حکومت اور معاشرہ کی ترقی کے لئے کن کی اہمیت زیادہ ہے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ عورت کا کام بڑی اہمیت کا حامل ہے اس کے برعکس مرد کے کاموں کی اہمیت سے اگرچہ انکار نہیں کیا جا سکتا مگر پھر بھی اسے وہ اہمیت نہیں دی جا سکتی جو عورت کے کاموں کو حاصل ہے۔"

پھر ہم نے پوچھا تھا کہ: "اس زاویۂ نظر سے غور کیجئے اور پھر بتائیے کہ دونوں میں سے کس کی زندگی زیادہ مفید اور کار آمد ہے اور کس کا مقصد ارفع و اعلیٰ ہے کس کی زندگی عضو معطل کی حیثیت رکھتی ہے اور کس کی زندگی ہمیشہ سرگرم عمل رہتی ہے؟"

پھر اس پر بھی غور کیجئے کہ اگر زندگی کی یہی حیثیت رہ جائے کہ مرد اور عورت دونوں زیادہ سے زیادہ پیسہ کمائیں تو آخر اس بے پناہ دولت کے حصول کا فائدہ کیا ہوگا؟ ذرا سوچئے کیا زندگی کی یہی اہمیت ہے؟ حالانکہ عورت اس سے بہت بلند ہے کہ وہ دو ٹکوں کے عوض اپنا ناموس بیچ دے۔ اگر ایسا ہو تو یہ

انسانیت کا سب سے بڑا گھاٹا ہوگا۔ پھر اگر آدمی صرف "اپنی ترقی" اور اپنی ہی فلاح سے سروکار رکھے اور اپنے علاوہ اسے کسی اور کی پرواہ نہ ہو۔ دوسروں کے لئے ایثار و قربانی کے جذبات اس کے اندر سے بالکل مفقود ہو چکے ہوں تو یہ بھی اس کی پست ذہنی کا ثبوت ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک اخلاقی اقدار کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔

اب اگر کسی کی نظر میں اخلاقی اقدار کی اتنی بھی اہمیت نہ ہو جتنی مادی اقدار کی ہوتی ہے اور وہ انہیں بیکار اور فضول سمجھتا ہو تو یہ انتہائی غلط اور بدترین چیز ہے اور اس کی بنیاد پر کوئی دعویٰ قائم نہیں کیا جا سکتا یہی وجہ ہے کہ اپنے پچھلے اقتباس میں برنارڈ شا نے اس طرح کے دعویٰ کو بالکل خارج از بحث قرار دیا ہے۔

رہی یہ دلیل کہ باہر نکلنے سے عورت کا مقصد یہ ہے کہ وہ جس کی کفالت میں ہے وہ محتاج ہے اور وہ اس کی مدد کرنا چاہتی ہے یا اپنے ننھے منے بچوں کو جن کا کوئی سرپرست نہیں ہے ان کی پرورش کرنا چاہتی ہے۔ تو اس سے دو چیزوں کا پتہ چلتا ہے۔

ایک تو یہ کہ معاشرہ اپنے ضروری فرائض سے بھی غافل ہے اور اپنے اندر کے فقراء مساکین اور کم آمدنی والے لوگوں تک کی ضروریات پوری نہیں کرتا۔

دوسرے یہ کہ عورت کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ اس حد تک ختم ہو گیا ہے کہ اسے اپنے بے سہارہ بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے گھر سے باہر نکل کر ملازمت کرنی پڑتی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر ایسے اسباب پیدا ہی نہ ہوں جس کی وجہ سے عورت کو کسی کی مدد کرنی پڑے یا اپنے بال بچوں کا پیٹ پالنا پڑے تو وہ ملازمت نہیں کرے گی۔ کیونکہ ملازمت تو وہ صرف اس لئے کرتی ہے کہ اسے انسانی ہمدردیاں حاصل نہیں ہوتیں اور معاشرہ اپنے فرائض کی انجام دہی کے سلسلہ میں غفلت برتتا ہے اب اگر یہ دونوں علتیں دور ہو جائیں تو اسے کام کرنے کی ضرورت باقی نہ رہ جائے۔

یہ بات تو واضح ہے کہ ان برائیوں کی جڑ سوسائٹی کا بگاڑ ہے اور اس کا اصل علاج یہ ہے کہ

معاشرہ سے ان برائیوں کو ختم کر دیا جائے اور اپنی جد وجہد کا اصل محور اصلاح معاشرہ کو بنایا جائے کیونکہ برائیوں کے پھوٹنے کا اصل منبع یہی ہے اور یہیں سے ایک لڑکی کو اپنے گھر کی معاشیات کو درست کرنے کے لئے اور ایک بیوہ کو اپنے بچوں کا پیٹ بھرنے کے لئے باہر نکل کر کام کرنے کے لئے مجبور ہونا پڑتا ہے۔

اس طول کلامی کا مقصد یہ ہے کہ اس مرض کا جو علاج تجویز کیا گیا ہے فی الاصل وہ علاج نہیں ہے کیونکہ اس میں ایک برائی کو مضبوط کرنے کے لئے دوسری برائی اختیار کی گئی ہے۔ جو بالکل واضح ہے اور اس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔

اسلام میں ایسی ضرورت مند اور محتاج صورتوں کا بندوبست مسلمانوں کے مشترکہ فنڈ بیت المال سے کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے:

وَفِيٓ أَمْوَٰلِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَٱلْمَحْرُومِ (الذاریات ۱۹)

ان کے مالوں میں سائل اور محروم کا بھی حق ہے۔

علماء نے محروم کی تعریف یہ کی ہے کہ ایسا شخص جو اتنا نہ کما سکے جتنی اس کی ضروریات متقاضی ہیں اور وہ عورت جس کا کوئی کفیل نہ ہو چاہے وہ چھوٹی ہو یا بڑی اس کو بھی بیت المال میں سے حصہ دیا جائے گا کیوں کہ اس کا عورت ہونا ہی اس پر مستلزم ہے کہ وہ اپنی ضروریات کی تکمیل کے لئے ایک سہارے کی محتاج ہے۔ اسی طرح یتیم بچوں کی پرورش کی ذمہ داری بھی امیر وقت پر واجب ہوتی ہے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسے بیت المال سے اس وقت تک حصہ دے جب تک وہ خود کام کرنے کے لائق نہیں ہو جاتا۔ چنانچہ نبی کریمؐ جو اپنے زمانہ کے مسلمانوں کے امیر تھے فرماتے ہیں۔

"ہر وہ شخص جو مومن ہے وہ ہماری مدد کا دنیا اور آخرت میں سب سے زیادہ مستحق ہے۔"

پھر یہ آیت کریمہ بھی پڑھئے:۔

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِہِمْ (احزاب : ٦)

نبی اہل ایمان کے لئے ان کی اپنی ذات پر مقدم ہے

بخاری کی ایک روایت ہے جس میں آپ نے فرمایا :

"جس مسلمان نے مرتے وقت کوئی مال چھوڑا ہو تو وہ اس کے ورثہ کا ہے اور اگر اس نے قرض اور بے سہارا پسماندگان چھوڑے ہوں تو وہ ہماری ذمہ داری ہے۔"

یہ ہے ایک صحت مند اور باکردار معاشرہ کی علامت ۔ پس ضروری ہے کہ اپنے دکھوں کے علاج کے لئے یہاں سے سبق حاصل کیا جائے اور اسی کے خطوط پر عمل پیرا ہوا جائے ۔ ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیئے کہ معاشرہ میں فساد کو باقی رکھا جائے اور پھر مستضعفین کے کندھوں پر اس کا وبال ڈال دیا جائے ۔

عورت ـ چراغ خانہ یا شمع انجمن

عورت کا فطری دائرہ کار

عورت کا فطری دائرہ کار کیا ہے ؟ یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس کا فیصلہ سرسری طور پر کردیا جائے اس کا تعلق فطرت انسانی اور نظام روحانی سے ہے اس لئے اس امر کا فیصلہ کرنے کیلئے ان دونوں کی طرف مراجعت ناگزیر ہے ویسے بھی کسی مسئلہ کا صحیح فیصلہ کرنے کے لئے خواہ اس کا تعلق انسانوں سے ہو یا کسی اور سے ضروری ہے کہ نوامیس فطرت اور اس کی تخلیق کی حکمت کو مدنظر رکھا جائے ۔

اس اصول کو لے کر جب ہم آگے بڑھتے ہیں تو پہلے ہی قدم پر ہمیں ملتا ہے کہ خود اللہ تعالی ہی نے دونوں کو الگ الگ خانوں میں بانٹ دیا ہے چنانچہ فرمایا

وَمَا خَلَقَ الذَّکَرَ وَالْاُنْثٰی (واللیل : ۳)

مرد اور عورت کی تخلیق کی قسم

اس تقسیم سے ظاہر ہے کہ محض تقسیم جنس مراد نہیں ہے اور نہ یہ مراد ہے کہ پروردگار نے ان کو پیدا کر کے تحصیل لذت کے لئے آزاد چھوڑ دیا ہے کیونکہ یہ اللہ کی حکمت کے منافی ہے۔ اس تقسیم کا منشا دراصل اس حکمت اور تخلیقی نظام کی نشاندہی ہے جو خالق کائنات کے پیش نظر رہا ہے اور اس سے وہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ اس کائنات کی تخلیق میں اس نے غایت درجہ کی حکمت ملحوظ رکھی ہے اور اس سے اس کا مقصد ان عظیم الشان مقاصد کو روبعمل لانا ہے جس کے لئے اس نے انسان کو پیدا کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کائنات ایک سوچے سمجھے پلان کے تحت وجود میں لائی گئی ہے۔ اور اس کے اندر عبرت و نصائح کے وہ بیش بہا خزانے موجود ہیں جو دل و دماغ میں روشنی کی شعائیں بکھیرتے ہیں اور دل کے تاریک دروازوں کو منور اور تابناک بنا دیتے ہیں۔ ایک عاقل اور حکیم جب نظام کائنات کی پیچیدگیوں اور اس کے سربستہ رازوں کی کرید کرتا ہے تو اس کے سامنے صانع کائنات کی صفات و کمالات کے ایسے ایسے جلوے اور کرشمے آتے ہیں جو علم و بصیرت سے لبریز ہوتے ہیں اور جنھیں دیکھ کر عقل انسانی خود بخود خالق کائنات کی حقانیت کے اعتراف میں اس کے سامنے سربسجود ہو جاتی ہے۔ اس کے باوجود کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے بہت سے جواہر پاروں کو چھپا رکھا ہے۔ اب بھی اس کی حکمت کے ایسے نادر و نایاب نمونے موجود ہیں جن میں سوچنے والے ذہنوں کے لئے بہت کچھ عبرت و نصیحت کے سامان موجود ہیں اور ان کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ہم خالق کائنات کی معرفت حاصل کر سکیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کائنات کی فطرت ہے کہ یہاں کی ہر چیز کے لئے اپنا ایک الگ مستقل نظام ہے جس میں اس کے لئے وہی وظائف متعین کئے گئے ہیں جو اس کی مخصوص مصلحتوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اور ان کی سب سے بڑی مصلحت یہ ہے کہ وہ وجود باری تعالیٰ کی شہادت دیتے ہیں۔ انسان تمام مخلوقات سے ممتاز کر دیا گیا ہے کیونکہ

ان تمام مصلحتوں کو سمجھنے کا اسے خاص ملکہ عطا کیا گیا ہے چنانچہ انسان بھی اپنے اندر تمام مخلوقات کی طرح جہاں عبرت وبصیرت کا خزانہ رکھتا ہے وہیں اس کے اندر چند منفرد خصوصیات بھی ہیں جو قدرت نے اسے عطا کی ہیں تاکہ وہ شراب معرفت کی جام کو اچھی طرح پی سکے اور یہی وجہ ہے جس کی بنا پر کائنات میں موجود تمام مخلوقات سے چھانٹ کر اسے وحی اور رسالت کی نعمتوں سے سرفراز کیا گیا۔

ان حقائق کی روشنی میں ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تخلیق میں مرد اور عورت کی جو تقسیم کی ہے وہ جہاں مرد اور عورت کی تقسیم پر متضمن ہے وہیں وہ ان روحانی اور جسمانی مقاصد کے نشاندہی بھی کرتا ہے جو اس کی زندگی کو پاکیزگی بخشتے اور اسے خالق تک پہونچاتے ہیں یہی اس کا حکمت وجود ہے اور اسی کا تقاضا تھا کہ اللہ تعالیٰ انھیں جنسوں میں تقسیم کرتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ نوامیس وظائف بذات خود مقدس نہیں ہیں انھیں تقدس اس لئے حاصل ہے کیونکہ یہ خالق تک پہونچنے کا وسیلہ اور ذریعہ ہیں۔

چونکہ یہ نوامیس کائنات بذات خود مستحسن نہیں ہیں۔ ان میں استحسان کا پہلو اس لئے ہے کیوں کہ یہ خالق تک پہونچاتے ہیں اس لئے تنہا انسان ہی کو وہ صلاحیتیں بخشی گئی ہیں جن کے ذریعہ وہ یہ سچی معرفت حاصل کرتا ہے اور حقیقی معرفت ہی بندوں کو حق سے ہمکنار کرتی ہے پس انسان کا پورا وجود — جسمانی اور روحانی دونوں۔ صرف اس لئے ہے تاکہ وہ اللہ کی معرفت حاصل کرے اور اس کی عبادت کرے جو اسی معرفت کا لازمی نتیجہ ہے، اسی کی طرف خالق کائنات نے اس آیت میں اشارہ کیا ہے

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (الذاریات: ۵۶)

میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں

اس لئے کسی مسئلہ میں خواہ اس کا تعلق عورتوں کے حقوق سے ہو یا اس کے علاوہ کسی اور چیز سے ضروری ہے کہ اس کی حقیقت، حکمت وجود، روحانی حیثیت اور کائنات میں اس کے

مقام و مرتبہ کو مدنظر رکھا جائے یہی صحیح طریقہ کار ہے اس کے علاوہ جتنے طریقے ہیں غلط اور گمراہ کن ہیں۔

کمائی سے عورت کی معذوری کا مفہوم

گذشتہ بحث کا اگر تجزیہ کیا جائے تو اس کا خلاصہ یہی نکلے گا کہ عورت اور مرد کے مسائل کو حل کرنے کے لئے نوامیس فطرت کو مدنظر رکھنا ضروری ہے اس پر خود اس کی فطرت اس کی روحانی اور جسمانی خصوصیات اور اس کا حکمت وجود شاہد ہے اور جب ہم ان قوانین کا لحاظ کر کے کوئی فیصلہ کریں گے تب ہی وہ صحیح معنوں میں اپنے مقصد تخلیق کو حاصل کر سکیں گے۔ اس لئے اب یہ کہنا تحصیل حاصل ہے کہ عورت قدرتی طور پر جن کاموں کے لئے موزوں ہے وہ حمل، وضع حمل، رضاعت اولاد کی تربیت، گھر سے متعلق امور کی نگہداشت جیسے کام ہیں اور مرد کو افراد خاندان کے لئے کمانے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔

عورت اور مرد دونوں فطری طور پر اس سے معذور ہیں کہ وہ دونوں یا ان میں سے کوئی ایک اپنے قدرتی فرائض سے روگردانی کرے اور ایک دوسرے کے حدود میں دراندازی کی کوشش کرے اور اس دراندازی کا مطلب یہ ہے کہ قدرت نے ان دونوں کے لئے جو وظائف حیات متعین کئے ہیں اس میں خلل واقع ہو اس کی مثال بالکل ایسی ہی ہے کہ جذب و کشش کا قانون لاگو کر کے یہ توقع رکھی جائے کہ وہ اشیاء کو اپنی جگہ پر برقرار رکھے گا یا کسی جمے ہوئے برف کے تودہ سے یہ توقع کی جائے کہ اس کے اندر مقناطیسی خصوصیت پیدا ہو جائے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ ناممکنات میں سے ہے کیوں کہ ہر چیز کی اپنی مخصوص صلاحیتیں اور خصوصیتیں ہوتی ہیں جن سے نکلنا اس کے لئے ناممکن ہوتا ہے وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا۔

اس لئے رجولیت کی یہ خوبی نہیں ہے کہ وہ انوثت کی ذمہ داری سنبھالے اور نہ یہ انوثت کا کوئی کمال ہے کہ وہ رجولیت کے فرائض کو اپنے سر لے۔ اسی معنی میں ہم نے پیچھے کہا ہے کہ اسلامی نظام میں عورت کا عورت ہونا ہی اس بات کے لئے کافی ہے کہ وہ کمانے کی ذمہ داریوں سے عاجز ہے

کیوں کہ اسلام نے ذمہ داریوں کی تقسیم میں دونوں کی فطرت کا خیال رکھا ہے اور دونوں کو ایک دوسرے کی ذمہ داریوں کی انجام دہی کے لئے عاجز قرار دیا ہے۔

چنانچہ قوانین زوجیت اور امومت خالص روحانی قوانین ہیں جن کی بنیاد زندگی کی مقدس ترین قدروں پر رکھی گئی ہے لیکن اس کے باوجود دونوں کو صفت کسب سے عاجز رکھا گیا ہے۔

عورت کا پستان جو بچہ کو غذا فراہم کرتا ہے اور رحم جس میں وہ ایک متعین مدت تک با حفاظت رہتا ہے یہ دونوں زندگی کی تعمیر میں کتنا اہم رول ادا کرتے ہیں اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا اور اسی عظیم ذمہ داری کی بنا پر قدرت نے عورت کو کسب معیشت کی ذمہ داری سے مستثنیٰ کر دیا ہے اور یہی اس کے عجز کی علامت ہے۔

پھر قدرت نے عورت کو شفقت و محبت اور نرمی و دلسوزی کے ان لطیف احسا ے سے مالا مال کیا ہے جو قوانین زوجیت و مادریت کو روبعمل لانے کے لئے ناگزیر تھے۔ ایک بیوی اپنے شوہر کو اور ایک ماں اپنے بچہ کو خوش کرنے کے لئے کیا کیا جتن نہیں کرتی۔ ان کے لئے طرح طرح کی مشقتیں اور پریشانیاں برداشت کرتی ہے اور خود ایثار و قربانی کا زندہ نمونہ ہوتی ہے اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ اپنے بچہ کے پیچھے سارے غم و تکلیف اور آرام و آرائش کو فراموش کر دیتی ہے۔

عورت جب اپنے لطیف جذبات اور نازک احساسات کے ساتھ مرد کے طاقتور جسم کو دیکھتی ہے تو اس کا وجدان فرحت و مسرت کے بے پایاں جذبات سے مچلنے لگتا ہے۔ اور یہ قوامیت خود عورت کے نفس کا اقرار اور اس کے دل کی پکار ہے۔ بالکل یہی حالت مرد کی بھی ہے عورت کی ذات اس کے لئے سکون و اطمینان کا موجب ہوتی ہے اور اس کی عدم موجودگی میں اسے پوری کائنات بے رنگ اور بے نور سی محسوس ہوتی ہے۔ مرد کی طاقت و توانائی اپنی جگہ مسلم اور اس کی امتیازی خصوصیات بھی سر آنکھوں پر مگر عورت کا وجود اس کی شخصیت کے لئے وہ غذا فراہم کرتا ہے جس سے اس کے اندر خود اعتمادی

پروان چڑھتی ہے اور اس کے دل میں نئے امنگ اور نئی ترنگ پیدا ہوتی ہے۔

اور یہ سب وہی چیزیں ہیں جن کے لئے قرآن نے ایک جامع لفظ "سکون" استعمال کیا۔ یہ سب اسی کے ثمرات و نتائج ہیں جن کے ذریعہ نفس کی طہارت، خاندانی نظام کا استحکام اور معاشرہ میں تقدس پیدا ہوتا ہے اور اسی کے ذریعہ زندگی میں وہ انفرادیت پیدا ہوتی ہے جو کسی اور چیز سے پیدا نہیں ہو سکتی ان تمام فوائد کے باوجود۔ اگر ہم یہ چاہیں کہ اس کے اوپر کسب معاش کی ذمہ داریاں بھی لاد دیں تو قدرت نے اسے اس سے عاجز رکھا ہے۔

قدرت کی جانب سے عورت کو علم و عقل کا صرف اسی قدر حصہ ملا ہے جس کے ذریعہ وہ اپنی ذات، اپنے فرائض اور زندگی میں اپنی حیثیت و اہمیت کو سمجھ سکے اور انھیں نباہ سکے اور اس کا یہ حصہ اس کے لئے کچھ کم نہیں ہے کیوں کہ عام طور پر اس کے اوپر جو ذمہ داری ڈالی گئی ہے اس کے لئے اتنا ہی بہت تھا۔ رہا مرد کی غیر معمولی صلاحیتوں سے اس کا مقابلہ تو فطرتاً ان دونوں کا کوئی مقابلہ نہیں کیوں کہ خوبیوں اور صلاحیتوں کی تقسیم میں قدرت کا یہ قانون ہے کہ وہ ہر ایک کو اس کے فرائض کی نسبت سے صلاحیتیں اور قابلیتیں بھی عطا کرتا ہے اور چونکہ اس نے عورت کو نازک خیالات اور لطیف جذبات سے مالا مال کیا ہے اس لئے بالکل ضرورت نہیں تھی کہ وہ اسے مرد کی طرح طاقتور اور جنگجو بھی بناتا کیوں کہ اس سے "سکون" اور "قوامیت" کے قوانین ختم ہو جاتے۔ جہاں ذہنی قوت کا تعلق ہے تو چونکہ اس سے نازک جذبات کو کوئی خطرہ نہیں تھا اور دونوں کو مختلف ضروریات کے لئے یکساں طور پر اس کی ضرورت بھی اس لئے مشترک طور پر یہ صلاحیت دونوں کو عطا کی گئی لطیف احساسات اور نازک جذبات سے دونوں کو نوازا گیا لیکن اس میں بھی مرد کو عورت سے کم حصہ ملا کیوں کہ یہ اس کا کچھ زیادہ محتاج نہ تھا اس کے برعکس عقل کے دوسرے میدانوں میں عورت کو مرد کے مقابلہ میں کم حصہ ملا کیوں کہ اس کو بھی اس کی کچھ زیادہ ضرورت نہ تھی اور اسے اس میں سے صرف اسی قدر حصہ ملا جس سے وہ اپنے فرائض و واجبات کو سمجھ سکے اور

اس سے جسمانی وروحانی فوائد حاصل کرسکے۔

اس پر اگر کوئی یہ کہے کہ مرد کو جس قدر جذبات واحساسات کی لطافتوں اور نزاکتوں سے نوازا گیا ہے اگر وہ چاہے تو اس سے کام لے کر سکون وقوامیت کے قوانین کو ردوبدل لا سکتا ہے۔ اسی طرح عورت کا معاملہ بھی ہے کہ اگر وہ چاہے تو عقل سے جس قدر حصہ ملا ہے اس سے کام لے کر مرد کی طرح وہ بھی کسب معیشت کی ذمہ داریاں سنبھال سکتی ہے۔ تو یہ ایک غلط بات ہوگی کیوں کہ اس سے مرد کی دوسری اور بہت سی صلاحیتیں ختم ہوجائیں گی جو اس کی مردانگی کا طرۂ امتیاز ہیں اور وہ اپنی فطری ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوجائے گا۔ اور یہی حال عورت کا بھی ہوگا اس کے اندر سے بھی اس کی نسوانی قابلیتیں ختم ہوجائیں گی اور اپنے فرائض کو وہ بھول جائے گی۔ حالانکہ انسانیت کی ترقی اسی وقت ہوسکتی ہے جب دونوں اپنے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے ایک دوسرے کا تعاون کریں لیکن اگر یہ بجائے تعاون کرنے کے ایک دوسرے کی ذمہ داریوں کو سنبھالنے میں لگ جائیں تو یہ انسانی فطرت کے خلاف ہے اور اس سے معاشرے میں فساد پھیلے گا اور یہ سب اس بات کا نتیجہ ہوگا کہ دونوں نے اپنے فطری قوانین کو بھلا دیا تھا اور ایک دوسرے کے حدود میں دخل دینے لگے تھے۔ اس لئے اگر مرد عورتوں کے کام میں دخل دیتے ہیں تو نظری اعتبار سے یہ ان کا عجز ہے اور اگر عورتیں مردوں کے حدود میں مداخلت کرتی ہیں تو یہ ان کا عجز ہے۔ اسلام کی نظر میں عجز کا یہی مفہوم ہے اور اسی کو پیش نظر رکھ کر اس نے قوانین مرتب کئے ہیں۔

پھر عورت کے ساتھ ایسے طبعی عوارض بھی لگے ہوئے ہیں جو عورت کو کسب معیشت کی ذمہ داری سے عاجز قرار دیتے ہیں۔ ان عوارض سے ہماری مراد حیض ونفاس اور حمل وولادت ہے اس کی تفصیل میں ہم چاہتے ہیں کہ ان تمام حقائق کو پیش کردیں جو آج ہم تمام لوگوں کے لئے معلوم ومعروف کی حیثیت رکھتی ہیں چنانچہ علم طب کا بہت بڑا حصہ ان ادوار کے لوازم واحتیاط اور قوانین صحت کے متعلق

مباحث سے تعلق رکھتا ہے اوران میں سے ہرایک دور کے خاص آثار وعلامات ہیں اور ہر علامت کے زمانہ میں خاص خاص احتیاطیں اور حفاظتیں ضروری ہیں۔

ہم ذیل میں اس دور کے عظیم محقق مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تحقیقات کا خلاصہ پیش کرتے ہیں مولانا اپنی کتاب پردہ میں تحریر فرماتے ہیں :۔

علم الحیات BIOLOGY کی تحقیقات سے ثابت ہوچکا ہے کہ عورت اپنی شکل وصورت اور ظاہری اعضاء سے لے کر اپنے جسم کے ذرات اور نسیجی خلایا تک ہر چیز میں مرد سے مختلف ہے۔ جس وقت رحم میں بچے کے اندر صنفی تشکیل (SEX FORMATION) واقع ہوتی ہے اس وقت سے دونوں صنفوں کی جسمانی ساخت بالکل ایک دوسرے سے مختلف صورت میں ترقی کرتی ہے۔

بالغ ہونے پر ایام ماہواری کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جس کے اثر سے اس کے جسم کے تمام اعضاء کی فعلیت متاثر ہوتی ہے اکابرین حیاتیات وعضویات کے مشاہدات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایام ماہواری میں عورت کے اندر حسب ذیل تغیرات ہوتے ہیں۔

۱۔ جسم میں حرارت کو روکنے کی قوت کم ہوجاتی ہے اس لئے حرارت زیادہ خارج ہوتی ہے اور درجۂ حرارت گرجاتا ہے۔

۲۔ نبض سست ہوجاتی ہے خون کا دباؤ کم ہوجاتا ہے۔ خلایائے دم کی تعداد میں فرق واقع ہوجاتا ہے۔

۳۔ دروں افرازی غدود ENDOCRINES گلے کی گلٹیوں TONSILS اور غدود المفاوی میں تغیر واقع ہوجاتا ہے۔

۴۔ ہضم میں اختلال واقع ہوتا ہے اور تنفس کی قابلیت کمزور پڑجاتی ہے۔

۵۔ عضلات میں سستی اور احساسات میں بلادت آجاتی ہے۔ ذہانت اور خیالات کو مرکوز کرنے

کی طاقت کم ہو جاتی ہے۔

یہ تغیرات ایک تندرست عورت کو بیماری کی حالت سے اس قدر قریب کر دیتے ہیں کہ در حقیقت اس وقت صحت اور مرض کے درمیان کوئی خط کھینچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر امیل نووک جو اس شعبہ علم کا بڑا محقق ہے لکھتا ہے:

"حائضہ عورتوں میں عموماً جو کیفیات پائی جاتی ہیں وہ یہ ہیں۔ درد سر، تکان، اعضا شکنی، اعصابی کمزوری، طبیعت کی پستی، مثانہ کی بے چینی، ہضم کی خرابی، بعض حالات میں قبض کبھی کبھی متلی اور قے۔"

پھر اس نے اپنے قول کی تائید میں بعض محقق علماء اور ڈاکٹروں کے حوالے بھی نقل کئے ہیں اور اس پوری تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں عورت کام کاج سے بالکل معذور ہوتی ہے۔

مولانا آگے فرماتے ہیں:

ایام ماہواری سے بڑھ کر حمل کا زمانہ عورت پر سخت ہوتا ہے ڈاکٹر ریپریف REPREV لکھتا ہے۔

"حمل کے زمانہ میں عورت کے قویٰ کسی طرح بھی جسمانی اور دماغی محنت کا وہ بار نہیں سنبھال سکتے جو حمل کے ماسوا دوسرے ایام میں سنبھال سکتے ہیں۔ جو حالات اس زمانہ میں عورت پر گذرتے ہیں اگر مرد پر گذریں یا غیر زمانۂ حمل میں خود عورت پر گذریں تو قطعی بیماری کا حکم لگا دیا جائے اس زمانہ میں کئی مہینہ تک اس کا نظام عصبی مختل رہتا ہے اس کا دماغی توازن بگڑ جاتا ہے اس کے تمام عناصر روحی ایک مسلسل بدنظمی کی حالت میں ہوتے ہیں۔"

پھر اس کی تائید میں اس نے متعدد ماہرین کے اقوال نقل کئے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قدرتی طور پر عورت اس زمانہ میں اس قابل نہیں رہتی کہ اس سے کوئی جسمانی یا دماغی محنت لی جائے۔

پھر وضع حمل کے بعد عورت کے حالات سے بحث کرتے ہوئے آگے تحریر فرماتے ہیں کہ:

وضع حمل کے بعد متعدد بیماریوں کے رونما ہونے اور ترقی کرنے کا اندیشہ رہتا ہے زچگی کے

زخم زہریلے اثرات قبول کرنے کے لئے مستعد رہتے ہیں قبل حمل کی حالت پر واپس جانے کے لئے اعضاء میں ایک حرکت شروع ہو جاتی ہے جو سارے نظام جسمانی کو درہم برہم کر دیتی ہے۔ اگر کوئی خطرہ نہ بھی پیش آئے تب بھی اس کو اپنی اصل حالت پر آنے میں کئی ہفتے لگ جاتے ہیں اس طرح استقرار حمل کے بعد سے پورے ایک سال تک عورت درحقیقت بیمار یا کم از کم نیم بیمار ہوتی ہے اور اس کی قوتِ کارکردگی عام حالات کی بہ نسبت آدھی بلکہ آدھی سے بھی کم رہ جاتی ہے[1]:

طب اور سائنس کی ان شہادتوں سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ حیض و نفاس اور حمل و ولادت کے ادوار میں عورت کے جسم و جان اور دل و دماغ کی کیا حالت ہوتی ہے۔ اب اس میں کسی ادنیٰ اختلاف کی بھی گنجائش نہیں رہ جاتی یہ تمام آثار و قرائن اس بات کے لئے ناقابل تردید شہادتیں ہیں کہ اسلام نے عورت کو کسب معیشت کی جس ذمہ داری سے عاجز قرار دیا ہے وہ دراصل اس کی فطرت کا اقتضاء ہے۔

ان تفصیلات سے عورت کے عجز کے تین مخصوص عوامل سامنے آتے ہیں:

ا۔ نسوانی خصوصیات۔ مثلاً قوانین زوجیت و مادریت اور جذبات و خیالات کی نزاکت و لطافت اس نوعیت کے ہیں جو کسب معیشت کی ذمہ داری سنبھالنے سے قاصر ہیں۔

۲۔ اسے علم و عقل میں سے صرف اسی قدر حصہ ملا ہے، جس کے ذریعہ وہ اپنے آپ کو اپنے فرائض کو اور اپنے وظائف حیات کو اچھی طرح سمجھ سکتی ہے اور ان کو روبعمل لانے کے لئے بہتر تدابیر کر سکتی ہے۔ جہاں تک مرد کا تعلق ہے تو قدرت نے اسے علم و عقل کی بے پایاں صلاحیتوں سے مالا مال کیا ہے اس لئے قدرتی طور پر اسی کو باہر کے معاملات کا مدبر و منتظم بھی بنایا گیا ہے۔

---

[1] پردہ ص ۱۳۹ تا ص ۱۴۱

۳۔ عورت کو حیض و نفاس اور حمل و ولادت کے زمانہ میں ایسے حالات سے سابقہ پیش آتا ہے جو اس کی ذہنی، جسمانی اور فکری صلاحیتوں کو توڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ اس کی دلیل کے طور پر ہم پیچھے بہت سے ماہرین اور محققین کی شہادتیں پیش کر آئے ہیں۔

موجودہ زمانہ نے ان حقائق کی عملی طور پر تصدیق بھی کر دی ہے چنانچہ فی زمانہ کوئی بھی کام جسے عورت اپنے فطری دائرہ کار سے ہٹ کر انجام دے رہی ہے اس میں وہ مرد سے پیچھے ہے۔ الاستاذ عقاد اسی سلسلہ میں رقم طراز ہیں۔

"معلوم زمانہ کی تاریخ میں جب سے پکے ہوئے کھانے کا رواج ہوا ہے اس وقت سے یہ ذمہ داری عورت کی رہی ہے کہ وہ گھر والوں کے لئے کھانا بنایا کرتی تھی۔ اس کی تعلیم اسے بچپن ہی سے دی جاتی تھی چاہے اس کا تعلق ترقی یافتہ قوموں سے رہا ہو یا پسماندہ قبیلوں سے وہ فطرتاً اسی کام کو پسند کرتی تھی۔ اور آج ہزار ہا سال کے بعد بھی جب کہ ہم صنعتی اعتبار سے اس قدر ترقی یافتہ ہو چکے ہیں وہ مرد کے برابر نہیں پہونچ سکی ہے مرد جن کاموں کو چند سالوں میں سیکھ لیتا ہے اسے سیکھنے میں اسے بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور پھر بھی اس کے اندر خود اعتمادی پیدا نہیں ہو پاتی ہے۔۔ مثال کے طور پر قدیم زمانہ سے عورتوں کو سلائی اور کڑھائی کے کام سکھائے جاتے تھے اور آج تک اس کا رواج چلا آ رہا ہے لیکن اس کے فیشن اور گل بوٹوں کے سلسلہ میں مرد ہی پر بھروسہ کرتی ہے اسے اپنے اوپر اعتماد نہیں ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اسے سیکھنے کے لئے وہ انھیں اداروں کو ترجیح دیتی ہیں جن کے ذمہ دار مرد ہوں اور ان اداروں میں کم ہی داخل ہوتی ہیں جن کی ذمہ دار عورتیں ہوں[۱]۔"

پھر اس کے بعد استاذ عقاد نے چند صنعتی امور کا تذکرہ کر کے ثابت کیا ہے کہ اگرچہ زمانۂ قدیم

---

[۱] المرأۃ والقانون ص ۶، ۹، ۱۰

سے عورتوں کا یہی پیشہ رہا ہے مگر مرد نے جب یہ کام کرنا شروع کیا تو باوجود اس کے کہ وہ اس میدان میں نیا تھا مگر وہ ان معاملات میں بھی ان سے بازی لے گیا۔

خود ہم سے دو ڈاکٹروں نے جن میں سے ایک کسی طبی شعبہ کا ہیڈ بھی رہ چکا تھا بتایا کہ لیڈی ڈاکٹر کی بہ نسبت مرد ڈاکٹر کے نسوانی امراض کے علاج کے لئے بہت موزوں خیال کی جاتی تھی چنانچہ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ چونکہ بلاد عربیہ اسلامیہ میں لیڈیز ڈاکٹر کی کثرت ہو رہی ہے اس لئے امراض نسواں کے علاج کے لئے وہ خود ہی کام کریں گی اور مرد ڈاکٹروں کو اس پریشانی سے چھٹی مل جائے گی لیکن تجربہ نے یہ ثابت کر دیا کہ یہ قیاس صحیح نہیں تھا اور ابھی اس شعبہ میں مرد ڈاکٹروں کی احتیاج باقی ہے۔

اسی طرح مشہور مفکر الاستاذ محمد ذکی عبد القادری الصحفی فرماتے ہیں:۔

"وہ دن دور نہیں جب عورت معاملات حکومت میں بھی ٹھپ ہو کر رہ جائے گی۔ جیسے کہ وہ کام کے دوسرے میدان مثلاً انجینئرنگ، طب، وکالت، تجارت اور زراعت کے شعبوں میں ٹھپ ہو کر رہ گئی ہے۔ کیوں کہ ان پیشوں میں محنت و جانفشانی اور صلاحیت کی جتنی مقدار کی ضرورت ہوتی ہے حکومت کے میدان میں اس سے کہیں زیادہ اگلی ضرورت ہوتی ہے پھر جب وہ ان میدانوں میں نہیں چل سکتی تو اس میں کسی بڑی ترقی کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے اور اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ فطرتاً دوسرے کام کے لئے پیدا کی گئی ہے اور اس کے مطابق اسے صلاحیتیں اور قوتیں بھی دی گئی ہیں[1]۔

۳۔ عورتوں کے تمدنی مشاغل اور اسلام

عورتوں کے مشاغل پر بحث کرتے ہوئے دو چیزوں کا لحاظ نہایت ضروری ہے۔ فطری

[1] الاستاذ محمد ذکی کے جریدہ اخبار الیوم کے ادارتی نوٹ "نحو النور" سے ایک اقتباس

اور شرعی دونوں نقطۂ نظر سے ذہن میں اس کا استحضار ہونا چاہئے۔

۱۔ مشاغل میں انہماک فی نفسہٖ مشروع ہے اور اس کی حرمت کا اس وقت تک حکم نہیں لگایا جاسکتا جب تک اس میں معصیت کا کوئی پہلو نہ ہو۔ آغاز تاریخ سے لے کر آج تک کوئی ایسا دور نہیں گذرا جب اس نے اپنے "مخصوص کاموں" کو چھوڑ کر دوسرے کام نہ کئے ہوں ہاں یہ بات ضرور تھی کہ اس نے ان کاموں کو اولین اہمیت کبھی نہیں دی لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ وہ ہر دور میں کھانے پکانے۔ سلائی کڑھائی کرنے، سوت کاتنے اور کشیدہ کاری وغیرہ جیسے کاموں میں حصہ لیتی رہی ہے اس کے ساتھ وہ بال بچوں کی نگرانی شوہر کی خدمت اور اس طرح کے دوسرے کام جو اس کے فطری وظائف میں شامل تھے اس کو بھی انجام دیتی رہی ہے۔

یہ سب کام اس نے اپنے وجدانی اور روحانی فطرت سے مجبور ہو کر انجام دیئے کسی نے اس کے اوپر کوئی جبر یا پابندی عائد نہیں کی چنانچہ وہ اسی روحانی احساس کے تحت اپنے بچہ کو مختلف عوارض سے بچانے کے لئے کپڑوں اور بستروں کا انتظام کرتی ہے اپنے شوہر کے ساتھ نرمی اور مہربانی کا ایسا رویہ اختیار کرتی ہے جس میں تاثیر و محبت کا عجیب امتزاج ہوتا ہے۔ یہ تمام کام گرچہ رضاعت اور سکن کی طرح اس کے بنیادی فرائض میں شامل نہیں ہے مگر یہ انھیں بھی دل کے پورے خلوص اور جذبات کی پوری شدت کے ساتھ انجام دیتی ہے۔

اسلام نے کاموں کی تقسیم کے سلسلہ میں اسی چیز کو پیش نظر رکھا ہے جو انسانی فطرت سے ہم آہنگ ہے۔ چنانچہ حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ نے جب اپنے اپنے کاموں کی بابت دریافت کیا تو آپ نے حضرت علی کو باہر کی ذمہ داری اور حضرت فاطمہ کو گھر کی ذمہ داری سونپی۔

اسلام نے اس سلسلہ میں اس حکمت کو ملحوظ رکھا ہے کہ گھر میں رہ کر اپنے بچوں اور شوہر کی خدمت اس کی اپنی فطری اور وجدانی پکار ہے جو اس کے بنیادی وظائف سے ٹکراتی نہیں ہے بلکہ

ان کے درمیان ربط و تعلق کو اور مضبوط بنا دیتی ہے۔

پھر اگر وہ مذکورہ کاموں میں سے کسی کام میں مہارت رکھتی ہے اور سمجھتی ہے کہ وہ گھر میں رہ کر ان کاموں میں سے کسی کام کو کر سکتی ہے اور اس سے کچھ آمدنی پیدا کر سکتی ہے تو شوہر کی جانب سے اسے اس کی آزادی ہونی چاہئے مگر یہ نہ ہو کہ وہ اپنا سارا وقت اور ذہن و فکر کی تمام صلاحیت اسی کام میں لگا دے اور اپنے فطری وظائف سے غفلت برتنے لگے۔

چونکہ ہر لڑکی کو ایک نہ ایک دن کسی کی بیوی بننا ہے اس لئے اسلام نے اس کا یہ حق مقرر کیا ہے کہ وہ اپنی اصل ذمہ داریوں کو اچھی طرح سمجھے اور گھر اور خاندان کے ان تمام مسائل سے واقفیت حاصل کرے جن سے آگے چل کر اسے نمٹنا ہے اس کی تعلیم اسے اس طرح حاصل کرنی چاہئے کہ وہ زمانہ حال کے تقاضوں کو پورا کر سکے اور ساتھ ہی ساتھ آنے والے زمانہ کے مسائل سے بھی آگاہ رہے۔

۲۔ فطرت نے چونکہ عورت کو عورت ہی بنایا ہے اس لئے اس کا یہ کام کسی غلطی اور شک پر مبنی نہیں ہو سکتا بلکہ اس کی تخلیق اس نے ان مقاصد اور مصلحتوں کو روبعمل لانے کے لئے کی ہے جن کو وہ پہلے مقرر کر چکی ہے۔ گھر عورت کا فطری مقام ہے جہاں پر رہ کر وہ اپنے نسوانی فرائض سے عہدہ برآ ہو سکتی ہے اور ان مقاصد کو روبعمل لا سکتی ہے جن کے لئے اس کی تخلیق کی گئی ہے اسی جگہ رہ کر ہی وہ ان فتنوں سے نجات پا سکتی ہے جو اس کے ارد گرد لگے ہوئے ہیں پھر ایسے حالات اس کو وہیں رہ کر میسر آ سکتے ہیں جس سے اسے ذہنی اور نفسی سکون حاصل ہو اور اپنے فرائض کو بحسن و خوبی انجام دے سکے۔

چنانچہ فطرت کی اسی شہادت کو اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے۔

لَا تُخْرِجُوهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ (الطلاق: ۱)

نہ تم انھیں ان کے گھروں سے نکالو اور نہ وہ خود نکلیں

امام قرطبی اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"شوہر کو بیوی کے مسکن سے بے دخل کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے اور نہ خود اس کے لئے یہ جائز ہے کہ بغیر کسی خاص ضرورت کے وہ اپنے مقام سے باہر نکلے"۔[1]

معروف بات یہ ہے کہ یہ آیت دراصل اس عورت کے سلسلے میں نازل ہوئی ہے جو عدت کے ایام گذار رہی ہو مگر فی الواقع اس کا حکم عام بیویوں کے معاملہ میں لاگو ہوگا۔ ابن عربی کہتے ہیں کہ امام مالکؒ نے فرمایا "عدت گذارنے والی عورت اپنے گھر سے کبھی باہر نہیں نکلے گی۔ مگر بہ سبب اس ضرورت کے جو واقعی اسے لاحق ہو اور اس کا یہ نکلنا بالکل اسی طرح ہوگا جس طرح شادی شدہ عورتوں کا ہوتا ہے کیوں کہ عدت بھی شادی کی ایک شاخ ہے"۔[2]

فقہ و تفسیر کے ماہرین کا یہ خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اقوال میں ضمیر کی اضافت عورتوں کی طرف کی ہے مثال کے طور پر لَا تُخْرِجُوهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ (طلاق)

یا اسی طرح اس قول میں وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ یا اسی طرح وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ میں۔ تو ان تمام آیات میں ضمیر کی اضافت عورتوں کی طرف کی گئی ہے باوجود اس کے کہ یہ معلوم ہے کہ گھر ان کا نہیں بلکہ ان کے شوہروں کا ہے۔ علماء نے اس سے یہ استنباط کیا ہے کہ یہاں اضافت اضافتِ تملیک نہیں ہے بلکہ اضافت "اسکان" ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ عورت کو اپنی ساری زندگی اسی گھر میں گذارنی ہوتی ہے یہاں تک کہ اسے بغیر ضرورت کے وہاں سے قدم باہر رکھنے کی اجازت نہیں ہوتی اس لئے اسی کی طرف اضافت بھی کر دی گئی ہے چنانچہ اسکان کا مطلب یہاں "لزوم اقامت" ہے۔[3]

---

[1] الجامع لاحکام القرآن للقرطبی جلد ۱۸ ص ۱۵ [2] احکام القرآن لابن عربی جلد ۲ ص ۲۶ [3] احکام القرآن للجصاص

علامہ کاسانیؒ اس آیت سے احکام مستنبط کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اِسْکِنُوْھُنَّ کا مطلب یہ ہے کہ شادی کے بعد عورت کا گھر سے نکلنا ممنوع ہے اور وہ اس لئے کہ آیت کریمہ میں امر کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے جس کا مطلب اس کا حکم دینا ہے اس لئے آپ سے آپ یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس کے خلاف کام سے منع کیا جا رہا ہے۔ آگے آیت کے دوسرے ٹکڑے لَا تُخْرِجُوْھُنَّ مِنْ بُیُوْتِہِنَّ سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں "اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اگر اسے خروج سے منع نہ کیا تو اس سے قانون سکن و نسب میں اختلال واقع ہو جاتا۔"[1]

اس سے ثابت ہوا کہ عورت کا گھر میں رہنا فطرت اور شریعت دونوں کا تقاضا ہے اور تمدن کی تعمیر کا یہی سنگ بنیاد ہے البتہ ضرورتوں کے تحت اسے باہر نکلنے کی بھی آزادی ہے مگر یہ اصل نہیں فرع ہے، حکیم امت رسول اکرم ؐ نے اسی حقیقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ بات فرمائی تھی کہ

لا تمنعوا النساء کم المساجد وبیوتھن خیر لھن (ابوداؤد)

(اپنی عورتوں کو مسجدوں سے نہ روکو مگر ان کے گھر ان کے لئے زیادہ بہتر ہیں)

چونکہ اللہ کی عبادت انسان کی حکمت وجود اور اس کی بلند ترین غایت ہے اس لئے شرع نے عورت کو اس کی اجازت دی ہے کہ وہ نماز کے لئے مسجد میں آسکتی ہے مگر پھر یہ بھی کہہ دیا کہ اس کے گھر کی نماز مسجد کی نماز سے بہتر ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ گھر کو مسجد سے افضل درجہ دے دیا گیا ہے کیونکہ دوسری احادیث میں صاف صاف مذکور ہے کہ دنیا کی سب سے بہتر جگہ مسجدیں ہیں اس کی حکمت وہی ہے جس کا تذکرہ ہم نے کیا کہ اس کا مقصد معاشرہ کو ان فتنوں سے بچانا ہے جو عورت کے باہر نکلنے سے پیش آسکتے ہیں۔

---

[1] بدائع الصنائع للکاسانی جلد ۲ ص ۱۳۳

یہ دو نکات ہیں جنھیں "عورت کے مشاغل" پر سوچتے ہوئے نظر میں رکھنا چاہئے اور اگر اس کا لحاظ رکھا جائے تو عقلی اور شرعی لحاظ سے کسی غلطی کا امکان نہیں رہ جاتا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ مشاغل میں انہماک فی نفسہٖ مستحسن ہے بشرطیکہ اس کے پیچھے اپنا سارا وقت اور ساری ذہنی و فکری صلاحیتیں نہ لگادی جائیں کیوں کہ اس سے وظائف زوجیت متاثر ہوں گے جو اس کی فطری زندگی کا مقتضا ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ روحانی اور اجتماعی زندگی کے بلند ترین مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے فطری مقام اس کا گھر ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے مقرر کر دیا ہے بایں وجہ اس کے لئے بغیر ناگزیر حاجات و ضروریات کے باہر نکلنا ممنوع ہے وہ ہمیشہ گھر میں رہے گی اور اس کا مقصد امام مالکؒ کے الفاظ میں یہ ہے۔

"تاکہ اسے ان مضرات سے بچایا جا سکے جس کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے۔"

چنانچہ اس کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنے فطری حدود میں رہتے ہوئے ہر طرح کے ذہنی اور جسمانی کام کرے چاہے وہ کسی دیہات میں ہو یا شہر میں اپنے کام کی مزدوری لے یا نہ لے یہ سارا اختیار اسی کو ہے مگر یہ ضروری ہے کہ اس کا لباس، زیب و زینت، چال ڈھال سب اسلامی شریعت کے مطابق ہو اور مردوں کے ساتھ اس کا اختلاط نہ ہوتا ہو۔

اسے اس کی بھی اجازت ہے کہ وہ کھیت میں جا کر کام کرے، ضروری چیزوں کی بیع و خرید کرے مثلاً کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے کے سامانوں کی چاہے یہ اس کی اپنی کوئی بھی ضرورت ہو یا اہل خاندان کی ضرورت ہو پھر وہ علمی ضرورت کے تحت بھی باہر نکل سکتی ہے مثلاً وعظ و تقریر کی سماعت کے لئے یا کسی میٹنگ اور اجتماع میں شرکت کے لئے۔

وہ لوگوں کو دینی معاملات میں فتویٰ بھی دے سکتی ہے ان کے درمیان فیصلہ بھی کر سکتی ہے

کیوں کہ جسے فتویٰ دینے کا حق حاصل ہو اسے قضاء کا بھی اختیار ہے جیسا کہ بعض ائمہ کا خیال ہے۔ جنگ کے میدان میں وہ فوج کی خدمت کے لئے بھی جا سکتی ہے اور وہ خدمت اس طرح کی ہے جیسے زخمیوں کی تیمارداری کرنا ان کی مرہم پٹی کرنا اور انھیں طبی امداد پہونچانا۔ کیوں کہ صحیح روایتوں سے یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عورتیں آپ کی اجازت سے لشکر میں شامل ہوا کرتی تھیں اور ان کے ذمہ فوجیوں کی خدمت، مریضوں کی تیمارداری، طبی امداد اور مرہم پٹی جیسے کام ہوتے تھے۔ چنانچہ امام بخاریؒ اور امام احمدؒ نے ربیع بنت معوذؓ سے نقل کیا ہے وہ فرماتی ہیں کہ ہم رسول خداؐ کے ساتھ جہاد میں جایا کرتے تھے۔ ہمارا کام سپاہیوں کی خدمت کرنا انھیں پانی پلانا اور مقتولین اور مجروحین کو مدینہ واپس لانا ہوتا تھا۔ صرف یہی نہیں اسے جنگ میں ہتھیار اٹھانے کی بھی اجازت ہے چنانچہ حضرت ابو طلحہؓ کی بیوی رمیصاءؓ کے بارے میں صحیح مسلم میں مذکور ہے کہ انھوں نے جنگ حنین کے موقع پر ایک خنجر رکھ لیا جب آپ کے شوہر نے اس کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے جواب دیا کہ میں نے اسے اس لئے لیا ہے کہ اگر کوئی مشرک میرے قریب آنے کی کوشش کرے گا تو میں اس کا پیٹ پھاڑ دوں گی۔ پھر اس واقعہ کی خبر جب نبی کریمؐ تک پہونچی تو آپ نے اس پر اظہار کراہت بھی نہیں کیا۔

ابن حزمؒ فرماتے ہیں کہ عورت کو قضاء کی ذمہ داری سونپنا جائز ہے۔ امام ابو حنیفہؒ بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کے بارے میں آتا ہے کہ انھوں نے اپنی قوم کی ایک عورت کو جس کا نام شفاء تھا بازار کی ذمہ داری سونپی۔

اس پر اگر اعتراض کرتے ہوئے اس حدیث کو پیش کیا جائے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے لن یفلح قوم اسندوا امرھم الی امرأۃ کہ کوئی قوم فلاح نہیں پا سکتی اگر اس کے معاملات کی باگ ڈور کسی عورت کے ہاتھ میں ہو۔ تو ہم کہیں گے کہ آپ کا یہ ارشاد خلافت کے عمومی معاملات

کے سلسلہ میں ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ نے خود فرمایا المراۃ راعیۃ علیٰ مالِ زوجھا وھی مسئولۃ عن رعیتھا یعنی عورت اپنے شوہر کے مال کی محافظ ہے اور اس سے اُس کی اس ذمہ داری کے بابت پوچھ گچھ ہوگی“۔ اسی سے استدلال کرتے ہوئے مالکیہ نے یہ کہا ہے کہ عورت وصی بھی بن سکتی ہے اور دلیل بھی مزید یہ کہ اسے بعض ضمنی معاملات کی ذمہ داری بھی سونپی جا سکتی ہے کیوں کہ اس سلسلہ میں کوئی نصِ قاطع موجود نہیں ہے۔[1]

عورتوں کی ملازمت

اوپر مندرج تفصیلات سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عورت کے مصالح اس کا تقاضا کرتے ہیں کہ وہ دن دن بھر گھر سے اس طرح غائب نہ رہے کہ اس کا سارا وقت اور ساری جد وجہد گھر سے باہر ہی صرف اور اپنے اصل واجبات کو فراموش کر بیٹھے۔ چنانچہ اس کے لئے یہ قطعی جائز نہیں ہے کہ وہ گھر سے باہر نکل کر صنعت وحرفت کے پیشوں کو اپنائے یا کوئی مستقل ملازمت کرے جس طرح کہ آج کل کی عورتیں کرتی ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس طرح اپنے دونوں حدود کو پھلانگ جاتی ہے یعنی گھر جو اس کی فطری ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لئے صحیح جائے قیام ہے وہ وہاں نہیں رہ پاتی اور اپنے اوقات اور فکری وذہنی تمام صلاحیتوں کو دوسرے مقاصد کے لئے استعمال کرنے لگتی ہے جب کہ اس کے استعمال کی صحیح جگہ اس کا گھر ہے۔ اسکے علاوہ بھی بہت سے نقصانات ہیں جن میں سے بعض کا تذکرہ ہم ذیل میں کرتے ہیں۔

اوّل: عام طور سے وہ روزانہ علی الصباح اپنی ملازمت پر جاتی ہے اور ہفتوں، مہینوں اور سالوں تک اسی میں لگی رہتی ہے یہاں تک کہ وہ پنشن پانے لگتی ہے یا کام سے مجبوری کی بنا پر الگ کر دی

---

[1] محلّی جلد ۹ صہ ۴۲۹ تا ۴۳۵

جاتی ہے۔ اور یہ حالت سراسر شرعی نقطۂ نظر کے خلاف ہے جسے اس نے اَسْکِنُوْھُنَّ سے تعبیر کیا ہے اور جس کی وضاحت ہم کاسانی کے حوالہ سے پیچھے کر چکے ہیں آیت کے الفاظ یہ ہیں لَا تُخْرِجُوْھُنَّ مِنْ بُیُوْتِھِنَّ وَلَا یَخْرُجْنَ۔

پھر ایک اور پہلو سے بھی اس پر غور کیجئے کہ جب وہ بھی مرد کی طرح مستقل کمانا شروع کر دیگی تو مرد اور عورت یکساں طور پر ایک دوسرے کے محتاج ہو جائیں گے، دونوں دن بھر کے تھکے ماندے گھر واپس آئیں گے تو ان دونوں کی یہ خواہش ہوگی کہ دوسرے دن صبح کو کام پر جانے کے لئے تر و تازہ ہو جائیں۔ پھر جب دونوں کی ضرورتیں یکساں ہو جائیں گی دونوں مستقل طور گھر سے باہر رہنے لگیں گے تو اللہ تعالیٰ نے گھر کی اضافت جو عورت کی طرف کی ہے اس کا ابطال لازم آئے گا۔ لَا تُخْرِجُوْھُنَّ مِنْ بُیُوْتِھِنَّ۔ وَاذْکُرْنَ مَا یُتْلٰی فِیْ بُیُوْتِکُنَّ۔

اس سے معلوم ہوا کہ اس طرح اس کا گھر سے باہر رہنا جہاں کتاب اللہ کے نصوص کی نافرمانی ہوتی ہے وہیں وہ روحانی اور اجتماعی مقاصد بھی مجروح ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اس کے گھر میں رہنے کی صورت میں متعین فرمائے ہیں۔

دوم: اس کا وہ کام جس میں وہ ہفتوں، مہینوں اور سالوں تک مصروف رہتی ہے یہاں تک کہ وہ عمر کے آخری مرحلہ پر پہنچ کر ریٹائر ہو جاتی ہے یا اسی میں منہمک رہتی ہے۔ یہ کام اس کے ذہن و فکر اور اس کے لباس اور مشاغل پر چھا جاتا ہے وہ اسی کے رنگ میں رنگ جاتی ہے اور اس کے اندر ایسا احساس پیدا ہوتا ہے جو اسے "ماہانہ آمدنی" کے حصول میں سرگرم رکھتا ہے نفس کی ہر ملامت اور ضمیر کی ہر پکار سے بے نیاز ہو کر وہ اپنی زندگی کی ہر سانس کو اسی کے لئے متحرک رکھتی ہے اس طرح اس کا ذہن خالص مادہ پرستانہ بن جاتا ہے اور اس کے نزدیک قابل احترام اور قابل تقلید وہ شخص ٹھہرتا ہے جو اسی کی طرح مادہ پرست ہو اور اس میدان میں اس نے دوسروں کو شکست دے دی ہو۔

خواہ دونوں کی زندگی کا رخ ایک دوسرے سے کتنا ہی جدا کیوں نہ ہو۔ چنانچہ واقعات بتاتے ہیں کہ جب وہ اس میدان میں آتی ہے تو اسے ایسے ایسے لوگوں کے یہاں کام کرنا پڑتا ہے جو اپنے علاقہ کے رئیس ہوں اور ہر آن ترقی کا ایک نیا خواب دیکھ رہے ہوں۔

فکر و وجدان کا یہی مزاج ہے جو اس کی شخصیت کو ختم کر دیتا ہے اور اس کے فکر و احساس کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔ اور اس کے تمام تصورات زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کے حق میں ہو جاتے ہیں جو اس کے فطری مقاصد اور روحانی مشاغل کی تکمیل میں سد راہ بن جاتے ہیں۔ اس لئے اسے ہرگز جائز نہیں کہا جا سکتا۔

ہمارے کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کا یہ مادہ پرستانہ مزاج اس کے حمل اور جنسی تعلقات کے استعداد کو ختم کر دیتا ہے ہمارا مطلب یہ ہے کہ وہ نسوانیت کے تمام قوانین اور اس کے مضمرات کو پس پشت ڈال دیتا ہے کیوں کہ نسوانیت مجرد جسم کی بناوٹ اور جنسی تعلقات کا نام نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ فکر و عمل کی وحدت اور ان قوانین کو روبعمل لانے کا نام ہے جسے اللہ تعالیٰ نے مقاصد کی حیثیت سے متعین کر دیئے ہیں۔ پس جب تربیت نفس اور اس کے قوانین ہی اس کے اصل مقاصد ہیں تو وہ فکر و مزاج جو اسکی ذہن کی تعمیر خالص مادہ پرستانہ نقطۂ نظر سے کرتا ہے سراسر غلط اور باطل ہے کیوں کہ وہ اسے اس کے اصل مقصد سے ہٹا دینا چاہتا ہے۔

اب آیئے اس طرح کے ماحول میں ہم زن و شو کے تعلقات پر بھی غور کریں تو سوچئے کہ جس تنخواہ کے لئے وہ ذہن و دماغ کی ساری صلاحیتیں بیچتی ہے۔ جسم و جان کی ساری قوتیں صرف کرتی ہے اور گھر کے اخراجات کو برداشت کرنے میں جس طرح وہ مرد کا ہاتھ بٹاتی ہے تو کیا اس کے اثرات اس کے اوپر بھی اسی طرح نہیں مرتب ہوں گے جس طرح اس کے شوہر پر ہوتے ہیں کہ وہ دن دن بھر اپنے کام اپنی تنخواہ اور اپنی ذمہ داریوں میں منہمک رہتا ہے۔

پھر جس طرح مرد گھر کے اخراجات کو برداشت کرنے میں اپنی تنخواہ صرف کرے گا اسی طرح عورت بھی کرے گی اور اس طرح ان کی ذمہ داریوں میں یکسانیت پیدا ہو جائے گی اور یہی چیز ان کے درمیان ایک معاشی احساس بیدار کرے گی جس سے ان کے تعلقات میں لامحالہ ایک طرح کی "بے کیفی" پیدا ہوگی۔ کیوں کہ عورت کا خود یہ احساس ہوگا کہ وہ بھی مرد کی طرح کماتی ہے اور گھر کے اخراجات برداشت کرتی ہے۔ جب یہ احساس پیدا ہو جائے تو پھر نفسیاتی طور پر وہ کون سے عوامل ہوں گے جن کے ذریعہ ان کی فطری بنیادوں کو مضبوط کرنا ممکن ہوگا جس سے ان کے ضمیر میں ازدواجی رشتوں کا احترام برقرار رہ سکے گا؟

ا۔ ان بنیادوں میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ عورت مرد کے لئے باعث سکون ہے تو کیا مرد کو ایسی عورت سے حقیقی سکون مل سکے گا کہ جب وہ گھر میں آئے تو اسے موجود ہی نہ پائے یا اگر پائے بھی تو اس حال میں کہ وہ بھی اسی کی طرح ذہنی اور جسمانی طور پر تھکی ہوئی ہے۔؟ یا ایسی عورت کے پاس وہ سکون مل سکے گا جس نے اپنے احساس کو یومیہ آمدنی، کام کی سختی اور ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دبا دیا ہو اور اپنے اور اس کے درمیان ایک مماثلت سی پیدا کرلی ہو پھر جب دونوں کی ملاقات ہو تو وہ اس سے اس احساس کے ساتھ ملاقات کرے کہ وہ بھی اسی کی طرح کماتی ہے اور اور گھر کو چلانے کے لئے وہ بھی اس کے دوش بدوش ہو کر کام کرتی ہے؟ دونوں کے اندر مزاج کی وہی یکسانیت پیدا ہو جائے جو ایک جیسے کام میں منہمک ہونے سے ذہنی اور جسمانی طور سے دو افراد کے درمیان پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر نہ تو عورت اپنے مرد کے اندر قوت و توانائی کا احساس کر سکے گی جسے وہ اپنی نرمی اور لطافت کے دور میں کرتی تھی کہ اس کا وجدان خوشی اور مسرت کے بے پناہ جذبات سے لبریز ہو جاتا تھا۔ اور نہ مرد ہی اس سے وہ خوشی حاصل کر سکے جس کی تلاش اسے اپنی زندگی میں ہوتی ہے۔ میری مراد عورت کی اس نرمی و لطافت اور اطمینان و رضا سے ہے جو اس کے

اندر مرد کی شدت اور قوت کے احساس سے پیدا ہوجاتی ہے یہی وہ لذت ہے جس کی تلاش میں اسے اطمینان حاصل ہوتا ہے اپنے اوپر اس کا اعتماد پختہ ہوتا ہے اور قوت و عزیمت کے عناصر اس کے اندر بیدار ہوتے ہیں۔

۲۔ ظاہر ہے کہ جب مرد کو وہ سکون نہیں مل سکے گا جس کی اسے ضرورت ہے تو عورت کو بھی مرد کے اندر وہ شدت اور توانائی نہیں مل سکے گی جس کی اسے تلاش ہے اور اس طرح قوامیت کی روح ختم ہوجائے گی اور اس کا احساس واقرار دل سے ختم ہوجائے گا۔

قانون قوامیت کی بنیاد اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے:

اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ۔ (النساء : ۶)

مرد عورتوں پر قوام ہیں اس فضیلت کی بنا پر جو اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر عطا کی ہے اور اس بنا پر کہ وہ ان پر (مہر و نفقہ کی صورت میں) اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔

یہ وہ قانون ہے جو عورت کے اندر "قبولیت" کے جذبات پیدا کرتا ہے اور مرد کے اندر ایجابی صلاحیتیں ابھارتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ مرد اپنی بیوی کی ہر طرح سے حمایت و حفاظت کرتا ہے اور اس کے نان و نفقہ کا بندوبست کرتا ہے۔ ہم پیچھے اس سلسلہ میں گفتگو کرتے ہوئے کہہ چکے ہیں کہ یہ ان قوانین میں سے ہے جن کے بغیر خاندان کے روابط درست نہیں ہوسکتے چنانچہ آیت کریمہ اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ سے ثابت ہوتا ہے کہ خاندان کی تاسیس اور اس کے استحکام کی بنیاد یہی ہے کہ مرد ہی تنہا گھر کی تمام ذمہ داریوں کا متحمل اور گھر کی معاشی ضروریات کا کفیل ہو اور گھر کا ہر فرد اس کی بات کو ماننے اور اس پر سر تسلیم خم کرے۔ یہ تو رہا اس کا ظاہری پہلو اور اس کا باطنی پہلو یہ ہے کہ اس آیت کریمہ کا مفہوم یہ لیا جائے کہ نفسیاتی طور پر دونوں اس قانون پر راضی اور مطمئن ہیں کہ مرد گھر

کا قوام ہو لیکن جب اس کے دل سے اس کی قوامیت کا احساس ختم ہو جانے اور مرد اپنی ایجابی صلاحیت کھو بیٹھے جس کے ذریعہ سے عورت اس کی مطیع ہوتی ہے تو ان کے روابط میں اختلال پیدا ہو جاتا ہے اور قانون ازدواج کا احترام ان کے دلوں سے نکل جاتا ہے۔

جب عورت کے باہر نکل کر کام کرنے کے یہ نتائج ہوں کہ اس سے ان کی ازدواجی زندگی تلخ ہو جائے اور ان کا قلبی سکون غارت ہو جائے اور قانون قوامیت ختم ہو جائے تو کیا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہ کام اس کی ازدواجی زندگی میں پختگی لاتا ہے؟ اور یہی کام ہے جس کی اجازت شریعت نے دی ہے۔

سوم: تجربات نے اسلامی قوانین کی سچائی کو ثابت کر دیا ہے کیوں کہ مغرب جو عورتوں کی ملازمت کا حامی ہے وہاں ہلاکت کے آثار نمایاں ہو گئے ہیں کیوں کہ عورت کے معاشی استقلال (ECONOMIC INDEPENDENCE) نے اسے دوسروں سے بے نیاز کر دیا ہے۔ اور اب آدھے سے زیادہ نوجوان۔ مرد اور عورت قید نکاح میں بندھنے سے پہلے ایک دوسرے سے جنسی طور پر آسودہ ہو چکے ہوتے ہیں۔

پھر جب حرامی بچہ کا سوال اٹھا کہ یہ اس کے کام میں خلل ڈالے گا اور یہ اپنی روزی آپ نہیں کما سکے گی اور اس کی مساوات ختم ہو جائے گی کیونکہ اس کی موجودگی اسے دوسرے فرائض سے روک دے گی اور وہ پارٹیوں، کلبوں اور دوسرے لہو و لعب کے مقامات پر نہیں جا سکے گی تو اس نے منع حمل کے ذرائع کا سہارا لیا۔ پھر جب اس نے اپنے اردگرد نظر دوڑائی تو اسے دلچسپی اور دلبستگی کے بہت سے مقامات نظر آئے۔ پھر اس نے سوچا کہ پوری عمر کسی ایک مرد ہی کی ردکر کیوں گزاری جائے اور بہت سے اخلاقی ضوابط کا کیوں پابند بنا جائے جبکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور وہ اس سے بے نیاز ہو کر اس سے زیادہ اور بہت کچھ حاصل کر سکتی ہے۔ چنانچہ خاندانی نظام کا شیرازہ بکھر گیا۔ شادیاں کم ہو گئیں اور معاشرہ میں حرامی بچوں کی تعداد بڑھ گئی۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اس صورتحال کی وضاحت اپنی کتاب پردہ میں بڑے دل نشیں انداز میں کی ہے مولانا رقم طراز ہیں :۔

"عورت کے معاشی استقلال نے اس کو مرد سے بے نیاز کر دیا ہے وہ قدیم اصول کہ مرد کمائے اور عورت گھر کا انتظام کرے اب اس نئے قاعدہ سے بدل گیا ہے کہ عورت اور مرد دونوں کمائیں اور گھر کا انتظام بازار کے سپرد کر دیا جائے، اس انقلاب کے بعد دونوں کی زندگی میں بجز ایک شہوانی تعلق کے اور کوئی ربط ایسا باقی نہیں رہا جو ان کو ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہونے پر مجبور کرتا ہو۔ اور ظاہر ہے کہ محض شہوانی خواہشات کو پورا کرنا کوئی ایسا کام نہیں ہے جس کی خاطر مرد اور عورت لامحالہ اپنے آپ کو ایک دائمی تعلق ہی کی گرد میں باندھنے اور ایک گھر بنا کر مشترک زندگی گذارنے پر مجبور ہوں جو عورت اپنی روٹی آپ کماتی ہے اپنی تمام ضروریات کی خود کفیل ہے اپنی زندگی میں دوسرے کی حفاظت اور اعانت کی محتاج نہیں ہے وہ آخر محض اپنی شہوانی خواہشات کی تسکین کے لئے کیوں ایک مرد کی پابند ہو؟ کیوں اپنے اوپر بہت سی اخلاقی اور قانونی بندشیں عائد کرے؟ کیوں ایک خاندان کی ذمہ داریوں کا بار اٹھائے؟ خصوصاً جب کہ اخلاقی مساوات کے تخیل نے اس کی راہ سے وہ تمام رکاوٹیں بھی دور کر دی ہوں جو اسے آزاد شہوت رانی کا طریقہ اختیار کرنے میں پیش آسکتی تھی تو وہ اپنی خواہشات کی تسکین کے لئے آسان اور پر لطف اور خوشنما راستہ چھوڑ کر قربانیوں اور ذمہ داریوں کے بوجھ سے لدا ہو پرانا و قیانوسی (OLD FASHIONED) راستہ کیوں اختیار کرے؟ گناہ کا خیال مذہب کے ساتھ رخصت ہوا۔ سوسائٹی کا خوف یوں دور ہو گیا کہ سوسائٹی اب اسے فاحشہ ہونے پر ملامت نہیں کرتی بلکہ ہاتھوں ہاتھ لیتی ہے۔ آخری خطرہ حرامی بچہ کی پیدائش کا تھا سو اس سے بچنے کے لئے منع حمل کے ذرائع موجود ہیں۔ ان ذرائع کے باوجود حمل قرار پا جائے تو اسقاط میں بھی کوئی مضائقہ نہیں اس میں بھی کامیابی نہ ہو تو بچے کو

خاموشی کے ساتھ قتل کیا جاسکتا ہے اور اگر کمبخت جذبۂ مادری نے (جو بدقسمتی سے ابھی بالکل فنا نہیں ہوسکا ہے!) بچے کو ہلاک کرنے سے روک بھی دیا تو حرامی بچہ کی ماں بن جانے سے بھی کوئی حرج نہیں ہے کیوں کہ اب "کنواری ماں" اور "ناجائز مولود" کے حق میں اتنا پروپیگنڈہ ہوچکا ہے کہ جو سوسائٹی ان کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے کی جراءت کرے گی اسے خود تاریک خیالی کا الٹا الزام اپنے سر لینا پڑے گا۔ یہ وہ چیز ہے جس نے مغربی معاشرت کی جڑیں ہلاکر رکھدی ہیں ؎

سوچنے کا مقام ہے کہ جب اس طرف جلنے والوں کا یہ انجام ہو رہا ہے تو کیوں نہ ہم اپنے اصل راستہ کو اپنائیں تاکہ اپنے معاشرہ کو اس ہولناک انجام سے بچا سکیں۔ بڑا نصیبہ ور ہے وہ شخص جو دوسروں کے انجام سے عبرت حاصل کرے، خدا سے دعا ہے کہ وہ ہمیں سیدھے راستہ کی طرف ہدایت دے۔

عورتوں کے حقوق پر دو بڑے اعتراضات

۱۔ عورتوں کی ملازمت

کام کرنا عورت کا فطری حق ہے

کچھ بے بنیاد اعتراضات جو اس مسئلہ کے ضمن میں کئے جاتے ہیں وہ یہ ہیں۔

"کام کرنا عورت کا فطری حق ہے" لیکن جب آپ اس مسئلہ کی گہرائی میں اتریں گے تو اس کے انطباق میں آپ کو بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا یعنی یہ کہ "اس کام کرنے" کی نوعیت لوگوں

؎ پردہ: ص ۲۰، ۲۲

کے ذہنوں میں کیا ہے۔ اور یہ سوال اس لئے پیدا ہوگا کیوں کہ فطری طور پر یہ حق عورت کے ان مالی حقوق کی طرح نہیں ہے جن کی حمایت قانون کرتا ہے اور نہ ہی یہ ان حقوق میں آتا ہے جنھیں شخصی معاملات میں شریعت نے فرد کے لئے متعین کیا ہے۔ بلکہ یہ اس کے برعکس ثابت ہوگا جسے ہم پیچھے دلائل کے ساتھ ثابت کر چکے ہیں۔ چنانچہ فطرت انسانی پر نگاہ دوڑانے سے ہمیں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ انسان فطری طور پر بہت سے حقوق میں گھرا ہوا ہے مثال کے طور پر اس کا ایک حق یہ بھی ہے کہ وہ چونکہ آزاد پیدا ہوا ہے اس لئے اس کی آزادی پر کوئی حد نہیں عائد کی جا سکتی۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے اور کوئی بھی عقلمند شخص اس کی تائید نہیں کر سکتا۔ اسی پر عورت کے اس حق کو بھی قیاس کر لیجئے اور جان لیجئے کہ عورت کو اس طرح کے حقوق قطعاً نہیں دیئے جا سکتے جس سے اس کی نسوانیت مجروح ہو اور اس کے اصل حقوق کو نقصان پہونچے۔ اس کا اصل حق یہ ہے کہ وہ ایک بیوی ہو، ایک ماں ہو اور ایک گھر کی مالکہ ہو اور کوئی اسے اس کے اس حق سے نہیں روک سکتا بلکہ معاشرہ اور حکومت پر یہ فرض ہے کہ وہ اس راہ میں اس کے لئے آسانیاں بہم پہونچائیں اور اس کے ان حقوق کے لئے ضمانتیں فراہم کریں۔

پھر جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ فطری اہلیت ہی انسان کو کسی حق کے لائق بناتی ہے تو دین اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جس حق کو وہ حاصل کر چکا ہے اس سے ٹھیک سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرے گویا وہ ایک فرض ہے جس سے فرار ممکن نہیں۔ مثال کے طور پر اگر انسان کا یہ حق ہے کہ وہ تمام جکڑبندیوں سے آزاد ہو تو اس کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے اس حق سے روگردانی نہ کرے کہ وہ کسی مقام پر اپنے آپ کو ذلیل کر بیٹھے نبی کریمؐ کا ارشاد گرامی **ما ینبغی للمومن ان یذل نفسہ** [1] "کسی مومن کے شایان شان یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل کر بیٹھے" اسی

---

[1] ابن کثیر نے اس حدیث کو آیت قرآنی أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ (مائدہ: ۵۴) کی تفسیر میں بخاری کے حوالے سے نقل کیا ہے

موقع کے لئے ہے۔

چنانچہ انوثت جب عورت کو اس کا حق دیتی ہے کہ وہ کسی کی بیوی کسی کی ماں اور کسی گھر کی مالکہ بنے تو اسی وقت اس پر یہ ذمہ داری جسے ہم حکم خداوندی سے تعبیر کرتے ہیں۔ بھی عائد کرتی ہے کہ وہ ان اغراض کو پورا کرے جو اس کے لئے متعین کر دیئے گئے ہیں۔ شریعت نے وضاحت کے ساتھ اس ذمہ داری کو پوری تفصیل تاکید کے ساتھ بیان کر دی ہے۔ چنانچہ ایک طرف تو یہ اس کا حق ہے اور دوسری طرف یہ اس کی ذمہ داری بھی ہے جس سے فرار اس کے لئے جائز نہیں ہے اور کوئی بھی عقلمند شخص ان دونوں کے علاوہ کسی ایسی تیسری چیز کی نشاندہی نہیں کر سکتا جس کی بنیاد پر اس کا یہ حق قرار پائے کہ وہ اپنے گھر سے اپنی اصل ذمہ داریوں کو چھوڑ کر باہر نکلے اور ملازمت یا صنعت و حرفت کا پیشہ اختیار کرے۔

پس جب یہ ثابت ہو گیا کہ اس کے "کام کرنے" کا یہ حق نہ تو مالی حقوق کی طرح ہے نہ تو انفرادی حقوق سے اس کا تعلق ہے اور نہ ہی یہ فطری حقوق میں شامل ہے۔ تو یہ کہنا کہ یہ بھی اس کا حق ہے سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔

عورتوں کی پیداواری صلاحیت

کسی کام کے انجام میں نفع اور عمدگی کی تلاش زندگی کا ایک اہم قانون اور تہذیبی ترقی کا سنگ بنیاد ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ہر چیز میں عمدگی اور سلیقہ مندی کو واجب ٹھہرایا ہے[۱]۔ اور وہ یہ

---

[۱] ملاحظہ ہو حدیث شریف ان اللہ تعالیٰ کتب الاحسان علی کل شیٔ اس کی روایت درج ذیل کتب حدیث احمد، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، نسائی وغیرہ نے کی ہے۔

پسند کرتا ہے کہ اس بندہ جب کوئی کام اپنے ہاتھ میں لے تو اسے سلیقہ اور ہنرمندی سے انجام دے[1] اب قابل غور بات یہ ہے کہ کمزور صلاحیتوں کے لوگ جب کوئی ٹھوس کام اپنے ذمہ لیں گے تو کیا وہ اسے اچھی طرح سے انجام دے سکیں گے جب کہ وہ ان کاموں کا اچھی طرح سے احاطہ بھی نہ کر سکتے ہوں؟

اس سے ہمارا اشارہ اس بیکاری اور بے روزگاری کی طرف نہیں ہے جو عورتوں کے میدانِ عمل میں اتر آنے سے تمدن کو درپیش ہے اور مردوں کے سامنے ملازمت کی راہیں تقریباً بند ہو چکی ہیں۔ ہمارا اشارہ پیداوار (PRODUCTION) کی اس کمی کی طرف ہے جو کمزور جان عورت کے ہاتھ میں آنے کا لازمی نتیجہ ہے کیوں کہ وہ ان کاموں کو اس قدر بہتر طریقہ سے انجام نہیں دے سکتی جتنے بہتر طریقہ سے مرد انجام دے سکتا ہے اور وہ اس کے ذریعہ اس قدر نفع اور فائدہ نہیں حاصل کر سکتی ہے جتنا مرد کے کام کرنے کی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے۔ جب صورتِ حال یہ ہے تو ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ کس بنا پر عورت کے نازک کاندھوں پر وہ ذمہ داری ڈالی جا رہی ہے جسے وہ صحیح طریقہ سے انجام نہ دے کر تمدن کی بے شمار منفعتوں کو پامال کر رہی ہے۔ اور یہ ہماری لاپرواہی اور سہل انگاری ہی ہے کہ ہم بڑی منفعتوں کو چھوڑ کر حقیر منفعتوں کے پیچھے دوڑ رہے ہیں جب کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس طرح کی لاپرواہی سخت مبغوض ہے اور یہ کوتاہی اپنی ذات میں ایک آفت بھی ہے کیوں کہ زندگی کی ہر سانس انسان کو ترقی کی ایک نئی منزل طے کراتی ہے اور اسی ترقی کی راہ پر گامزن رہنے کے لئے خداوند کریم نے ہر مخلوق کو اسی کی مناسبت سے سامان زیست بھی عنایت فرمایا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول کہ "ان اللہ کتب الاحسان علیٰ کل شیءٍ اسی

---

[1] ملاحظہ ہو حدیث شریف "ان اللہ تعالیٰ یحب اذا عمل احدکم الخ اسے بیہقی شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔

حقیقت کی طرف غماز ہے۔ اس حدیث مبارک میں "کتابۃ احسان" کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس نے ہر مخلوق کو اس کی ضرورت کی تمام چیزیں عطا کی ہیں اس لئے خدا کی عطا کردہ ان تمام چیزوں سے شعوری یا غیر شعوری طور پر غفلت برتنا کامیابی و کامرانی کی راہ کا ایک زبردست روڑہ ہے۔ اور ساتھ ہی یہ زندگی کے کمال کا ایک عیب بھی ہے۔ اور اگر ایک اور رخ سے غور کیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ یہ خدائی قوانین سے بغاوت اور سرکشی ہے۔ بہرحال سردست ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں، سوچنا صرف یہ ہے کہ جب مادی منفعتیں بھی ختم ہو جائیں اور لوگوں کے عزائم و ارادے بھی سرد پڑ جائیں اور وہ زندگی کے اہم قوانین کو بھی پامال کرنے لگ جائیں اور صرف اپنی خواہشات کی پیروی کریں اور عقل کے فیصلہ کو بھی تسلیم نہ کریں تو ان کی زندگی کو تباہی کے غار میں گرنے سے کون بچا سکتا ہے؟ اور ان کی تہذیب کو فنا کے گھاٹ اتر جانے سے کون روک سکتا ہے؟

(۲)

پیچھے ہم جو کچھ بیان کر چکے ہیں اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسلام نے اپنے قوانین میں کس قدر نرمی برتی ہے اور انھیں کس قدر معتدل بنا دیا ہے کہ اس کی روزی کا اس نے کس قدر ٹھوس بندوبست کر دیا ہے چنانچہ اس کا نفقہ سب سے پہلے اس کے باپ پر عائد ہوتا ہے اور یہ اس کے بالغ ہونے کے ساتھ ساقط نہیں ہو جاتا۔ جیسا کہ لڑکے کے معاملہ میں ہوتا ہے۔ بلکہ یہ اس وقت تک برقرار رہتا ہے جب تک اس کی شادی نہ ہو جائے اور شادی ہو جانے کے فوراً بعد شوہر اس کے نفقہ کا ضامن ہو جاتا ہے پھر اگر اسے طلاق ہو جائے تو دوبارہ اس کا نفقہ باپ پر عائد ہو جاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ یہ ایک تفصیل طلب مسئلہ ہے جس پر بحث کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ لیکن ایک بات جس کا تذکرہ ضروری ہے وہ یہ کہ اگر عورت کا کوئی کفیل نہ ہو تو پورے معاشرہ پر اس کی کفالت کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور حکومت سوسائٹی کی نمائندہ کی حیثیت سے بیت المال میں سے اس کے

اخراجات ادا کرے گی۔

اس صورتِ حال کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنی نگاہ کو ہر طرف سے پھیر کر صرف اسی پر جما دیں اور دل کی اس خلشِ مسلسل سے نجات حاصل کرلیں کہ عورت جب تک کام نہ کرے ترقی کے زینہ پر نہیں چڑھ سکتی۔ کیوں کہ عورت کی حقیقی ترقی یہ ہے کہ اس کی انسانیت ترقی یافتہ ہو۔ عقل میں سنوار آئے، اخلاق میں عمدگی پیدا ہو اور قلب وطبیعت ہر طرح کے تکدرات سے پاک وصاف ہو جائیں۔ لیکن جب ہم ترقی کا معیار یہ بنالیں کہ اس کو گھر سے باہر نکال کر دوکانوں، کارخانوں، مدرسوں، کمپنیوں اور کچہریوں کی زینت بنا دیں تو فی الواقع یہ ترقی نہیں بلکہ تنزل وانحطاط ہے، یہ نفع کا نہیں بلکہ گھاٹے کا سودا ہے۔

یہ ہماری بے بصیرتی ہے کہ ہم مودّت ومحبت اور اطاعت وفرمانبرداری جیسی اعلیٰ قدروں کو اتنی بھی اہمیت نہیں دے رہے ہیں جو معاشی قدروں کو حاصل ہے حالانکہ یہ وہ چیزیں ہیں کہ اگر کوئی عورت اسے اپنی زندگی میں اپنالے تو اس سے بہتر اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔

ہم پیچھے قانونِ امومت کی تشریح اس کے ثمرات اور جن حالات میں یہ قانون اپنا اثر دکھاتا ہے ان تمام مقامات کی نشاندہی کر چکے ہیں۔ ہم نے پیچھے کہا تھا کہ حضرت عیسیٰؑ اور آپ کی والدہ کو جو برکت اور رحمت حاصل ہوئی وہ دراصل صالح امومت کا اثر تھا، چنانچہ قرآن مجید نے عمران کی بیوی (حضرت مریمؑ کی والدہ) کی جو دعا نقل کی ہے وہ یہ ہے:-

رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَکَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا ۔ (آل عمران: ۳۵)

میرے پروردگار، میں اس بچے کو جو میرے پیٹ میں ہے تیری نذر کرتی ہوں

یہ دعا ان دو عورتوں کے درمیان اس عظیم فرق کو اچھی طرح سے واضح کر دیتی ہے جس کا مقصد محض اپنی ذات ہے اور جس کا مقصد پوری انسانیت کی فلاح وبہبود ہے۔ آخر الذکر

اپنی ذمہ داری کی اہمیت اور اس کی عظمت سے اچھی طرح آشنا ہو چکی ہے جب کہ اول الذکر کے پیش نظر محض مادی فائدہ ہے چاہے جس طرح وہ اسے حاصل کرے۔

اور یہ مسئلہ کسی خاص امت کا نہیں بلکہ مجموعی طور پر پوری انسانیت کا مسئلہ ہے اس لئے اس کے علاج کی ذمہ داری محض افراد پر چھوڑ دینا ہرگز مناسب نہ ہوگا کیوں کہ انسان خواہ مرد ہو یا عورت فطرتاً انانیت پسند واقع ہوا ہے۔ ان سب سے کچھ تو ایسے ہیں جن کی سرشت میں اپنی خواہشات کی تسکین اور زیادہ سے زیادہ مال حاصل کرنے کی تمنا رکھ دی گئی ہے، کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو عورت کے کام کو ایک معاشرتی ضرورت خیال کرتے ہیں اور اس کے بغیر زندگی کو نامکمل سمجھتے ہیں۔ اب اگر اسے ان کی خواہشات، خود غرضیوں اور حالات پر چھوڑ دیا جائے تو ان بہترین اوصاف کے حامل افراد کہاں ملیں گے۔ اور وہ قابل تقلید مادریت کہاں سے آئے گی جو لوگوں کے لئے مشعل راہ ہو اور وہ باکردار معاشرت کہاں سے پنپ سکے گی جو تمدن کے استحکام اور اس کی بقا کی بنیاد ثابت ہو سکے۔ اس لئے ہمارا خیال یہ ہے کہ حکومتوں اور ریاستی تنظیموں کو اس پیچیدہ مسئلہ کو سلجھانے کے لئے اٹھنا چاہئیے اور براہ راست اس میں مداخلت کرنی چاہئیے۔ اس سلسلہ میں اسلام نے عورت کو معاش سے بے نیاز کرنے کے لئے جو قوانین بنائے ہیں وہ نہایت جامع ہیں اور اسی کے ذریعہ ہر عورت کو اس کا معاشی تحفظ دیا جا سکتا ہے۔ اور یہ ایک طرح سے عورت کا حق بھی ہے کیوں کہ جب وہ شریف اولاد پیدا کرے گی اور ان کی بہترین تربیت کرے گی تو اس کا یہ کام پوری سوسائٹی اور پوری انسانیت کا کام ہوگا کیوں کہ اس کے ثمرات و برکات صرف اس پر اور اس کے خاندان ہی پر مرتب نہیں ہوں گے بلکہ ساری انسانیت ان سے فیض یاب ہوگی۔

اسی کی تشریح کرتے ہوئے الاستاذ انیس منظور جن کا شمار مشہور ترقی پسند صحافیوں میں ہوتا ہے رقم طراز ہیں:۔

"ازدواجی زندگی کے سلسلہ میں ہمارا عمومی نقطۂ نظر یہ ہے کہ ہم اسے کوئی کام نہیں سمجھتے جب کہ فی الحقیقت یہ ایک معاشی، معاشرتی، تربیتی اور نفسیاتی خدمت ہے اور یورپ کے بعض ممالک مثلاً آسٹریلیا وغیرہ میں تو اس کے لئے باقاعدہ اجرت دی جاتی ہے کیونکہ وہ گھر میں کام کرتی ہے۔ اور زیادہ دن نہیں گذریں گے کہ تم دیکھو گے کہ عورت کو کام کاج یا بچہ کی نگہداشت دونوں کاموں میں اختیار دیا جائے گا کہ وہ جس کو چاہے پسند کرے اور تم دیکھو گے کہ وہ بچہ کی نگہداشت کی ذمہ داری اپنے سر لیتے ہوئے بالکل نہیں جھجکے گی"۔[1]

اب انسانیت کو بچانے کا راستہ صرف یہی ہے کہ ہم عورت کو اس کی حقیقی عظمت سے آگاہ کریں ہم اسے بتائیں کہ روحانی اقدار کسی بھی حال میں مادی فوائد سے کم نہیں ہیں اور انسان کو حقیقی سعادت حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ دونوں کو یکساں اہمیت دے۔

خاتمہ

کیا جدت پسندی اختیار کر کے عورت نے اپنے ساتھ انصاف کیا؟

جدت پسندی سے ہماری مراد مغربیت ہے۔ اور اس پر بحث کرنے کی ضرورت ہمیں اس لئے پیش آرہی ہے کہ چاہے ہم مانیں یا نہ مانیں مگر فی الواقع آج کی مسلمان عورت کے لئے یہی مغربیت اسوۂ حسنہ بن گئی ہے اور اس کی خواہش ہے کہ کاش وہ اپنے آپ کو کلی طور پر مغربیت کے رنگ میں رنگ سکے اور ادیبوں کا ایک طائفہ اس کو مزید شہ دے رہا ہے اور اس کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے

---

[1] یہ اقتباس الاستاذ انیس منصور کے جریدہ "الاخبار" سے ماخوذ ہے اس میں "مواقف" کے عنوان کے تحت آپ نے یہ سطریں لکھی تھیں۔

یہاں ہم اس کے اسباب پر توروشنی نہیں ڈالیں گے لیکن صحیح بات یہ ہے کہ وہ ہماری مقدس میراث اور ہماری قومی خصوصیت کو ختم کرنا چاہتے ہیں اور ترقی پسندی اور آرٹ کا نام لے کر وہ ہر نوجوان مرد اور عورت کے ذہن سے اسے کھرچ دینا چاہتے ہیں۔

اس بحث میں ہم مغربی عورت کی ارتقاء کے وجوہ و اسباب، اس کے تاریخی پس منظر اور اس ترقی تک پہونچنے کے لئے اسے جن مراحل سے گزرنا پڑا ہے اس سے ہم قطعی تعرض نہیں کریں گے بلکہ ہم اپنی بحث کا دائرہ دین تک محدود رکھیں گے جس مقام تک وہ آج پہونچ چکی ہے۔ پھر ہم یہ دکھائیں گے کہ کیا حقیقتاً آج وہ اس مقام پر پہونچ گئی ہے جو فطرت نسوانی اور طبیعت انسانی کا تقاضا ہے اور یہ کہ کیا وہ اپنے حقوق و فرائض کو ادا کر رہی ہے یا شتر بے مہار کی طرح اپنے تمام حقوق و واجبات کو پامال کر رہی ہے یا پھر ہم اس کی تہذیبی و شائستگی اور ادب وغیرہ پر بھی گفتگو نہیں کریں گے نہ اس سے کوئی تعرض کریں گے کہ میدان عمل میں اتر کر آج وہ کس مقام پر پہونچ گئی ہے کیوں کہ اس سے گفتگو کافی لمبی ہو جائے گی جب کہ پچھلے مباحث میں ان سوالات سے تشفی حاصل کرنے کا کافی سامان موجود ہے۔ اس مقام پر ہم اس مسئلہ کے دو اہم حقائق بے نقاب کریں گے۔

پہلی حقیقت : پہلی اہم چیز اس کی بے قید آزادی ہے۔ آزادی کا یہ تصور اٹھارویں صدی عیسوی کی پیداوار ہے، جسے بتدریج صنعتی، سیاسی، معاشی اور تمدنی انقلابات نے ہوا دی اور یہ ترقی کرتے کرتے بیسویں صدی عیسوی میں دوسری جنگ عظیم کے بعد اپنی انتہا کو پہونچ گیا، زمانہ کے حالات بہت بدل گئے اور انسانی حقوق کی چیخ و پکار اپنی انتہا کو پہونچ گئی، عزت و شرف اور تکریم و دلداری کے پیمانہ بھی تبدیل ہو گئے۔ صرف یہی نہیں بلکہ دین و مذہب کے معتقدات اور اس کے مقاصد حیات بھی مکمل طور پر بدل گئے۔

اس انقلاب نے مرد اور عورت دونوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور دین و مذہب کے تمام

تقیدات کو بالائے طاق رکھ دیا۔ شرم و حیا اور عفت و پاکیزگی بے معنی چیزیں ہوگئیں اور عورت کو یہ حق حاصل ہوگیا کہ وہ آزادانہ لہو ولعب کے کاموں میں شریک ہو جائے، شراب اور رقص و موسیقی میں حصہ لے اور مرد سے آزادانہ جنسی تعلقات رکھے اس شرط کے ساتھ کہ دوسروں کے حقوق پر دست درازی نہ کرے۔ چنانچہ جارج رائیلی اسکاٹ اپنی کتاب تاریخ الفحشا، A HISTRY OF PROSTITUTION میں لکھتا ہے:

"اس کے نزدیک زندگی کا لطف یہ ہے کہ عہد شباب میں لذات نفس کا جام خوب جی بھر کر پیا جائے اس چیز کی تلاش میں وہ رقص گاہوں، نائٹ کلبوں، ہوٹلوں اور قہوہ خانوں کے چکر لگاتی ہے اور اسی کی جستجو میں وہ بالکل اجنبی مردوں کے ساتھ موٹر کی سیر کے لئے بھی جانے پر آمادہ ہوتی ہے دوسرے الفاظ میں وہ جان بوجھ کر خود اپنی خواہش سے اپنے آپ کو ایسے ماحول میں اور ایسے حالات میں پہونچا دیتی ہے اور پہونچاتی رہتی ہے جو صنفی جذبات کو مشتعل کرنے والے ہیں اور پھر ان کے جو قدرتی نتائج ہیں ان سے وہ گھبراتی نہیں بلکہ ان کا خیر مقدم کرتی ہے"۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کسی کو مجال انکار نہیں ہو سکتا کیوں کہ یہ وہ "حقوق" ہیں جو مغربی تمدن میں مرد اور عورت دونوں کو یکساں طور سے حاصل ہیں کیوں کہ ان کے نزدیک اپنی "پرائیویٹ زندگی" پر ہر شخص کو مکمل اختیار ہے وہ اس میں ہر پابندیوں اور جکڑ بندیوں سے آزاد ہو کر جو چاہے کر سکتا ہے۔ معاشرہ کا اس سے کوئی تعلق نہیں وہ تو صرف اسی صورت میں مداخلت کر سکتا ہے جب وہ اپنی عوامی زندگی میں ہو۔

دوسری حقیقت: دوسری اہم حقیقت مساوات مرد و زن کا غلط تصور ہے اس غلط تخیل نے عورت کو اس کے فطری وظائف سے غافل و منحرف کر دیا اور دوسری سرگرمیوں مثلاً قانون سازی اور حکومت کی ذمہ داریاں وغیرہ۔ ان کی طرف وہ متوجہ ہوگئی یہی اس کا اصل

حق قرار پایا اور اسی کے لئے ساری چیخ و پکار اور تگ و دو صرف ہونے لگی۔

مساوات کے معنیٰ یہ سمجھ لئے گئے کہ عورت اور مرد نہ صرف اخلاقی مرتبہ اور انسانی حقوق میں مساوی ہیں بلکہ تمدنی زندگی میں بھی عورت وہی کام کرے جو مرد کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ بھی وہی تعلیم حاصل کرنے لگی جو مرد کرتے ہیں اور اس مساوات کی تلاش میں اس نے آج وہی کام شروع کر دیئے ہیں جنھیں پہلے کبھی مرد کیا کرتے تھے۔ چنانچہ آج وہ وکیل ہے، انجینئر ہے، ڈاکٹر ہے، کاشتکار ہے اور دوسرے تمام کاموں میں مرد کے دوش بدوش ہے اور اب وہ تمام دوریاں ختم ہوگئی ہیں جو ان دونوں کے درمیان کبھی تھیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ اب وہ حکومت کے کاموں میں بھی حصہ بٹانے کا مطالبہ کر رہی ہے جسے وہ اپنے اور مردوں کے درمیان واضح فرق تصور کرتی ہے۔

اور اس جانب متوجہ ہونے کے بعد معاملہ یہ ہوگیا ہے کہ وہ اپنے فطری مشاغل سے بھی متنفر ہوگئی ہے۔ چنانچہ ہم کبھی یہ نہیں سنتے کہ اس نے کبھی ازدواجی زندگی کی ذمہ داریوں کو نباہنے اور جذبہ مادریت کو فروغ دینے والے اداروں کے قیام کا بھی مطالبہ کیا ہو اس کے برعکس ہم مسلسل دیکھ رہے ہیں کہ کلبوں اور رقص گاہوں میں اس کی مصروفیتیں روز بروز بڑھ رہی ہیں۔

واضح رہے کہ مندرجہ بالا اداروں کے قیام سے ہمارا مطلب سینے پرونے اور کھانا پکانے کا کام سکھانے والے ادارے نہیں ہیں۔ کیونکہ "زوجیت" اور "مادریت" ایک دقیق نفسیاتی اور معاشرتی علم ہے جس کا فرد اور معاشرہ کی تعمیر و تاسیس میں نہایت اہم رول ہوتا ہے جو صرف کھانا پکانے اور سینے سلانے کا کام سیکھ کر کبھی نہیں آسکتا اسے سکھانے کے لئے تو ماہر اساتذہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن اس کی اتنی اہمیت کے باوجود یہ کبھی نہیں سنا گیا کہ وہ اس کا بھی اہتمام کرتیں یا اپنے مطالبات کی فہرست میں اسے بھی جگہ دیتیں اس کے برعکس ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جب اس کے سامنے اس زمانہ کا ذکر کیا جاتا ہے جب اسے بچوں کی تربیت سے نجات مل جائے گی تو وہ نہایت خوشدلی

ہے اس کو مرحبا کہتی ہے۔

اپنے طبعی وظائف سے اس کی یہ غفلت اور مرد سے اپنے آپ کو اس قدر قریب کر دینا صاف بتاتا ہے کہ اپنی نسوانیت کا اسے کوئی خیال نہیں۔ اور یہ چیز ایک خطرناک نفسیاتی کمزوری کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ وہ اپنے عورت ہونے پر شرمندہ ہے اور تمنا کرتی ہے کہ وہ بھی مرد بن جائے اور جب وہ فطرت کے اس اٹل قانون کو بدلنے سے قاصر رہ جاتی ہے تو مجبوراً عورت کے جسم میں مرد بن جاتی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اسے فروغ دینے کے لئے وہ ہر طرح کے وسائل و ذرائع استعمال کرتی ہے تاکہ اپنی "سرکش طبیعت" کے ان بلند ترین مقاصد کو پالے جس کی اسے خواہش ہے گرچہ اس کو اس تصنع اور بناوٹ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

مثال کے طور پر اس کے "سیاسی حقوق" کے مطالبات پر غور کیجئے اور بتایئے کیا فی الواقع یہ کوئی ایسی ضرورت تھی جس کے لئے وہ اس قدر تگ و دو کرتی اور دھکے کھاتی پھرتی؟ اور اس چیز نے آدمی کے حوصلے بلند کئے اور انھوں نے حکومتوں کے تختے الٹ دیئے اور دوسری حکومتیں قائم کیں یا اس کا محرک یہ تھا کہ عورتوں کی مردوں کی ہمسری کے جذبے کو دبا دیا جائے؟ اس سوال کا جواب ہمیں یہ دیا جاتا ہے کہ جو عورتیں ان ملکوں میں پارلیمنٹ کی ممبر شپ کے لئے آگے بڑھ رہی ہیں جہاں عورتوں کو عرصہ دراز سے یہ سہولت حاصل ہے جیسے انگلستان، فرانس، امریکہ وغیرہ وہاں مردوں کی ممبر شپ کی امیدواری کے مقابلے میں ان کی تعداد کا تناسب ڈھائی فیصد ہے۔ اور یہ بھی ایک عام بات ہے کہ ہر قوم میں عورتوں کا تناسب اگر مردوں سے زیادہ نہیں ہوتا ہے تو کم از کم برابر رہتا ہے اور یہ ایک فطری چیز بھی ہے کہ اس سیاسی حق کو استعمال کرنے کے لئے آگے بڑھنے والی عورتوں کی تعداد مردوں کے برابر رہے۔ لیکن اس اعراض کا کیا مفہوم سمجھا جائے اور عورتوں کا سواریوں پر نشستیں حاصل کرنے کے لئے مردوں سے مزاحمت کی خواہش کو کیا سمجھا جائے؟ جب کہ ان سواریوں میں

ان کے لئے کچھ نشستیں مخصوص ہوتی ہیں جن میں راحت و آسائش کی سہولتیں بھی مہیا کی جاتی ہیں۔ اور عورتوں کے اندر رمینٹ شرٹ پہننے کی جو خواہش ہے اس کا کیا مفہوم لیا جائے جب کہ یہ مردوں کے لباس میں شمار ہوتے ہیں؟ اور تحریک نسواں سے وابستہ خواتین کے اس جذبہ کی کیا تشریح کی جائے جس نے انھیں یہ مطالبہ کرنے پر مجبور کیا کہ عربی زبان میں نون تانیث ہے اسے ختم کر دیا جائے تاکہ ضمائر میں بھی وہ مردوں کے ساتھ شریک ہو سکیں؟ عورتوں کی مردوں کے ساتھ برابری کے اس جذبے نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ نسوانیت مردانگی سے کم تر چیز ہے اس لئے وہ مساوات کے لئے بھرپور کوشش کر رہی ہیں تاکہ یہ احساس ختم ہو سکے۔

(۲)

یہ دو نہایت اہم حقیقتیں ہیں جنھیں عورت کی ترقی کو سمجھنے کے لئے نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔

بے قید آزادی کا تصور اور مساوات مرد و زن کا تخیل... ــــ ان دونوں تصورات کو نگاہ میں رکھئے اور بتائیے کہ عورت نے بحیثیت انسان یا بحیثیت عورت کون سی ترقی کی ہے؟ اور اپنے فطری وظائف کی تکمیل اور طبعی مشاغل کو بروئے کار لانے میں کتنی ترقی کی ہے؟

بے قید آزادی جس کی تفصیلات ہم پیچھے بتا چکے ہیں اس کی ایک خاص صفت یہ ہے کہ وہ آدمی کو لہو و لعب کا عادی اور عیش و آرام کا دلدادہ بنا دیتی ہے۔ پھر یہ قید ہے کس چیز کی؟ اس سے مراد دراصل قیود زوجیت و مادریت اور شوہر اور بچہ کی ذمہ داری ہے۔

یاد رہے کہ ایک طویل مدت تک عورت اپنے فطری واجبات کی تکمیل میں مصروف رہی ہے۔ اور یہ صورت حال پچھلی صدی کے آخری اور موجودہ صدی کے اوائل تک برقرار تھی پھر کچھ نئے شاہباز فضا میں نمودار ہوئے جنھوں نے عورت کو اس کے اصل واجبات پیچھے ہٹانے اور دور جدید کے تقاضوں کو پورا کرنے کا آوازہ بلند کیا اور اس کو فلسفہ کا روپ دے کر جدید منکرین اور متجددین

کے اقوال سے استشہاد کیا اور نوبت یہاں تک پہونچ گئی کہ عریانیت اور تجدد کو نئے دلائل اور نئے فلسفوں سے مزین کر دیا گیا۔ لیکن اس کے باوجود بھی ابھی دلوں میں تردد باقی تھا اور پچھلی صدیوں کے ان روحانی تصورات کو ذہنوں سے بالکل اکھڑا نہیں جا سکا تھا مگر دونوں جنگ عظیم نے اس تردد کا بھی خاتمہ کر دیا اور عریانیت پرستی اور جدت پسندی اپنی انتہاؤں کو پہونچ گئی۔

چنانچہ آج اسی اخلاقی مساوات کے غلط تصور نے مغرب میں نکاح کے رشتہ کو تار عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور کر دیا ہے کیوں کہ بجز ایک شہوانی تعلق کے اور کوئی ربط ایسا باقی نہیں رہ گیا ہے جو ان کے تعلقات میں پائداری اور استحکام پیدا کر سکتا اس لئے ہر نئی محبت کے ساتھ پچھلے تمام تعلقات ختم ہو جاتے ہیں۔ بلکہ معاملہ تو یہاں تک پہونچ گیا ہے کہ بہت سے مرد اور عورت رشتہ نکاح میں بندھے بغیر ایک دوسرے سے تعلقات رکھتے ہیں تاکہ حرامی بچہ کو پالنے اور دوسری ذمہ داریوں سے نجات ملی رہے اور وہ لذات زندگی کو اس کے بغیر بھی حاصل کرتے رہیں۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اپنی کتاب پردہ میں اس طرح کی مثالوں کے انبار لگا دیئے چنانچہ ایک مقام پر انھوں نے ڈیٹرائٹ (DETROIT) کے اخبار" فری پریس" کا ایک اقتباس نقل کیا ہے جس میں یہ الفاظ بھی ہیں:۔

"نکاحوں کی کمی، طلاق کی زیادتی اور نکاح کے بغیر مستقل یا عارضی ناجائز تعلقات کی کثرت یہ معنی رکھتی ہے کہ ہم حیوانیت کی طرف واپس جا رہے ہیں اور بچہ پیدا کرنے کی فطری خواہش مٹ رہی ہے۔"

ایک اور مقام پر مولاناؒ نے امریکہ کے ایک جج لنڈسے کا ریمارک نقل کیا ہے جو امریکہ کی عام لڑکیوں کے خیالات کی ترجمانی ان الفاظ میں کرتا ہے۔

"میں شادی کیوں کروں؟ میں سمجھتی ہوں کہ اس زمانہ کی ہر لڑکی محبت کے معاملہ میں آزادی عمل کا ویسا ہی حق رکھتی ہے، ہم کو منع حمل کی کافی تدبیریں معلوم ہیں۔ اس ذریعہ سے یہ خطرہ بھی دور کیا جا سکتا ہے کہ

ایک حرامی بچہ کی پیدائش کوئی پیچیدہ صورت حال پیدا کردے گی۔ ہم کو یقین ہے کہ روایتی طریقوں کو اس جدید طریقہ سے بدل دینا عقل کا مقتضا ہے"۔

اوران خیالات کی حامل ان بے شرم عورتوں کے لئے اس معاشرہ میں آزادی کا دروازہ پوری طرح کھلا ہوا ہے نہ تو انھیں کوئی قانون روک سکتا ہے اور نہ سوسائٹی ہی اس پر لعنت ملامت کرتی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام نے عورت کے لئے جو وظائفِ عمل متعین کئے ہیں وہ نہایت سخت ہیں اور اتنے سخت کہ عورت کے سوا کوئی اور اس کی سختی کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔

لیکن مغربی تہذیب نے مساوات مرد وزن کا جو غلط تصور پیش کیا ہے اس میں کس قدر اعتدال اور کس قدر بے اعتدالی ہے اسے جاننے کے لئے ہم چاہتے ہیں کہ اسلام نے مساوات کا جو تصور پیش کیا ہے اسے سامنے لائیں چنانچہ فرمایا لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ( ) یعنی جیسے حقوق عورت پر مرد کے ہیں ویسے ہی مرد پر عورت کے ہیں۔ اسلامی شریعت کا یہ ایک معروف قاعدہ ہے جسے ہمارے اسلاف نے اپنی زندگیوں میں اچھی طرح برت کر دکھا دیا ہے۔ اور اس کے لفظی مفہوم سے ہٹ کر اس کی گہرائیوں میں اتر گئے چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے بارے میں آتا ہے وہ فرماتے ہیں انی لاتزین لامرأتی کما احب ان تتزین لی میں خود بھی اتنا ہی ٹیپ ٹاپ اور زیب وزینت سے رہتا ہوں جتنا میں اپنی بیوی کے لئے پسند کرتا ہوں کہ وہ میرے سامنے رہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ

پھر اسلام نے شوہر کے لئے بیوی کے مال و دولت مسلک و مذہب اور آراء میں بھی مداخلت کی گنجائش نہیں رکھی ہے۔ اور کوئی بھی چیز جس سے عورت کی اہلیت اور شخصیت مجروح ہوتی ہو اس کو اختیار کرنے کا اسلام نے شوہر کو بالکل حق نہیں دیا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس نے تو شوہر کو اس کا بھی اختیار نہیں دیا ہے کہ وہ اس کے نام کی نسبت اپنی طرف کرے جب کہ

مغرب میں یہ بات عام ہے اور اگر اسلام اسے اختیار کرتا اور اس میں وہ تنہا ہوتا تو یہی لوگ اس پر اس کو لعنت ملامت کرتے اور اسے رجعت پسندی قرار دیتے اور عورت کی شخصیت اور جذبات کو مجروح کرنے کا الزام لگاتے اور اسے معزز القاب سے ملقب کرتے اور اس کو بنیاد بنا کر وہ اس کی رجعت پسندی کو ہر ممکن حد تک ختم کرنے کی کوشش کرتے۔

لیکن اسلام نے عورت کو اس کا صحیح حق دیا اور شوہر کے لئے اس کے مال، رائے، دین اور لقب میں کسی طرح کی بھی ولایت نہیں چھوڑی اور ان کے درمیان تعلقات کی وہ بنیاد استوار کی جسے مثل اعلیٰ کہا جا سکتا ہے اور اگر شوہر عورت سے ان چیزوں میں سے کوئی چیز چھین لی جائے اور وہ اپنے آپ کو مرد کے پنجہ استبداد سے چھڑانا چاہے یا ان حقوق وواجبات کا مطالبہ کرے جنھیں اسلام نے شوہر اور بیوی کو دیئے ہیں تو یہ اسلام کی نظر میں سراسر عدل ہے اور زیادتی کی کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی ہے اور ضروری ہو جاتا ہے اس کے ساتھ انصاف کیا جائے اور اس کی زندگی کو اس کے حقوق عطا کئے جائیں اور یہی چیز ہے جس کے ذریعہ سے عورت اپنے ساتھ انصاف کر سکتی ہے۔

لیکن اسے چھوڑ کر کیا عورت نے اپنے ساتھ انصاف کیا۔ اسے زندگی کے اعلیٰ مقاصد سے محروم کر دیا گیا ہے اس کے وجود کو مرد کے ساتھ باندھ دیا گیا ہے اور آپ اس کے اندر مثل اعلیٰ بننے کی صلاحیت ہی نہیں رہ گئی ہے اس نے مرد کی اتباع کو ہی اپنا مقصد اعلیٰ قرار دے لیا ہے اور ہر میدان میں اس کے پیچھے پیچھے چل رہی ہے اور اس کو کامل مساوات بھی سمجھ بیٹھی ہے۔

کیا یہ سچ ہے کہ اس نے زمانہ کے ساتھ انصاف کیا ہے؟ یا ماضی کی الجھنیں اور پریشانیاں تھیں جن سے نجات حاصل کرنے کے لئے اس نے یہ ڈھونگ رچایا ہے؟ ہرگز نہیں! یہ انصاف نہیں ہے۔ اگر وہ واقعی اپنے ساتھ انصاف کرنا چاہتی ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان اوصاف سے متصف ہو جن کی طرف ہم پیچھے اشارہ کر چکے ہیں۔ کیوں کہ معاشرہ کی اصلاح اور اس کے

اعلیٰ اقدار کی پاسداری سے اسے وہ شرف و عزت دلا سکتی ہے جو اس کی فطرت کا تقاضہ ہے۔

پھر کیا یہ انصاف ہے کہ "حقوق میں مساوات" کا نام لے کر اس کے اصل حقوق کو پامال کیا جائے اور اس کی زندگی کی تمام اصل اور روحانی قدروں کو پس پشت ڈال دیا جائے؟ اور کیا زندگی میں اس وقت تک کوئی مساوات قائم ہو سکتی ہے جب تک حقوق کے ساتھ واجبات و فرائض کا بھی خیال نہ کیا جائے۔

(۳)

ترقی پسندوں کے پاس ان سوالات کا کوئی جواب نہیں ہے۔ وہ اپنی ترکش کو تیروں سے خالی پا کر ان معترضین پر جمود اور ترقی دشمن کا الزام لگاتے ہیں لیکن جب ان سے "ترقی" کا مفہوم پوچھا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ترقی سے ان کی مراد انسان کی صنعتی اور مادی ترقی ہے اور اس کے آگے وہ کسی اور ترقی کا نام بھی نہیں لیتے کیوں کہ اگر وہ ایسا کریں گے تو شکست کھا جائیں گے بس وہ اسے ہی کافی سمجھتے ہیں کہ معاشرہ میں مادیت کے "زہر آلود" بیج بو دیئے جائیں اور اس کی وضاحت نہ کی جائے کیوں کہ انھیں اندیشہ ہے کہ کچھ "تہذیب دشمن" ایسے بھی ہیں جو اس فرق سے اچھی طرح آگاہ ہیں اور اسی لئے وہ سائنس اور صنعتی ترقی جیسے بھاری بھرکم الفاظ استعمال کرتے ہیں کیوں کہ انھیں معلوم ہے کہ صنعتی ترقی نے جہاں بھاپ سے چلنے والے کارخانے بجلی اور دوسرے آلات و اوزار کو ایجاد کیا ہے وہیں اس نے مغربی عورت کو گھر سے باہر نکال دیا اور گھر اور باہر کے دونوں کاموں کی ذمہ داری اس کے سر لاد دی اور ظاہر ہے کہ جب عورت اپنی ضروریات زندگی خود کمائے تو اسے کیا پڑی ہے کہ وہ شادی کے قیود و حدود کو بھی نبھائے اور مرد کی دست نگر بن کر رہے۔ جہاں تک جنسی خواہشات کی تکمیل کا سوال ہے تو یہ شادی کئے بغیر بھی ممکن ہے چنانچہ جمہوری معاشرہ میں زندگی کا یہی فلسفہ ہے اور وہاں یہ چیزیں کھلے عام انجام پاتی ہیں۔

اور اسی کے لئے وہ اپنی ساری زندگی صرف کر دیتی ہے۔ حرامی بچہ پیدا کرتی ہے اور انھیں پالتی بھی نہیں یہی ہے ان کی معاشرت جس پر انھوں نے "ترقی پسندی" اور "روشن خیالی" کا غازہ مل دیا ہے لیکن اسے کھل کر بیان نہیں کر سکتے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ جن کے پاس ذرا سی بھی عقل ہے وہ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ عورت کے باہر نکلنے سے معاشرہ میں کیسی کیسی خرابیوں نے جڑ پکڑ لی ہیں۔ اور جہاں تک صنعتی انقلاب کا تعلق ہے تو اس کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیوں کہ علمی ترقی سنت الٰہی ہے۔ قدرت نے انسان کے اندر تحقیق و جستجو کا مادہ رکھ دیا ہے اس نے اسے عقل جیسی نعمت سے نوازا ہے جو ہر زمانہ میں اس کا ساتھ دیتی ہے۔ اس لئے جہاں تک ترقی کی ضرورت کا تعلق ہے اس سے کسی کو مجال انکار نہیں ہو سکتا۔ واضح رہے کہ ترقی سے ہماری مراد تمدنی زندگی کی ترقی ہے کیوں کہ یہی چیز ہے جو اس کی سوچ کو صحیح رخ دیتی ہے اور مستقبل کا لائحہ عمل متعین کرتی ہے۔ اور جہاں تک عورت کے کارخانے جانے کا تعلق ہے تو یہ صحیح معنوں میں ترقی نہیں ہے اور جو اسے ترقی کہتا ہے وہ یا تو جاہل ہے یا حقیقت سے نابلد۔

کیا اگر وہ گھر سے باہر نہ نکلتی تو باہر کے کام معطل ہو جاتے؟ جب کہ آج بھی دنیا میں بہت سے ایسے کارخانے ہیں جن میں عورتوں کا قطعاً عمل دخل نہیں اور وہاں معطلی یا قلت پیداوار کی بھی کوئی شکایت نہیں ہے بلکہ وہ حالات نہایت خوش کن ہیں اور کام کرنے والے ایسے مستعد اور جفاکش ہیں جن کے اندر ضعف نام کو بھی نہیں۔

اس لئے ترقی پسندوں کی آزادی کا نعرہ دراصل ایک ڈھونگ اور فریب ہے جس کے دام میں وہ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے عورت کو پھانسنا چاہتے ہیں اور عورت کو اس کی مقدس وراثت سے محروم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ہمارا اپنا اجتہاد نہیں بلکہ یہ دراصل اظہار حقیقت ہے جسے ہم علانیہ طور پر مغرب میں دیکھ سکتے ہیں جہاں اس کی آزادی کے لئے سب سے زیادہ چیخ د

پکار ہو رہی ہے۔ لیکن دراصل یہ سب چیزیں مادہ پرستی اور اپنا الو سیدھا کرنے کا ڈھونگ ہیں جن کا ترقی اور عروج سے کوئی تعلق نہیں۔ اسے وہاں کے سرمایہ دار بھی اچھی طرح سمجھتے ہیں لیکن اسے کہنے کی ان کے اندر جرأت نہیں ہے۔ کیوں کہ اس سے ان کی سرمایہ داریت اور سرداریت پر شدید ضرب لگے گی۔ چنانچہ وہ منہ میں جھاگ بھر بھر کے دین صحیح کو رجعت پسندی کہتے ہیں۔

ہمارا مقصد نہ تو مناظرہ بازی اور نہ خواہ مخواہ کی بحث ہے بلکہ دراصل ہم ان کے ان ناپاک مقاصد کا پردہ چاک کرنا چاہتے تھے جسے ترقی پسندی اور روشن خیالی کا نام لے کر چھپا رہے ہیں۔ اور ایک بار میں پھر اپنا وہی سوال دہراتا ہوں کہ مغربی معاشرہ میں عورت کو کون سا انصاف ملا ہے جو اس کی انسانیت کے لئے موزوں ہو جس نے مرد اور عورت دونوں کے تعلقات کو بڑھا دیا ہو۔

کیا اس نے مادریت کے تقدس اور جمال کو پامال کر کے اپنے ساتھ انصاف کیا؟

یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب چاہئے لیکن اگر اس نشہ کی وجہ سے وہ ان کے جوابات نہیں دے سکتے ہیں یا وہ اس کا جواب دینا نہیں چاہتے تو ہم پوچھیں گے کہ کیا اس نے اپنی امانت ادا کر دی جو اسے فطرت کی جانب سے عطا ہوئی تھی اور اپنے حکمت وجود کی تکمیل کر دی؟

ظاہر ہے کہ اگر اس کی زندگی زوجیت و مادریت کے اعلیٰ مقاصد اور اقدار محبت و رحمت سے خالی ہے تو یہ نہایت افسوسناک بات ہے اور اس کی زندگی کا مقصد صرف یہی رہ گیا ہے کہ وہ جیسے چاہے زندگی گذار لے، معاشرہ کی تعمیر سے اسے کوئی مطلب نہ ہو، زندگی کے اعلیٰ مقاصد کو پس پشت ڈال دے اور اپنی جنسی خواہشات کی تکمیل جہاں چاہے اور جس کے ساتھ چاہے کر سکے تو اس کی زندگی کی کیا قیمت رہ جاتی ہے اور انسانیت کے کس پست ترین درجہ میں وہ جگہ پا

اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

تو کیا ان حقائق نے ابھی تک ہماری آنکھیں نہیں کھولی ہیں؟ اور ہم اب تک یہ نہ سمجھ سکے کہ عورت اپنے ساتھ انصاف کر رہی ہے یا ظلم؟

البہی الخولی

۱۸ شارع القصر العینی ۔ القاہرہ

ربیع الثانی ۱۳۸۸ھ

جولائی ۱۹۶۸ء